سہ ماہی
پیغام آشنا
شمارہ-۲۳ (خزاں)
اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۵ء
ہم تباہ کن زلزلے سے متاثر
پاکستانی قوم کو تعزیت پیش کرتے ہیں

Marfat.com

Marfat.com

قمر العلوم قمر سیالوی روڈ گجرات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

QAMAR-UL-ULOOM
QAMAR SIALVI ROAD
GUJRAT PAKISTAN
PH. 3522555

قمر العلوم قمر سیالوی روڈ گجرات

Marfat.com

Marfat.com

سہ ماہی

پیغام آشنا

شمارہ-۲۳

اکتوبر تا دسمبر، ۲۰۰۵ء

ایران اور پاکستان کے درمیان ثقافتی تعلقات کے بارے میں مطالعات اور تحقیقات پر مشتمل سہ ماہی مجلہ

مدیر اعلیٰ

علی اورسجی

کلچرل کونسلر اسلامی جمہوریہ ایران

مدیر اعزازی

ڈاکٹر محمد سلیم اختر

مدیر معاون

جاوید اقبال قزلباش

ثقافتی قونصلیٹ اسلامی جمہوریہ ایران

مکان نمبر 25، اسٹریٹ نمبر 27، F-6/2، اسلام آباد

فون نمبر: 2827937-8، فیکس: 2821771

http: /islamabad.icro.ir

Marfat.com

از ہر چہ می رود سخن دوست خوشترست

"پیغام آشنا" نفس روح پرورست

سعدیؒ

دوست کی بات ہر چیز سے زیادہ خوبصورت ہے،

"اس کے پیغام" کا ملنا ایک روح پرور لمحہ ہوتا ہے۔

به این بهانه درین بزم محرمی جویم

غزل سرایم و "پیغام آشنا" گویم

اقبالؒ

اس بہانے سے بزم میں محرم راز کی تلاش کرتا ہوں،

میں غزل سرا ہوں اور "دوست کو پیغام" دیتا ہوں۔

Marfat.com

اہم گزارشات

ایران اور پاکستان صدیوں سے دوستی اور اخوت کے بے شمار رشتوں میں منسلک ہیں۔ پیغام آشنا کے اجراء کا مقصد وحیدان دونوں ملکوں کے درمیان اس خطے کی مشترکہ میراث اور دور حاضر میں زندگی کے مختلف شعبوں میں دیگر اشتراکات کے بارے میں مناسب شعور پیدا کر کے ان تعلقات کو مزید مضبوط اور مستحکم بنانا ہے۔ اس سلسلے میں پیغام آشنا برصغیر پاک و ہند کے اہل علم و قلم کے ہر قسم کے تعاون کا بالعموم اور پاکستانی دانشوروں کی تحریروں کا بالخصوص خیر مقدم کرتا ہے۔

☆ پیغام آشنا ہر سال چار مرتبہ شائع ہوتا ہے۔

☆ پیغام آشنا میں معمولاً غیر مطبوعہ علمی، تنقیدی، ادبی اور ثقافتی مقالات شامل کیے جاتے ہیں، جن میں تحقیقی رنگ غالب ہونا چاہئے۔ مطبوعہ مقالے کے لکھنے والے کو متعلقہ شمارہ کے اس نسخے کے علاوہ اعزازیہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔

☆ پیغام آشنا میں شائع میں ہونے والے مواد کے نفس مضمون کے بارے میں تمام تر ذمہ داری متعلقہ مصنف و مترجم پر عائد ہوتی ہے اور ادارہ کا تمام حقائق، آراء اور تعبیرات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ بغرض اشاعت ارسال کئے گئے تمام مضامین کاغذ کے ایک طرف ٹائپ یا صاف ستھرے خط میں، دونوں جانب مناسب حاشیے کے ساتھ لکھے ہوئے ہونے چاہئیں۔ حوالہ جات اور حواشی ماخذ کی ضروری تفاصیل کے ساتھ مقالے کی آخر میں منسلک کرنا نہ بھولیں۔ ضروری مکمل حوالوں کے بغیر موصول ہونے والے مقالات پیغام آشنا میں بالعموم شائع نہیں کیے جاتے۔

☆ پیغام آشنا میں کسی مقالے کی اشاعت کے لئے ادارہ کی طرف سے نامزد کردہ ماہرین کی تائید ضروری ہے اور اس سلسلے میں ادارہ ناقابل اشاعت تحریروں کی مصنفین کو واپسی کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔

☆ اشاعت کے لئے قبول کیے جانے والے مقالات میں ادارہ ضروری ادارتی ترمیم، تنسیخ اور تلخیص کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

☆ پیغام آشنا میں اشاعت کے لئے جملہ نگارشات مدیر اعلیٰ، پیغام آشنا کلچرل کونسلیٹ اسلامی جمہوریہ ایران، مکان نمبر 25، گلی نمبر 27، F-6/2، اسلام آباد۔ فون نمبر 8-2827937 فیکس نمبر: 2821771 کے پتے پر ارسال کی جاسکتی ہیں۔

☆ پیغام آشنا میں شائع شدہ مواد سے ماخذ کے ذکر کے بغیر استفادہ ممنوع ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

مجلس مشاورت

افتخار عارف — صدر نشین، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

بشیر انور — سابق استاد، ایجوکیشن کالج، ملتان

صغریٰ بانو شگفتہ موسوی — سابق صدر شعبۂ فارسی، نمل، اسلام آباد

ظفر اسحاق انصاری — ڈائریکٹر جنرل، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

سید علی رضا نقوی — سابق صدر، شعبۂ فقہ اسلامی، اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

غضنفر مہدی — سیکرٹری، انجمن تاریخ و آثار، اسلام آباد

گوہر نوشاہی — استاد زبان و ادبیات اردو، دانشگاہ نمل، اسلام آباد

سید محمد اکرم شاہ — پروفیسر و صدر شعبۂ اقبالیات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

محمد صدیق خان شبلی — سابق صدر شعبۂ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

مرتضیٰ موسوی — سابق ڈائریکٹر جنرل، پاکستان نیشنل سنٹرز، اسلام آباد

☆☆☆

Marfat.com

فہرست

حضرت آیت اللہ خامنہ ای کا زلزلے کے سانحے پر تعزیتی بیان		۱
اقبال مشرق کا بلند ستارہ (یوم اقبال کی مناسبت سے)	آیت اللہ سید علی خامنہ ای ترجمہ ڈکتر اکرم شاہ اکرام	۲
تذکرۂ اقبال بلوچستان میں	ڈاکٹر انعام الحق کوثر	۲۹
اقبال کا تصور حریت و ارتقا	ڈاکٹر محمد آصف اعوان	۵۵
اقبال کی شاعری کا پس منظر	طارق بن عمر	۶۴
مولانا جامی و اقبال بحیثیت نعت گو شعرا	محمد شاہ ضعیف	۷۰
یوم جوانانِ کے موقع پر تقریب مذاہب عالم کی مناسبت سے عالی جناب پوپ بینیڈکٹ شانزدہم کا خطاب		۷۹
مغرب اور اسلام	محمد شفیع بلوچ	۸۳
جدید دور میں اسلام کو درپیش چیلنج	بروس واٹسن مترجم ثاقب اکبر	۹۶
استاد مطہریؒ کی نظر میں نظریۂ فطرت کی کلامی حیثیت	حمید نگارش ترجمہ ثاقب اکبر	۱۰۷
ایک خلیج، تین نام	ڈاکٹر رضا مصطفوی ترجمہ جاوید اقبال قزلباش	۱۲۳
رابعہ خضداری، فارسی زبان کی پہلی شاعرہ	ڈاکٹر علی کمیل قزلباش	۱۲۸
یوم مولانا روم اور یوم حافظ کے موقع پر پیغامات	حجۃ الاسلام محمود محمدی عراقی	۱۳۶

Marfat.com

سراج الدین علی خان آرزو اور تذکرۂ مجمع النفائس	ڈاکٹر عارف نوشاہی	۱۴۱
کلہوڑا دور کا گم شدہ فارسی ادبی خزینہ	ڈاکٹر غلام محمد لاکھو	۱۴۶
پنج آہنگ کا اردو ترجمہ	ڈاکٹر صابر آفاقی	۱۵۳
حمد کاکوی اور ان کا فارسی و اردو کلام	ڈاکٹر محمود الرحمٰن	۱۵۹
صہبا اختر کی شاعری کا تابناک پہلو	غلام حسین وانی	۱۷۱
فارسی کا ایک گمنام دیہاتی شاعر، بیخود بٹالوی	ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی	۱۸۰
زیاراتِ ایران	افتخار احمد قادری	۱۹۳
ایرانی ادب و ثقافت کے پاکستانی ادب و ثقافت پر اثرات	پروفیسر اکبر حمیدی	۲۰۲
''شب زندہ''	جاوید اقبال قزلباش	۲۰۶

☆☆☆

Marfat.com

پاکستان میں تباہ کن زلزلے پر رہبر معظم انقلاب اسلامی ایران، حضرت آیت اللہ خامنہ ای کا تعزیتی بیان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان میں آنے والے تباہ کن زلزلے کی مصیبت پر جس کے نتیجے میں ہمارے ہزاروں بہن بھائی اپنی قیمتی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور وسیع پیمانے پر تباہی و بربادی وقوع پذیر ہوئی ہے، میں پاکستانی قوم، حکومت پاکستان اور ساری امت مسلمہ کو تعزیت پیش کرتا ہوں۔

ایرانی قوم اور اسلامی جمہوریۂ ایران کی حکومت اپنے پاکستانی بھائیوں کے اس غم میں برابر کے شریک ہیں، اور ان کی پریشانیوں کو کم کرنے کے لیے ہر قسم کی امداد کی فراہمی کو اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ اس فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں ہوگی۔ میں خداوند کریم سے جان بحق ہونے والوں کے لیے مغفرت اور ان کے لواحقین کے لیے تسکین کی دعا کرتا ہوں۔

سید علی خامنہ ای
۱۸ مہر ماہ، ۱۳۸۴
(بمطابق ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۵ء)

Marfat.com

اقبال مشرق کا بلند ستارہ☆

آیت اللہ سید علی خامنہ ای، رہبر انقلاب اسلامی ایران

ترجمہ و تدوین ڈاکٹر سید محمد اکرم☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں خلوص دل سے عرض کر رہا ہوں کہ آج جب حضرت علامہ اقبالؒ کی تعظیم میں یہ جلسہ منعقد کیا جا رہا ہے، تو یہ میری زندگی کے پرجوش ترین اور انتہائی یادگار دنوں میں سے ایک ہے۔ وہ درخشاں ستارہ جس کی یاد، جس کا شعر، جس کی نصیحت اور سبق گھٹن کے تاریک ترین ایام میں ایک روشن مستقبل کو ہماری نگاہوں کے سامنے مجسم کر رہا تھا، آج خوش قسمتی سے ایک مشعل فروزاں کی طرح ہماری قوم کی توجہ اپنی طرف مبذول کیے ہوئے ہے۔

ہمارے عوام جو دنیا میں اقبالؒ کے پہلے مخاطب تھے، افسوس کہ وہ بڑی تاخیر سے اس سے آگاہ ہوئے۔ ہمارے ملک کی خاص صورت حال، خصوصاً اقبال کی زندگی کے آخری ایام میں ان کے محبوب ملک ایران میں منحوس استعماری سیاست کا غلبہ اس امر کا باعث بنا کہ وہ کبھی ایران نہ آسکے۔ فارسی کا یہ عظیم شاعر، جس نے اپنے زیادہ تر اشعار اپنی مادری زبان میں نہیں بلکہ فارسی میں کہے، کبھی اپنی پسندیدہ اور مطلوب فضا، ایران میں قدم نہ رکھ سکا اور نہ صرف یہ کہ وہ ایران نہ آسکا بلکہ اسی سیاست نے جس کے خلاف اقبالؒ عرصۂ دراز تک برسرپیکار رہے، اس بات کی اجازت نہ دی کہ اقبالؒ کے نظریات و افکار کا بتایا ہوا راستہ اور سبق ایرانی عوام کے کانوں تک پہنچے، جو اسے سننے کے لیے سب سے زیادہ بے تاب تھے۔ اس سوال کا جواب کہ اقبال کیوں ایران نہ آئے؟ میرے پاس ہے۔

جب اقبال کی عزت و شہرت عروج پر تھی اور جب برصغیر کے گوشہ و کنار اور دنیا کی مشہور یونیورسٹیوں میں انہیں ایک عظیم مفکر، فلسفی، دانشور، انسان شناس اور ماہر عمرانیات کے

☆ یہ تقریر آپ نے علامہ اقبال بین الاقوامی کانگرس (تہران یونیورسٹی، مارچ ۱۹۸۶ء) میں صدر اسلامی جمہوریۂ ایران کی حیثیت سے اختتامی اجلاس میں فارسی زبان میں کی۔

☆☆ پروفیسر اقبال چیئر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Marfat.com

طور پر یاد کیا جاتا تھا، ہمارے ملک میں ایک ایسی سیاست نافذ تھی جو اقبالؒ کو کسی طرح بھی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ لہٰذا انہیں ایران آنے کی دعوت دی گئی اور نہ ان کے ایران آنے کے امکانات فراہم کیے گئے۔ سالہا سال تک ان کی کتابیں ایران میں شائع نہ ہوئیں۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب اس ملک میں ایرانی اور مسلمان کے تشخص کو نابود کرنے کے لیے غیرملکی ادب و ثقافت کا تباہ کن سیلاب رواں تھا۔ اقبالؒ کا کوئی شعر اور کوئی تصنیف مجالس و محافل میں عوام کے سامنے نہ لائی گئی۔

آج اقبال کی آرزو یعنی ''اسلامی جمہوریت'' نے ہمارے ملک میں جامۂ عمل پہن لیا ہے۔ اقبال لوگوں کی انسانی اور اسلامی شخصیت کے فقدان سے غمگین رہتے تھے اور اسلامی معاشروں کی معنوی ذلت اور ناامیدی کو سب سے بڑے خطرے کی نگاہ سے دیکھتے تھے؛ لہٰذا انہوں نے اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ مشرقی انسان اور خصوصاً مسلمان کی ذات اور وجود سے اس خس و خاشاک کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوششیں کیں۔

اگر آج اقبال زندہ ہوتے تو وہ ایران میں ایک ایسی قوم کو دیکھتے، جو اپنے پیروں پر کھڑی ہے اور اپنے قابل قدر اسلامی سرمائے سے سیراب ہوکر اور اپنے آپ پر اعتماد اور بھروسے، نیز دلفریب مغربی زیوروں اور مغرب کے اقداری نظام سے بے اعتنائی کے ساتھ زندگی بسر کررہی ہے۔ وہ قوم مقصد آفریں ہے اور ان اہداف و مقاصد کی راہ پر گامزن ہوکر والہانہ انداز میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے اور اپنے آپ کو قومیت، نیشنلزم اور وطن پرستی کی چاردیواری میں قید نہیں کرتی۔ اقبال کی سب سے بڑی آرزو جو ان کے تمام قابل قدر کلام اور تصنیفات میں نظر آتی ہے یہی تھی کہ وہ یہاں پر ایک ایسی قوم کو دیکھیں اور میں مسرور ہوں کہ ہم الحمدللہ اقبال کی آرزو کو اپنے ماحول میں جامۂ عمل پہنے ہوئے دیکھتے ہیں اور اس وقت بھی ہمیں کو یہ موقع ملا (خواہ ذرا دیر سے) کہ عصر حاضر کی اس عظیم مفکر شخصیت اور اس عظیم الشان مصلح اور انتھک انقلابی مجاہد کو روشناس کرانے کی کوشش کریں اور ان کو اپنی قوم سے روشناس کرائیں۔

میں اس بات کو ترجیح دیتا تھا کہ اس جلسے میں میری شرکت سرکاری آداب و رسوم سے دور ہوتی تاکہ میں اول اس عظیم اور محبوب یادگار سے بیشتر محظوظ ہوسکتا اور دوئم یہ کہ مجھے اس کا موقع اور امکان حاصل ہوتا کہ اقبال کے سلسلے میں اپنے جذبات کے ایک حصے کو اس جلسے کے شرکا کے سامنے پیش کرتا۔ اس وقت بھی میں اپنے بھائیوں اور بہنوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھے اجازت دیں کہ میں یہاں مخلصانہ طور پر اس شخص کی حیثیت سے، جو سالہا

Marfat.com

سال سے اقبال کا مرید رہا اور جس نے اپنے ذہن میں اقبال کے ساتھ زندگی گذار دی ہے، بات کروں تاکہ اس عظیم اجتماع میں اپنے اوپر ان کے عظیم احسان اور اپنے عزیز لوگوں کے ذہن پر ان کے اثرات کے عظیم حق کو ادا کروں۔

اقبال تاریخ اسلام کی ان ممتاز، عمیق اور اعلیٰ شخصیتوں میں سے ہیں کہ ان کی خصوصیات اور زندگی کے صرف ایک پہلو کو مدنظر نہیں رکھا جاسکتا، اور نہ ان کی صرف اس پہلو اور اس خصوصیت کے لحاظ سے تعریف کی جاسکتی ہے۔ اگر ہم صرف اسی پر اکتفا کریں اور کہیں کہ اقبال ایک فلسفی ہیں اور ایک عالم ہیں تو ہم نے ان کا حق ادا نہیں کیا۔ اقبالؒ بلاشبہ ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کا بڑے شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ اقبالؒ کے اردو کلام کے بارے میں اردو زبان و ادب کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ بہترین ہے، شاید یہ تعریف، اقبال کی بڑی تعریف نہ ہو، کیونکہ اردو زبان کی ثقافت اور نظم کا سابقہ زیادہ نہیں ہے لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے اردو کلام نے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں برصغیر کے افراد پر خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان گہرا اثر ڈالا ہے، اور ان کو اس جدوجہد میں، جو اس وقت تدریجی طور پر بڑھ رہی تھی، زیادہ سے زیادہ جوش دلایا ہے اور خود اقبال بھی مثنوی اسرار خودی میں کہتے ہیں:

باغبان زور کلام آزمود
مصرعی کارید و شمشیری درود

اور میرا استنباط یہ ہے کہ وہ یہاں پر اپنے اردو کلام کے بارے میں کہتے ہیں جو اس وقت برصغیر کے تمام لوگوں کے لیے جانا پہچانا تھا۔

اقبالؒ کا فارسی کلام بھی میرے نزدیک شعری معجزات میں سے ہے۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں فارسی میں شعر کہنے والے غیر ایرانی بہت زیادہ ہیں لیکن کسی ایک کی بھی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جو فارسی میں شعر کہنے میں اقبالؒ کی خصوصیات کا حامل ہو۔

اقبالؒ فارسی بات چیت اور محاورے سے ناواقف تھے اور اپنے گھر میں اور اپنے دوستوں سے اردو یا انگریزی میں بات کرتے تھے۔ اقبالؒ کو فارسی مضمون نگاری اور فارسی نثر سے واقفیت نہیں تھی اور ان کی فارسی نثر میں وہی تعبیرات ہیں جو انہوں نے اسرار خودی اور رموز بے خودی کی ابتدا میں تحریر کی ہیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ ان کا سمجھنا فارسی اہل زبان کے لیے مشکل ہے۔ اقبال نے بچپن اور جوانی میں کسی بھی مدرسے میں فارسی نہیں سیکھی تھی اور اپنے گھر میں بھی اردو ہی بولتے تھے، لہٰذا انہوں نے فارسی کا انتخاب صرف اس لیے کیا کہ وہ

Marfat.com

محسوس کرتے تھے کہ ان کے افکار اور مضامین اردو کے سانچے میں نہیں سماتے تھے چنانچہ انہوں نے فارسی سے انسیت حاصل کی۔

انہوں نے سعدی و حافظ کے دیوان اور مثنوی مولانا اور سبک ہندی کے شعرا مثلاً عرفی، نظیری اور غالب دہلوی، نیز دیگر شعرا کے کلام کو پڑھ کر فارسی سیکھی۔ اگرچہ وہ فارسی زبان کے ماحول میں نہیں رہے تھے اور انہوں نے فارسی کی پرورش گاہ میں زندگی نہیں گذاری تھی اور فارسی بولنے والوں سے کبھی معاشرت نہیں کی تھی، تاہم انہوں نے لطیف ترین، دقیق ترین اور نایاب ترین ذہنی مضامین کو اپنی طویل اور بعض نہایت اعلیٰ نظموں کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا اور یہ چیز میری رائے میں اعلیٰ شعری استعداد اور صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ اگر آپ ان لوگوں کے کلام کو دیکھیں جو ایرانی نہیں تھے، مگر انہوں نے فارسی زبان میں شعر کہے ہیں اور ان کا اقبالؒ کے کلام سے موازنہ کریں تو آپ کے لیے اقبالؒ کی عظمت واضح ہوجائے گی۔

اقبالؒ کے بعض مضامین جن کو انہوں نے ایک شعر میں بیان کردیا ہے ایسے ہیں کہ اگر انسان چاہے کہ انہیں نثر میں بیان کرے تو نہیں کرسکتا اور ہمیں ایک مدت تک زحمت اٹھانی پڑے گی کہ ایک شعر کو جس کو انہوں نے آسانی کے ساتھ بیان کردیا ہے فارسی نثر میں جو ہماری اپنی زبان بھی ہے، بیان کرسکیں۔

میں جناب ڈاکٹر مجتبوی کا، ان اشعار اقبال کے لیے جو انہوں نے پڑھے ہیں، ممنون ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ آپ اقبال کے کلام کو زندہ کیجیے۔ کیوں کہ اقبال کو متعارف کرانے کا بہترین ذریعہ ان کا کلام ہے اور اقبال کو کوئی بھی بیان متعارف نہیں کراسکتا۔

اقبال ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کے بعض فارسی اشعار اپنے عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اقبالؒ نے مختلف طرزوں مثلاً طرز ہندی، طرز عراقی اور حتیٰ کہ طرز خراسانی میں شعر کہے ہیں اور ان تمام طرزوں میں اچھے شعر بھی کہے ہیں۔ انہوں نے مختلف شعری اصناف یعنی مثنوی، غزل، قطعہ، دوبیتی اور رباعی کا استعمال کیا ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اچھے شعر کہے ہیں اور اعلیٰ مضامین کو باندھا ہے۔ بعض اوقات تو ان کا کلام ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے جب کہ اس شخص کو مروجہ فارسی بولنے اور فارسی لکھنے کی مشق نہیں تھی اور فارسی زبان گھرانے میں پیدا نہیں ہوا تھا اور نہ اس نے فارسی کے مرکز میں ہی زندگی گذاری تھی۔ یہ استعداد ہے، لہٰذا اقبال کی ایک شاعر کے عنوان سے تعریف یقیناً ان کو چھوٹا کرنا ہے۔

اقبال ایک عظیم مصلح اور حریت پسند ہیں اور اگرچہ حریت پسندی اور سماجی اصلاح

Marfat.com

میں اقبال کا رتبہ بہت زیادہ اہم ہے، تاہم اقبال کو صرف سماجی مصلح نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اسی برصغیر میں اقبال کے ہم عصروں میں کچھ ہندو اور مسلمان افراد ہندوستان کے سماجی مصلح مانے جاتے ہیں، جن میں سے اکثر کو ہم پہچانتے ہیں، ان کی تصنیفات موجود ہیں اور ان کی جدوجہد واضح ہے۔

خود مسلمانوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی مرحوم قائداعظم (محمد علی جناح) جیسی ممتاز شخصیتیں اور کئی دیگر شخصیتیں موجود تھیں، جو اقبال کی ہمعصر تھیں اور وہ سب ایک ہی نسل اور ایک ہی عہد سے متعلق حریت پسندوں اور مجاہدوں میں شامل تھیں، لیکن اقبال ان سب سے عظیم تر ہیں اور اقبال کے کام کی عظمت کا ان میں سے کسی سے بھی موازنہ نہیں کیا جاسکتا، یعنی زیادہ سے زیادہ اہمیت اور قدر جو ہم مولانا ابوالکلام، جو ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور حقیقتاً ان کی اہمیت کو کم نہیں سمجھنا چاہیے، یا مولانا محمد علی یا مولانا شوکت علی کے سلسلے میں قائل ہیں، وہ یہ ہے کہ یہ لوگ انتھک مسلمان مجاہد تھے، جنہوں نے اپنے ملک سے برطانیہ کو نکالنے کے لیے سالہا سال کوشش اور بہت زیادہ جدوجہد کی، لیکن اقبال کا مسئلہ محض ہندوستان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اسلامی دنیا اور مشرق کا مسئلہ ہے۔ وہ اپنی مثنوی *پس چہ باید کرد اے اقوام شرق* میں اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اُن کی تیزبین نگاہیں کس طرح اس تمام دنیا کی طرف متوجہ ہیں جو ظلم و ستم کا شکار ہے اور ان کی توجہ اسلامی دنیا کے تمام گوشوں کی جانب ہے۔ چنانچہ اقبال کو ایک اجتماعی مصلح بھی پکاریں تو گویا حقیقت میں ہم نے اقبال کی پوری شخصیت کو بیان نہیں کیا اور مجھے وہ لفظ اور عبارت نہیں ملتی، جس سے ہم اقبال کی تعریف کرسکیں۔

لہٰذا آپ دیکھیے کہ یہ شخصیت، یہ عظمت اور اس عظیم انسان کی ذات اور اس کے ذہن میں معانی کی یہ گہرائی کہاں اور ہمارے لوگوں کی ان کے متعلق واقفیت کہاں؟ اور حق تو یہ ہے کہ ہم اقبال کی شناخت کے مسئلے سے دور ہیں۔

بہرحال یہ سیمینار ان بہترین کاموں میں سے ہے جو انجام پائے لیکن اس پر بھی اکتفا نہیں کرنا چاہیے اور میں ثقافت اور تعلیمات عالیہ کے محترم وزیر اور یونیورسٹی سے منسلک بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ملک میں اقبال کے نام پر فاؤنڈیشن کے قیام اور یونیورسٹیوں، ہالوں اور ثقافتی اداروں کے ناموں کو اقبال کے نام پر رکھنے کی فکر میں رہیں۔

اقبال کا تعلق ہم سے، اس قوم سے اور اس ملک سے ہے جس طرح کہ اس غزل میں جو جناب ڈاکٹر مجتبوی نے پڑھی اور آپ نے سنی۔ اقبال ایرانی عوام سے اپنے لگاؤ کو بیان کرتے

Marfat.com

ہوئے کہتے ہیں:

چون چراغ لالہ سوزم در خیابان شما
اے جوانان عجم، جان من و جان شما

اور آخر میں کہتے ہیں:

می رسد مردی کہ زنجیر غلامان بشکند
دیدہ ام از روزن دیوار زندان شما

اور یہ شعر میری اس بات کی تائید ہے جو اقبال کے ایران نہ آنے کی وجہ کے بیان میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ وہ اس جگہ کو زنداں سمجھتے ہیں اور قیدیوں سے مخاطب ہوکر بولتے ہیں۔ اقبال کے دیوان میں بہت سی مثالیں ہیں جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ وہ ہندوستان سے ناامید ہو چکے ہیں (کم از کم اپنے زمانے کے ہندوستان سے) اور ایران کی جانب متوجہ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ مشعل جس کو انہوں نے جلا رکھا ہے ایران میں مزید روشن ہو اور انہیں اس بات کی امید ہے کہ یہاں پر کوئی معجزہ رونما ہو۔ یہ اقبال کا ہم پر حق ہے اور ہمیں چاہیے کہ اس حق کا احترام کریں۔

اب رہی بات اقبال کی شخصیت کی تو اگر ہم اقبال کی شناخت کرنا چاہیں اور اُن کے پیغام کی عظمت کو جانیں تو ہمیں خواہ مخواہ اُن کے دور کے برصغیر کو اور اس دور کو پہچاننا پڑے گا، جو اُن کے دور پر ختم ہوا، کیونکہ اس شناخت کے بغیر نہ تو اقبال کے پیغام کا مفہوم سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ہی ساز و نوائے اقبال اور ان کے سوز دروں کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اقبال کے دور میں برصغیر اپنے سخت ترین ایام گذار رہا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اقبال ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے یعنی مسلمانوں کے انقلاب کی انگریزوں کے ہاتھوں شکست کے بیس سال بعد۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے ہندوستان میں اسلامی حکومت اور برصغیر میں اسلام کی حکم فرمائی پر آخری ضرب لگائی۔ ہندوستان میں عظیم بغاوت رونما ہوئی اور شاید یہ بغاوت تقریباً دو تین سال تک جاری رہی۔ ۱۸۵۷ء کے اواسط میں اسے عروج حاصل ہوا تھا، انگریزوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس ضرب کو جو تقریباً ستر اسی سال سے ہندوستان میں اسلام پر لگا رہے تھے اچانک فیصلہ کن طور پر لگایا اور اپنے خیال میں وہاں سے اسلام کی جڑوں کو کاٹ دیا، یعنی اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی حکومت جو ان کی استعماریت کی راہ میں واحد رکاوٹ تھی اور جس کو انہوں نے طویل عرصے کے دوران ادھر ادھر سے کمزور بنا دیا تھا، اور اس کے بہادر سرداروں اور عظیم شخصیتوں کو ختم کردیا تھا تاکہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کی مضبوط

Marfat.com

جڑوں کو کمزور بنائیں۔ اس کے بعد یکبارگی اس تناور اور قدیمی درخت کو جس کی جڑیں کمزور ہو چکی تھیں، جس کا محافظ کوئی نہیں رہا تھا اور وہ اکیلا رہ گیا تھا، کاٹ کر ختم کردیا اور ہندوستان کو برطانوی سلطنت کا جزو بنالیا۔

۱۸۵۷ء ہندوستان میں انگریزوں کی مکمل کامیابی کا سال تھا اور اس کے بعد جب انگریزوں نے ہندوستان کا باضابطہ طور پر برطانیہ سے الحاق کرلیا اور اپنے ملک کا نام سلطنت برطانیہ و ہند رکھ لیا تو ہندوستان کے کالونی ہونے کا مسئلہ نہیں رہا، بلکہ ہندوستان برطانیہ کے صوبوں میں سے ایک صوبہ بن گیا، لہٰذا وہ اپنے مستقبل کی فکر میں پڑ گئے تاکہ اس ملک میں ہر قسم کی بغاوت اور قومی یا مذہبی عظمت کے اعادہ کے امکانات کو ختم کردیں۔ اس کا راستہ یہی تھا کہ مسلمانوں کا مکمل طور پر قلع قمع کردیں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہندوستان میں ان سے مقابلہ کرنے والے مسلمان ہی ہیں اور انہوں نے اس کا تجربہ بھی کرلیا تھا۔

مسلمانوں نے انیسویں صدی کی ابتدا بلکہ اس سے بھی پہلے ہندوستان میں انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ اٹھارہویں صدی کے آخری حصے میں ٹیپو سلطان انگریزوں کے ہاتھوں قتل یا شہید ہوئے لیکن عوام، علا اور مسلمان قبائل نے انیسویں صدی کی ابتدا میں انگریزوں اور ہندوستان میں ان پٹھوؤں سے جو اس وقت سکھ تھے، جنگ لڑی اور اس بات سے انگریز بخوبی واقف تھے۔انگریزوں میں سے ان لوگوں نے جو ہندوستان کے مسائل سے واقف تھے کہا تھا کہ ہندوستان میں ہمارے دشمن مسلمان ہیں اور ہمیں ان کا قلع قمع کرنا چاہیے، لہٰذا انگریزوں کی کامیابی کے سال یعنی ۱۸۵۷ء ہی سے ہندوستان میں مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے ایک نہایت ظالمانہ اور سنگدلانہ پروگرام شروع کیا گیا، جس کا ذکر ہر جگہ آیا ہے اور یہاں پر اس کا ذکر طوالت کا سبب بنے گا۔ وہ لوگ جو مزید معلومات کے خواہاں ہوں اس سلسلے میں لکھی گئی متعدد کتابوں کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مالی اور ثقافتی لحاظ سے ان پر دباؤ ڈالا جاتا تھا اور اجتماعی شعبوں میں ان کی ازحد تحقیر کی جاتی تھی۔ انگریز اعلان کرتے تھے کہ وہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ ملازمت حاصل کریں ان کو مسلمان نہیں ہونا چاہیے اور جب ایک معمولی تنخواہ پر کچھ لوگوں کو ملازم رکھتے، اس وقت بھی مسلمانوں کو ملازم رکھنے سے دریغ کرتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان میں مسجدوں اور اسلامی مدرسوں کو چلانے والے تمام موقوفات کو جو بہت زیادہ تھے، اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہندو تاجروں کو ورغلایا کہ مسلمانوں کو بھاری قرضے دیں تاکہ دیے جانے والے قرضے کے عوض ان کی جائیدادوں کو لے لیں اور ان کے زمین سے متعلق اور صاحب خانہ ہونے کے احساس کو بالکل ختم کردیں۔ سالہا سال یہ کام جاری رہا اور مزے کی بات تو یہ

Marfat.com

ہے کہ یہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے اچھے سلوک کا حصہ تھا اور اس سے بدتر یہ تھا کہ ان کو بے دریغ قتل کرتے اور بے دریغ جیلوں میں ڈالتے تھے۔ تمام ایسے لوگوں کی جن پر انگریزوں کے خلاف اقدامات کرنے کا ذرا سا بھی شک ہوتا سخت سرکوبی کرتے اور ان کو نابود کردیتے تھے۔ یہ سلسلہ سالہاسال جاری رہا۔ ان سخت تکلیف دہ حالات کو دس بیس سال گذر جانے کے بعد (کہ جس کی مثال درحقیقت کسی بھی اسلامی ملک میں مجھے نظر نہیں آئی۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ہو لیکن میں نے دنیا کے ان ممالک کے مختلف علاقوں میں جہاں استعمار موجود رہا ہے، مثلاً الجزائر اور افریقی ممالک میں، جہاں بھی نظر ڈالی ہے، مجھے یاد نہیں کہ مسلمانوں پر اتنا دباؤ دیکھا ہو، جتنا کہ ہندوستان میں ڈالا گیا۔) کچھ لوگوں نے چارہ جوئی کی فکر کی اور انگریزوں سے مقابلے کا سلسلہ مسلمانوں میں ختم نہیں ہوا تھا، اور یہ ایک ایسی چیز ہے جسے ہندوستان کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں مسلمان، انگریزوں سے مقابلے میں نمایاں ترین اور بنیادی عنصر تھے اور واقعتاً ناشکری ہوگی اگر ہندوستان اپنے اوپر مسلمانوں کے احسانات کو فراموش کردے کیونکہ وہاں پر وجود میں آنے والے عظیم انقلاب اور ہندوستان کی آزادی کی وجہ بننے والی جدوجہد میں مسلمان اپنی حریت پسندی کی خاطر کبھی بھی خاموش نہیں بیٹھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کے برسوں میں جب ہر جگہ خاموشی تھی، مجاہد مسلمان عناصر مختلف جگہوں پر اپنے کام میں مصروف تھے، لیکن ان میں دو قسم کی تحریکیں تھیں، جو یا تو ثقافتی سیاسی تھیں یا صرف ثقافتی مسلمانوں کی یہ دونوں تحریکیں چارہ جوئی کے لیے جاری تھیں۔ ان دونوں تحریکوں میں سے ایک علما کی تحریک تھی اور دوسری سید احمد خان کی اور یہ دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل تھیں۔ یہاں تفصیلی بحث کا موقع نہیں لیکن مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ علما کی تحریک انگریزوں سے مقابلے اور ان سے تعلقات ختم کرنے اور ان کے اسکولوں میں شریک نہ ہونے اور انگریزوں سے کسی قسم کی مدد نہ لینے کی طرفدار تھی، جبکہ سرسید احمد خان کی تحریک اس کے برعکس انگریزوں سے مصالحت کرنے، ان کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے، انگریزوں سے مسکرا کر پیش آنے اور ان سے صلح کی حامی تھی۔

یہ دو تحریکیں ایک دوسرے کے مدمقابل تھیں اور افسوس کہ آخرکار دونوں تحریکیں مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئیں۔ پہلی تحریک جو علما کی تحریک تھی اور جس کی قیادت ایسے بڑے علما کے ہاتھ میں تھی جو تاریخ ہند کی نمایاں شخصیتیں ہیں، یہ مقابلہ کرتے تھے اور اُن کی جدوجہد درست تھی، لیکن ان ابتدائی چیزوں سے فائدہ اٹھانے سے پرہیز کرتے تھے، جو ہندوستان میں اسلامی معاشرے کو جدید ترقیات کے حصول میں مدد کرتی تھیں، اور مثال کے

Marfat.com

طور پر وہ اپنے مدرسوں میں انگریزی زبان کو ہرگز بھی داخل نہیں ہونے دیتے تھے اور شاید اس وقت ان کو اس کا حق بھی پہنچتا تھا کہ ایسا سوچیں کیونکہ انگریزی زبان کو فارسی زبان کا، جو مسلمانوں کی محبوب زبان تھی اور صدیوں تک برصغیر میں سرکاری زبان تھی، جانشین بنا دیا گیا تھا اور یہ لوگ انگریزی زبان کو ایک حملہ آور زبان سمجھتے تھے؛ لیکن بہرحال انگریزی کا نہ سیکھنا اور نئی ثقافت کی جانب، جو آخر کار لوگوں کی زندگی کے شعبوں میں داخل ہو رہی تھی، توجہ نہ دینا اس بات کا سبب بنا کہ امت اسلامی اور ملت مسلمان ثقافت، معلومات، عصری قوتوں اور عصری علوم میں، جو تمام معاشروں کے لیے (جو جدید بننے کی جانب بڑھ رہے تھے) موثر اور مفید ہیں، پیچھے رہ گئے کیونکہ وہ علما مسلمانوں کو ان علوم سے دور رکھتے تھے۔

لیکن سرسید احمد خان کی تحریک زیادہ خطرناک تھی اور میں چاہتا ہوں کہ یہاں پر سرسید احمد خان کے بارے میں اپنے قطعی فیصلے کو بیان کروں۔ ممکن ہے کہ موجود بھائیوں میں سے بعض اس بات کے قائل نہ ہوں۔ سید احمد خان نے یقینی طور پر ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں کوئی اقدام نہیں کیا اور میرا عقیدہ یہ ہے کہ اقبال کی تحریک ہندوستان میں، اس کام کے خلاف آواز تھی جس کا پرچم سرسید احمد خان نے اٹھایا تھا۔ سید احمد خان نے انگریزوں سے مصالحت کو بنیاد بنایا اور ان کا بہانہ یہ تھا کہ آخرکار ہمیں مسلمان نسل کو جدید ثقافت میں داخل کرنا چاہیے کیونکہ ہم ان کو ہمیشہ کے لیے جدید تہذیب سے ناواقف اور دور نہیں رکھ سکتے، لہٰذا انگریزوں سے مصالحت کرنی چاہیے تاکہ وہ ہم پر سختی نہ کریں اور ہماری عورتیں، بچے اور مرد انگریزوں سے دشمنی کی خاطر اس قدر تکلیف نہ اٹھائیں۔

وہ سادہ لوحی کے ساتھ خیال کرتے تھے کہ انگریزوں سے تواضع، مصالحت اور اظہار عقیدت کے ذریعے ان تجربہ کار خبیث سیاست دانوں کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرا سکتے ہیں اور ان کی ایذا رسانیوں کو کم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کے قریبی لوگ نیز وہ روشن خیال لوگ جو ان کے اردگرد تھے وہ تو انگریزوں کے نقصانات سے محفوظ رہے لیکن مسلمانوں کو ہندوستان کے آزاد ہونے یعنی ۱۹۴۷ء تک انگریزوں سے ہمیشہ نقصان پہنچا اور اس نوے سال کی مدت میں (۱۸۵۷ء سے ہندوستان کی آزادی کے سال ۱۹۴۷ء تک) مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کر سکتے تھے، کیا۔ لہٰذا انگریزوں کو رام کرنے کے لیے سید احمد خان کا حیلہ مسلمانوں کو ذلیل کرنے کا سبب بنا اور اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ بھی پیدا ہوا، جو اقبال کی شناخت اور اقبال کے پیغام کے مضمون کو سمجھنے میں مؤثر ہے اور وہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں، روشن خیال اور ان تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے جو معاشرتی میدان میں داخل ہوتے تھے آگاہی، علم و معرفت،

Marfat.com

تعلیم اور عہدہ اہمیت رکھتا تھا، لیکن اسلامی تشخص کو ہرگز بھی اہمیت حاصل نہیں تھی اور تدریجی طور پر ہندوستان کے عظیم مسلم معاشرے میں جو دنیا کے عظیم ترین مسلمان معاشروں میں سے تھا(اور اس وقت بھی ایسا کوئی ملک نہیں جس کے مسلمانوں کی تعداد اس زمانے کے برصغیر کے مسلمانوں کے برابر ہو) وہ اسلامی تشخص کا احساس نہیں رکھتے تھے اور اپنے اسلامی شخصیت کے قائل نہ تھے؛ چنانچہ بنیادی طور پر ہندوستان کے مسلمانوں میں مستقبل کے لیے کوئی امید ہی نہیں تھی۔ چونکہ انہوں نے بہت تکلیفیں برداشت کی تھیں، ان کی تحقیر کی گئی تھی، عام حادثات اور واقعات ان کی ناامیدی، تلخ کلامی اور بدفرجامی کی نشاندہی کرتے تھے اس لیے حقارت ہندوستانی مسلمان کی ذات کا جزو بن گئی تھی اور ذلت و ناتوانی کا احساس ہندوستانی مسلمان کی شخصیت کا حصہ شمار ہوتا تھا۔

اس زمانے میں جب اقبال احتمالاً ۱۹۰۸ یا ۱۹۰۹ء میں یورپ کی جدید تہذیب سے جھولی بھر کے لوٹے تھے، اس کے ہم عصر روشن خیال اور ہم نوا(خود ان کے قول کے مطابق) مغربی تہذیب پر نظریں جمائے ہوئے تھے اور ان شخصیتوں کی مانند جن کی طرف جناب مجتبوی نے میرے حوالے سے اشارہ کیا ہے، ایران میں تھیں وہ اپنا اعتبار اس چیز میں دیکھتی تھیں کہ اپنے آپ کو مغربی تہذیب سے کچھ زیادہ ملائیں اور مغربی اقدار کے نظام کو اپنے عمل، اپنی روش، لباس، بات چیت اور حتی کہ اپنے افکار اور نظریات میں جلوگر کریں۔

اس برطانوی حکومتی مشینری کی نوکری، جو اس وقت ہندوستان پر طاقت کے ساتھ حکومت کر رہی تھی، مسلمانوں کے لیے باعث فخر تھی اور ہندو جو مسلمانوں سے چند سال پہلے تہذیب اور انہی آداب و رسومات مین داخل ہوگئے تھے اور جنہوں نے انگریزوں سے میل جول کو بہت پہلے ہی اختیار کرلیا تھا اور اسی وجہ سے صنعت، ثقافت اور انتظامی امور میں کچھ پہلے شامل ہوگئے تھے، ان کا اعتبار تھا نہ حیثیت تھی۔ مسلمانوں کو ہندوؤں سے بھی ذلت اور زحمت اٹھانی پڑی تھی۔ یہاں تک کہ سکھ بھی، اگرچہ بہت چھوٹی سی اقلیت رکھتے تھے اور وہ قابل فخر چیزیں جو ہندوؤں کو پیش روؤں اور تاریخی اور تہذیبی ماضی سے حاصل تھیں، سکھوں کی زندگی میں نہیں تھیں، اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ ایک نیا قائم ہونے والا مذہب ہے، جس میں اسلام اور ہندوازم نیز دوسری چیزوں کی آمیزش ہے، مسلمانوں کی تحقیر اور توہین کرتے تھے۔ یہ تھی اقبال کے زمانے میں برصغیر ہندوستان میں مسلمانوں کے معاشرے کی صورت حال۔ اسی لاہور کی یونیورسٹی میں جہاں پر اقبال نے تعلیم حاصل کی اور بی۔اے کیا، ہم امید بخش اسلامی افکار کے ظہور کی کوئی علامت نہیں دیکھتے۔ وہاں پر سب سے بڑی اسلامی کتاب، سر تھامس آرنولڈ کی کتاب ہے یعنی الدعوه الی الاسلام

Marfat.com

نامی کتاب جو عربی زبان میں ہے اور حال ہی میں اس کا فارسی ترجمہ شائع ہوگیا ہے یہ سر تھامس آرنولڈ کے اس دور کے کاموں میں سے ہے جب وہ لاہور کی یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ البتہ یہ اچھی کتاب ہے اور میں اس کو مسترد نہیں کرنا چاہتا، لیکن ان کا سب سے بڑا فن یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اسلامی جہاد کو تلویحی طور پر ایک دوسرے درجے کی چیز بتائیں، لہٰذا اس کتاب میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ اسلام دعوت سے پھیلا ہے نہ کہ تلوار سے اور یہ ایک اچھی بات ہے، لیکن وہ اس خیال میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اسلامی جہاد اس کتاب میں تقریباً ایک ثانوی، بے فائدہ، زائد اور فالتو چیز نظر آتی ہے۔

اس کتاب کے اسلامی کام کا ماحصل یہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ خواتین و حضرات جنہوں نے سر تھامس آرنولڈ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جانتے ہیں کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اسلام کا زبردست حامی سمجھا گیا ہے اور وہ اقبال کے استاد ہیں اور اقبال ان کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ بہتر ہے کہ میں یہاں پر اس بات کا ذکر کروں کہ علامہ اقبال باوجود اس کے کہ سر تھامس آرنولڈ سے سخت لگاؤ رکھتے تھے، ان کے کاموں میں سیاسی افکار سے غفلت نہیں برتتے تھے۔ اس بات کو جناب جاوید اقبال نے اپنے والد کے حالات زندگی میں لکھا ہے کہ جس کی ایک جلد فارسی میں ترجمہ ہوچکی ہے اور میں نے اسے دیکھا ہے۔ اقبال اپنے دوست سید نذیر نیازی کو جو سر تھامس آرنولڈ کو ایک اسلام شناس جانتے ہیں، خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''کون سی اسلام شناسی؟ تم ان کی کتاب *الدعوۃ الی الاسلام* کی بات کرتے ہو؟ وہ حکومت برطانیہ کے لیے کام کرتے ہیں، بعد میں اقبال اپنے اس دوست سے کہتے ہیں: جب میں برطانیہ میں تھا تو آرنولڈ نے مجھ سے کہا کہ ایڈورڈ براؤن کی *تاریخ ادبیات* کا ترجمہ کروں اور میں نے یہ کام نہیں کرنا چاہا کیونکہ میں نے دیکھا کہ اس کتاب میں سیاسی مقاصد کی آمیزش ہے۔

اب آپ دیکھیے کہ ایڈورڈ براؤن کی کتاب کے بارے میں اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ اور ہمارے ادیبوں کا نظریہ یہ ہے۔ ایڈورڈ براؤن کے دوستوں اور ان لوگوں کو، جو ایڈورڈ براؤن کی دوستی پر فخر کرتے تھے، دیکھنا چاہیے کہ ان کا نظریہ کیا ہے؟ اور میں اس وقت ان شخصیتوں کے نام نہیں لینا چاہتا کیونکہ بہرحال وہ ادبی اور ثقافتی شخصیتیں ہیں لیکن نہایت سادہ دل، ناآگاہ اور ان سیاسی مقاصد سے بے خبر ہیں، لیکن اقبال وہ ہوشیار مرد اور ''المومن کیّس'' کے مصداق خبیث استعماری سیاست کی ریشہ دوانیوں کو تھامس آرنولڈ اور ایڈورڈ براؤن کے کاموں کی تہوں کے اندر پہچانتے اور دیکھتے ہیں اور یہ بات اقبال کی عظمت کی نشان دہی

Marfat.com

کرتی ہے۔اس زمانے میں برصغیر ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت ایسی تھی کہ حکومت برطانیہ، حکومت برطانیہ کے اصل ایجنٹ اور دوسرے درجے کے ایجنٹ (یا اہمیت کے لحاظ سے زیادہ اعلیٰ درجہ نہ رکھنے والے) زیادہ تر ہندو تھے اور ہندوستان کی جدوجہد جس کی مشعل کو ابتدا میں مسلمانوں نے روشن کیا، کانگرس پارٹی کے ہاتھوں میں چلی گئی اور وہ بھی متعصب کانگرس پارٹی کے۔ انڈین کانگرس جس نے آخرکار جدوجہد کے میدان میں عظیم کارنامے بھی انجام دیے، لیکن ان برسوں میں اس پر اسلام سے مخالفت کا تعصب، ہندوؤں کی جانب جھکاؤ اور مسلمانوں کی مخالفت کا تعصب حکم فرما تھا اور مسلمانوں میں روشن خیال لوگ مغرب پرست اور مغربی نظام کے والہ و شیدا تھے اور عام معمولی لوگ تو خوفناک غربت اور سخت تکلیف دہ زندگی کا شکار تھے اور اپنی معمولی روٹی بھی مشکل سے حاصل کرتے تھے۔اس کے علاوہ اس ماحول اور فضا میں کھوئے ہوئے تھے جس کو انگریز زیادہ سے زیادہ مغربیت کی جانب لے جا رہے تھے۔ ہندوستان کے اس زمانے کے مسلمان علما ان ابتدائی شکستوں کے بعد زیادہ تر الگ تھلگ اور حریت پسندی اور تحریک کے ناقابل فہم افکار اور جلوؤں میں کھوئے ہوئے تھے سوائے ان علما کے جو آگے آگے تھے، مثلاً مولانا محمد علی جوہر اور ہندوستان کے دیگر ممتاز علما۔ عام مسلمان عوام اس قسم کی سخت تکلیف دہ حالت میں زندگی گذار رہے تھے، اسلام سیاسی تنہائی اور اقتصادی غربت میں تھا اور مسلمان عوام ہندوستانی معاشرے میں ایک طفیلی اور زائد رکن کی حیثیت رکھتے تھے۔

اس تاریک رات میں جس کا کوئی بھی ستارہ نہ تھا، اقبال نے خودی کی مشعل روشن کی۔ البتہ ہندوستان کی یہ حالت جو میں نے بیان کی، صرف ہندوستان کے لیے مخصوص نہیں تھی بلکہ تمام اسلامی دنیا میں ایسی ہی حالت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال نے سارے عالم اسلام کی فکر کی۔ البتہ اس زمانے کے لاہور اور بدقسمت برصغیر میں اقبال کی روزمرہ زندگی نے ان کے لیے ہر چیز کو قابل لمس بنا دیا تھا۔یہ ایسی حالت میں تھا کہ اقبال نے ترکی، ایران اور مثلاً حجاز کا سفر نہیں کیا تھا اور بہت سی دوسری جگہوں کو قریب سے نہ دیکھا تھا، لیکن وہ اپنے ملک کی صورت حال کو قریب سے دیکھ رہے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ثقافتی، انقلابی اور سیاسی، مبارزہ شروع کیا۔پہلا کام جو اقبال کے لیے انجام دینا ضروری تھا، یہ تھا کہ ہندوستانی معاشرے کو اسلامی تشخص، اسلامی من اور اسلامی شخصیت بلکہ اس کی انسانی شخصیت کی جانب متوجہ کریں اور کہیں کہ تو ہے تو اس قدر غرق کیوں ہے؟ کیوں اس قدر مجذوب ہے؟ تو نے کیوں اپنے آپ کو اس قدر کھو دیا ہے؟ اپنے آپ کو پہچان۔

Marfat.com

یہ اقبال کا پہلا مشن ہے۔ آخر وہ اس کے علاوہ کیا کرسکتے تھے؟ کروڑوں افراد کی ایک قوم سے جو سالہا سال تک استعمار کے شکنجوں کے سخت دباؤ میں تھی اور جہاں تک ممکن تھا اس کی ناک کو رگڑا گیا اور اس سے سمجھنے، جاننے اور امید رکھنے کے امکانات کو چھین لیا گیا تھا، یکبارگی کہا جاسکتا کہ تو ہے اور وہ بھی ہونے کا احساس کرلیتی، کیا ایسا ممکن تھا؟ یہ بہت دشوار کام ہے اور میرا خیال ہے کہ کوئی بھی شخص اقبال کی حد تک اور جس طرح کہ اقبال نے بیان کیا، اس بات کو اتنی خوبی کے ساتھ بیان نہیں کرسکتا تھا۔

اقبال نے ایک فلسفے کی بنیاد رکھی، خودی کا فلسفہ۔ ہمارے ذہن کے مدنظر فلسفوں کی قسم کا نہیں، خودی کا ایک معاشرتی اور انسانی مفہوم ہے، جو فلسفیانہ تعبیرات کے لباس میں اور ایک فلسفیانہ لحن میں بیان ہوا ہے۔ اقبال کو اپنی نظم، اپنی غزل اور اپنی مثنوی میں خودی پر ایک اصول اور ایک مفہوم کی حیثیت سے زور دینے کے لیے اس چیز کی ضرورت ہے کہ اس (خودی) کو فلسفیانہ طور پر بیان کریں۔ اقبال کے مدنظر مفہوم میں خودی کا مطلب شخصیت کا احساس، شخصیت کا سمجھنا، خودنگری، خوداندیشی، خود شناسی اور اپنی ذات کا ادراک ہے۔ البتہ وہ اس بات کو ایک فلسفیانہ بیان اور فلسفیانہ مفہوم کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

میرے خیال میں خودی کا مسئلہ اقبال کے ذہن میں پہلے ایک انقلابی فکر کی شکل میں آتا ہے اور بعد میں انہوں نے اس فکر کو فلسفیانہ بنانے کی کوشش کی ہے اور خودی وہی چیز ہے جس کی ہندوستان میں ضرورت تھی اور مجموعی نقطۂ نگاہ سے عالم اسلام میں اس کی ضرورت تھی، یعنی اقوام اسلامی اگرچہ اسلامی قدروں کی حامل تھیں، لیکن انہوں نے اس چیز کو بالکل فراموش کردیا تھا اور مکمل طور پر فریب کھا کر اقدار کے ایک غیرملکی نظام کی والہ وشیدا اور معتقد ہوگئیں تھیں اور ضروری تھا کہ وہ اپنی جانب یعنی اسلامی اقدار کے نظام کی جانب لوٹیں، یہ وہی مفہوم ہے جس کے لیے اقبال کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ایک ایسے سماجی مفہوم کا ایک ایسی شکل میں بیان کرنا کہ ذہنوں میں جاگزیں ہوسکے فلسفیانہ انداز کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا وہ اس مفہوم کو فلسفیانہ بیان کی شکل دیتے ہیں۔

اقبال کے ذہن میں خودی کا خیال ابتدا میں ایک معاشرتی اور انقلابی فکر کی شکل میں آیا، اور تدریجاً اقوام مشرق (خصوصاً مسلمانوں) میں شخصیت کے انحطاط و زوال اور مصیبت کی عظمت کا مشاہدہ اور ان کے علل و اسباب اور علاج کی شناخت نے اس فکر کو ان کے وجود میں مستحکم، راسخ اور ناقابل خلل بنادیا، اور اس کے بعد ان کو اس فکر کو پیش کرنے کے طریقے کی جستجو میں ایک فلسفیانہ اور ذہنی بنیاد ملی۔ یہ بنیاد خودی کے مفہوم کا تصور ہے۔ عام شکل میں (اس چیز کی

Marfat.com

مانند جس کو ہمارے فلسفی وجود کے مفہوم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، یعنی ایک عام مفہوم جو سبھی میں ہے اور اس کو فلسفیانہ طور پر بیان کیا جاسکتا ہے) البتہ وجود، خودی سے مختلف چیز ہے اور خودی کا مطلب وجود بتانا(میں نے دیکھا ہے کہ اقبال کے اشعار پر حاشیہ لکھنے والوں میں سے بعض نے ایسا لکھا ہے) میرے خیال میں ایک بہت بڑی غلطی ہے اور وہ وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت جس کی اقبال رموزِ بے خودی میں کئی بار تکرار کرتے ہیں، ملا صدرا اور دیگر فلسفیوں کے وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت کے نظریے سے مختلف ہے۔ یہ کچھ اور چیز ہے اور مجموعی طور پر اقبال کے مدنظر مفاہیم سو فیصد انسانی اور اجتماعی مفاہیم ہیں(البتہ میں جو عرض کررہا ہوں، اجتماعی، اس کا مطلب فرد کے بارے میں بحث نہ کرنا، نہیں ہے کیونکہ خودی کی بنیاد فرد میں مستحکم ہو جاتی ہے، لیکن خود فرد میں خودی کی خودیت اور فرد میں خودی کی شخصیت کا استحکام بھی اسلام کے اجتماعی مفاہیم میں سے ایک ہے، اور جب تک خودی کی وہ شخصیت مستحکم نہ ہوجائے حقیقی اور مستحکم شکل میں اجتماع اور معاشرہ وجود میں نہیں آتا)۔

بہرحال خودی کے معنی وجودی معنوں سے مختلف ہیں۔ وہ اول خودی کے مفہوم کی عمومیت کے بارے میں عرفا کی زبان میں اور عرفا کی مانند تعبیرات میں گفتگو کرتے ہیں۔ عالم ہستی کی جلوہ گری خودی کے اثرات میں سے ہے۔ عینیات عالم میں سے ہر ایک خودی کے مفہوم کے ایک جلوے کی نشان دہی کرتی ہے(البتہ ان چیزوں کو اقبال نے اکثر نظموں کے عنوانات میں ذکر کیا ہے، جس کو میں نے دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ بعض تعبیرات ایسی ہیں جن کو خود انہوں نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے اور ان کا کلام ان تعبیرات سے بہت بہتر ہے)۔ افکار کا سرچشمہ بھی خودی کے مختلف جلووں میں خودآگہی ہے۔ ہر مخلوق میں خودی کا اثبات اس کے غیر کا اثبات بھی ہے۔ جب کسی انسان میں خودی کا اثبات ہوتا ہے، یہ خودبخود غیر کا بھی اثبات ہے؛ لہٰذا خودی موجود ہے اور اس کا غیر بھی، گویا کہ ساری دنیا خودی میں شامل ہے، اور ممکن ہے خودی دشمنی کا بھی سبب بنتی ہے اور درحقیقت خودی اپنی ضد سے برسرپیکار ہوتی ہے۔ یہی کشمکش دنیا میں دائمی پیکار کو جنم دیتی ہے۔ خودی زیادہ صالح کے انتخاب اور زیادہ شائستہ کی بقا کی حامل بھی ہے اور اکثر ایک والاتر و برتر خود کے لیے ہزاروں خود فدا ہوجاتے ہیں۔ خودی کا مفہوم ایک مشکوک مفہوم ہے۔ اس میں قوت اور ضعف ہے، خودی کی قوت اور ضعف دنیا کی ہر مخلوق میں اس مخلوق کے استحکام کے اندازے کا تعین کرتی ہے۔

اس طرح وہ قطرہ، مے، جام، ساقی، کوہ، صحرا، موج، دریا، نور، چشم، سبزہ، شمع خاموش، شمع گداز، نگین، زمین، ماہ، خورشید اور درخت کا مثال کے طور پر ذکر کرتے ہیں اور ان میں سے

Marfat.com

ہر ایک میں خودی کی مقدار کا اندازہ لگاتے ہیں۔مثال کے طور پر ایک قطرے میں خودی کی ایک خاص مقدار ہے، نہر میں ایک مقدار اور اس نگینے میں جس پر نقوش کندہ کیے جاسکتے ہوں،ایک خاص مقدار اور اس پتھر میں جس پر کوئی کھدائی نہ کی جاسکتی ہو خودی کی ایک خاص مقدار موجود ہے۔یہ ایک مشکوک مفہوم ہے،جو قابل شک ہے اور انسانی افراد اور اسی طرح سے اشیائے عالم میں مختلف مقداروں میں موجود ہے۔وہ بعد میں یوں نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

چون خودی آرد بهم نیروی زیست
می کشاید قلزمی از جوی زیست

(بعد میں وہ آرزومند ہونے اور مدعا رکھنے کے مسئلے کو پیش کرتے ہیں اور یہ بالکل وہی چیز ہے، جو اس زمانے کی اسلامی دنیا میں نہیں تھی، یعنی مسلمانوں کو کسی چیز کا دعویٰ نہیں تھا، ان کی کوئی بڑی آرزو نہیں تھی ماسوائے معمولی اور حقیر آرزوؤں کے)۔وہ کہتے ہیں ایک انسان کی زندگی کا دارومدار آرزو پر ہے، ایک شخص کی خودی یہ ہے کہ وہ آرزومند ہو اور اس آرزو کی جستجو میں بڑھے(اور مجھے یہ جملہ یاد آگیا ہے کہ انما الحیوۃ عقیدۃ و جہاد)۔

وہ اسی مضمون اور اسی مفہوم کو بہت وسیع اور گہرے نیز لطیف انداز میں بیان کرتے اور کہتے ہیں:کسی چیز کا چاہنا اور اس کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا ہی مدعا ہے ورنہ زندگی موت میں تبدیل ہوجائے گی۔آرزو جان عالم اور صدف فطرت کا گوہر ہے۔وہ دل جو آرزو پیدا نہ کرسکے پر شکستہ اور بے پرواز ہے اور یہ آرزو ہی ہے جو خودی کو استحکام عطا کرتی ہے اور طوفانی سمندر کی مانند موجوں کو جنم دیتی ہے۔لذت دیدار ہے جو دیدار دوست کو صورت عطا کرتی ہے، شوخی رفتار ہے جو کبک کو پاؤں عطا کرتی ہے، نوا کی سعی و کوشش ہے، جو بلبل کو منقار عطا کرتی ہے۔بانسری نواز کے ہاتھ اور ہونٹوں میں بانسری ہے جو زندگی پاتی ہے ورنہ نیستان میں تو کوئی چیز بھی بالفعل موجود نہیں تھی۔علم و تمدن، نظم و آداب اور رسومات نیز اصول سبھی ان آرزوؤں سے وجود میں آتے ہیں جو کہ جستجو اور کوشش سے وابستہ ہیں اور وہ بعد میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

ما ز تخلیق مقاصد زنده ایم
از شعاع آرزو تابنده ایم

(مدعا سازی، آرزو سازی اور مقصد سازی) یا ایک اور شعر میں اسی موضوع کے بارے میں کہتے ہیں:

Marfat.com

گرم خون انسان ز داغ آرزو
آتش، این خاک از چراغ آرزو

اور بعد میں انسانی معاشرے، انسان اور خودی کے استحکام کے لیے عشق و محبت کو ضروری سمجھتے ہوئے کہتے ہیں، محبت کے بغیر فرد اور معاشرے میں خودی کو استحکام نہیں حاصل ہوتا اور ضروری ہے کہ ملت مسلمان اور وہ انسان جو چاہتے ہیں، اپنی خودی کو مضبوط بنائیں، محبت اور عشق رکھتے ہوں اور ان کا دل اس آگ میں پگھلے۔ اس کے بعد دلچسپ ہے کہ خود ہی امت اسلامیہ کے عشق کے لیے وہ ایک نکتہ پالیتے ہیں اور وہ ہے پیغمبر اکرم محمدؐ کا عشق۔ یہی وجہ ہے کہ انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ بیدار اور ہوشیار شخصیت اسلامی دنیا کے اتحاد اور اسلامی دنیا کو تحریک میں لانے کے مسئلے کو کتنی اچھی طرح سمجھتا ہے:

نقطہ نوری کہ نام او خودی است
زیر خاک ما شرار زندگی است
از محبت می شود پایندہ تر
زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر
از محبت اشتعال جوہرش
ارتقای ممکنات مضمرش
فطرت او آتش اندوزد ز عشق
عالم افروزی بیاموزد ز عشق
در جہان ہم صلح ہم پیکار عشق
آب حیوان، تیغ جوہر دار عشق
عاشقی آموز و محبوبی طلب
چشم نوحی، قلب ایوبی طلب
کیمیا پیدا کن از مشت گلی
بوسہ زن بر آستان کاملی

اس کے بعد کہتے ہیں، اب وہ معشوق و محبوب جس سے مسلمان کو لگاؤ رکھنا چاہیے اور جس کا عاشق اسے ہونا چاہیے، کون سی ہستی ہے!

ھست معشوقی نہان اندر دلت
چشم اگر داری بیا، بنمایمت

Marfat.com

عاشقان او ز خوبان خوب تر
خوشتر و زیبا تر و محبوب تر
دل ز عشق او توانا می شود
خاک، ہمدوش ثریا می شود
خاک نجد از فیض او چالاک شد
آمد اندر وجد و بر افلاک شد
در دل مسلم مقام مصطفیٰ(ص) است
آبروی ما ز نام مصطفیٰ(ص) است
طور موجی از غبار خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
بوریا ممنون خواب راحتش
تاج کسری زیر پای امتش
در شبستان حرا، خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محروم نوم
تا بہ تخت خسروی خوابید قوم

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں کچھ تشریح کرتے ہیں اور ان کے اوصاف کو بیان کرتے ہیں۔ البتہ اقبال کے پورے دیوان میں اور ان کے سارے کلام میں انسان پیغمبرؐ سے عشق کو دیکھتا ہے اور یہ صرف اسی جگہ سے مخصوص نہیں ہے اور اس بات کا ذکر مناسب ہوگا کہ ایک کتاب جس کو پاکستان کے ایک ہم عصر محقق نے اقبال کے بارے میں لکھا ہے اور اس متین و موقر کتاب کا نام *اقبال در راہ مولوی* ہے۔یہ کتاب مجھے اپنے ایک حالیہ سفر میں ملی اور میں نے اس سے استفادہ کیا، میں نے دیکھا کہ اس میں لکھا ہے:''جب بھی کوئی نظم یا شعر جس میں پیغمبر اکرمؐ کا نام ہوتا اقبال کوسنایا جاتا تو اقبال کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوجاتے اور درحقیقت وہ خود پیغمبر اکرمؐ کے عاشق تھے۔''

حقیقت میں اقبال نے ایک اچھے نکتے پر انگلی رکھی ہے۔دنیائے اسلام پیغمبر سے زیادہ محبوب اور مقبول عام کونسی ہستی کو تلاش کرسکتی ہے؟ اور یہ چیز دنیائے اسلام کی تمام محبتوں کو مرکزیت عطا کرتی ہے اور اس سلسلے میں کچھ گفتگو کے بعد حاتم طائی کی بیٹی کی کہانی کا ذکر

Marfat.com

کرتے ہیں کہ ایک جنگ میں حاتم طائی کی بیٹی قید ہوکر آئی اور اسے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں لایا گیا، پیغمبر اکرمؐ نے جب اس قیدی لڑکی کے بدن کو زنجیر میں جکڑا اور سر کو عریاں دیکھا تو آپؐ نے اس بڑے اور اچھے خاندان کی لڑکی کی عریانیت کو پسند نہیں کیا اور اپنی عبا اٹھا کر اس لڑکی پر ڈال دی تا کہ وہ سرنگوں اور شرمسار نہ ہو، اور اس کے بعد کہتے ہیں:

ما از آن خاتون طی عریان تریم
پیش اقوام جہانِ بی چادریم
روز محشر اعتبار ماست او
در جہان ہم پردہ دار ماست او
ما کہ از قید وطن بیگانہ ایم
چون نگہ نور دو چشمیم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما
شبنم یک صبح خندانیم ما
مست چشم ساقی بطحاستیم
در جہانِ مثل می و میناستیم
چون گل صد برگ ما را بو یکی است
اوست جان این نظام و او یکی است

وہ اسرار خودی میں کوشش کرتے ہیں کہ احساس خودی یعنی انسانی تشخص کے احساس کو مسلمان فرد اور معاشرے میں زندہ کریں۔ اسرار خودی کا ایک اور باب یہ ہے کہ خودی سوال سے کمزور پڑجاتی ہے یعنی جب ایک فرد یا قوم نیازمندی کا ہاتھ پھیلاتی ہے تو اس فرد یا قوم کی خودی کمزور ہوجاتی ہے اور وہ اپنے استحکام کو کھو بیٹھتی ہے۔ اس سلسلے میں دلچسپ اور پر مغز بحثیں اور بھی ہیں۔ خودی کے بعد، بے خودی کا فلسفہ ہے، یعنی جب ہم ''خود'' ایک انسان کی شخصیت کی تقویت کے بارے میں بحث کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ انسان ایک دوسرے سے جدا ہوکر اپنے اردگرد دیوار کھڑی کرلیں اور خود زندگی گذاریں بلکہ ان تمام خودوں کو چاہیے کہ ایک معاشرے کے مجموعے میں بے خود ہوجائیں یعنی فرد کو معاشرے سے ارتباط قائم کرنا چاہیے۔ یہ رموز بے خودی ہے اور رموز بے خودی نامی کتاب اقبال کی دوسری کتاب ہے جو اسرار خودی کے بعد لکھی اور شائع کی گئی ہے، اور جو خود اسلامی نظام کے بارے میں اقبال کے خیالات کی نشان دہی کرتی ہے۔ ایک اسلامی نظام

Marfat.com

کے قیام کے لیے اقبال کے افکار اس کے کلام میں ہر جگہ موجود ہیں، لیکن رموز بے خودی میں ہر جگہ سے زیادہ نظر آتے ہیں اور مجموعی طور پر وہ مسائل جن کا ذکر رموز بے خودی میں موجود ہے، اہم اور دلچسپ موضوعات ہیں اور ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے ان پر توجہ ضروری ہے۔

آج جب ہم اقبال کے افکار کو رموز بے خودی کے مضامین میں دیکھتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ دقیقاً وہی افکار ہیں جو ہمارے اسلامی معاشرے پر حکم فرما ہیں۔ اسلام کی ترویج میں امت توحیدی کی ذمہ داری اقبال کے پرجوش ترین نظریات میں سے ایک ہے اور ان کے خیال میں مسلمانوں اور امت اسلامیہ کو جنہیں اسلام کی ترویج کرنی چاہیے، چین سے نہیں بیٹھنا چاہیے تاکہ اس کام کو انجام دے سکیں۔

وہ کہتے ہیں، اسلامی معاشرے کی تشکیل اور دنیا کے لیے اسلامی امت کا وجود میں آنا، کوئی آسان کام نہیں تھا اور دنیا بہت تکلیفیں اٹھانے اور تاریخ بہت سے تجربات کرنے کے بعد امت توحیدی کو پا سکی ہے اور توحیدی نظریہ اور اسلامی فکر کی حامل ایک امت وجود میں آسکی ہے:

این کہن پیکر کہ عالم نام اوست
ز امتزاج امہات اندام اوست
صد نیستان کاشت تا یک نالہ رست
صد چمن خون کرد تا یک لالہ رست
نقشہا آورد و افگند و شکست
تا بہ لوح زندگی نقش تو بست
نالہ ھا در کشت جان کاریدہ است
تا نوای یک اذان بالیدہ است
مدتی پیکار با احرار داشت
با خداوندان باطل کار داشت
تخم ایمان آخر اندر گل نشاند
با زبانت کلمۂ توحید خواند
نقطۂ ادوار عالم لا الہ
انتہای کار عالم لا الہ

Marfat.com

چرخ را از زور او گردندگی
مہر را پایندگی رخشندگی
بحر گوھر آفرید از تاب او
موج در دریا طپید از تاب او
خاک از موج نشیمن گل شود
مشت پر از سوز او بلبل شود
شعلہ در رگہای تاک از سوز او
خاک مینا تابناک از سوز او
نغمہ ھایش خفتہ در ساز وجود
جویدت ای زخمہ در ساز وجود
صد نوا داری چو خون در تن روان
خیز و مضرابی بہ تار او رسان
زان کہ در تکبیر راز بود توست
حفظ و نشر لا الہ مقصود توست
تا نخیزد بانگ حق از عالمی
گر مسلمانی نیاسایی دمی
می ندانی آیۂ ام الکتاب
امت عادل ترا آمد خطاب
آب و تاب چہرۂ ایام تو
در جہان شاھد علی الاقوام تو
نکتہ سنجان را صلای عام دہ
از علوم امی ای پیغام دہ
امی ای، پاک از ہوئ گفتار او
شرح رمز "ما غویٰ" گفتار او
از قبای لالہ ھای این چمن
پاک شست آلودگیہای کہن

اس کے بعد جب وہ اسلامی نظریے کی آفاقیت کو بیان کرتے ہیں، تو بلاشبہ ان کی

Marfat.com

کتاب میں شاید سو بار سے زیادہ اسلام اور مسلمان کی آفاقیت اور اس کے عالمی وطن کا ذکر آیا ہے۔ تو یہاں پر بھی کہتے ہیں:اے امت توحید کا پرچم تیرے ہاتھ میں ہے، تجھے حرکت کرنی چاہیے اور اسے دنیا تک پہنچانا چاہیے۔ بعد میں وہ کہتے ہیں کہ یہ دلفریب جدید بت جسے دھوکہ باز فرنگیوں نے پیدا کیا ہے، اس جدید بت کو توڑ دے اور خود ہی بتاتے ہیں کہ یہ جدید بت کیا ہے:

ای کہ میداری کتابش در بغل
تیز تر نہ پا بہ میدان عمل
فکر انسان بت پرستی، بت گری
ہر زمان در جستجوی پیکری
باز طرح آزری انداخت است
تازہ تر، پروردگاری ساخت است
کاید از خون ریختن اندر طرب
نام او، رنگ است و ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چون گوسفند
پیش پای این بت ناارجمند
ای کہ خوردستی ز مینای خلیل
گرمی خونت ز صہبای خلیل
بر سر این باطل حق پیرہن
تیغ لا موجود الا ہو بزن
جلوہ در تاریکی ایام کن
آنچہ بر تو کامل آمد، عام کن

یہ ہے اسلام کی نشر و اشاعت اور قومیت اور وطن وغیرہ کی سرحدوں کو ختم کرنے کے سلسلے میں اقبال کا نظریہ۔ رموزِ بےخودی میں ایک مضمون جس پر وہ زور دیتے ہیں، فرد کے اجتماع سے متصل ہونے اور فرد کے اجتماع میں ضم ہوجانے کی ضرورت ہے۔

وہ نبوت کو امت کی تشکیل کی اصل بنیاد جانتے ہیں اور کہتے ہیں، ایسا نہیں کہ جب افراد ایک جگہ جمع ہوجائیں تو ایک قوم یا ملت وجود میں آجائے بلکہ ایک فکر کی ضرورت ہے جو ملت یا قومیت کے تانے بانے کو یکجا کرے، چنانچہ بہترین اور بنیادی ترین فکر نبوت کی فکر

Marfat.com

ہے، جس کو خدا کے پیغمبروں نے آکر پیش کیا۔ تشکیل ملت کے لیے یہ بہترین طریقہ ہے کیونکہ یہ اجتماع کو فکر عطا کرتی ہے، ایمان عطا کرتی ہے اور اتحاد عطا کرتی ہے نیز تربیت اور کمال بخشتی ہے۔

ایک اور مضمون جس پر وہ زور دیتے ہیں، خداوندان تخت ومحراب کی بندگی کی نفی ہے:

بود انسان در جہان انسان پرست
ناکس و نابودمند و زیر دست
سطوت کسری و قیصر رہزنش
بندھا در دست و پا و گردنش
کاھن و پاپا و سلطان و امیر
بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحب اورنگ و ہم پیر کنشت
باج برکشت خراب او نوشت
در کلیسا اسقف رضوان فروش
بہر این صید زبون دامی بدوش
برھمن گل از خیابانش ببرد
خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد
از غلامی فطرت او دون شدہ
نغمہ ھا اندر نی او خون شدہ
تا امینی حق بہ حق داران سپرد
بندگان را مسند خاقان سپرد

یہ اشعار رسول اکرمؐ کی رسالت کی تشکیل، انسانوں کے مابین مساوات قائم کرنے اور ''ان اکرمکم عنداللہ اتقکم'' اور اخوت اسلامی کے بارے میں ہیں۔ خود انہوں نے جس طرح موضوعات اور عنوانات کا ذکر کیا ہے، بہت زیادہ ہیں اور چونکہ میری گفتگو تفصیلی ہوگئی ہے، اس لیے مناسب نہیں ہوگا کہ میں اس سے زیادہ تفصیلی گفتگو کروں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ درحقیقت کون سے حصے کا انتخاب کروں اور اس کے بارے میں گفتگو کروں کیونکہ انہوں نے اس قدر زیادہ دلچسپ اور اچھے موضوعات پر گفتگو کی ہے کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس

Marfat.com

کو فوقیت دی جائے اور بیان کیا جائے اور ان سب باتوں کے بیان کے لیے ہمارے ملک میں علامہ اقبالؒ کے کلام کے شائع کرنے کے سوا یہ کام کسی اور طریقے سے ممکن نہیں ہے۔ یہ کام ایسا ہے جو یہاں بھی اور پاکستان اور افغانستان میں بھی ہونا چاہیے، نیز ہر اس جگہ پر جہاں لوگ فارسی سمجھتے ہیں یا ممکن ہے سمجھ سکیں۔ اقبال کے کلام کو جس میں فارسی کا کلام بہترین ہے، شائع ہونا چاہیے۔ البتہ جیسا کہ آپ کو علم ہے اقبال کے پندرہ ہزار شعروں میں سے نو ہزار فارسی میں ہیں اور ان کا اردو کلام فارسی سے بہت کم ہے۔ ان کے بہترین اشعار اور کم از کم معنی کے لحاظ سے ان کا اہم ترین کلام وہی ہے جو انہوں نے فارسی میں کہاہے۔ ان کی کلیات جو شاید بیس سال قبل یہاں پر شائع ہوئی، اس پر مزید کام اور محنت کی ضرورت ہے۔

میں جب سے اقبال کے کلام سے آشنا ہوا ہوں، دیکھتا تھا کہ اس کلام کی شرح اور وضاحت کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ کافی وضاحت نہیں ہے اور مجھے اس بات کا دکھ ہوتا تھا۔ حقیقت میں اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ کام انجام پائے اور کچھ لوگ ان لوگوں کے لیے جن کی زبان فارسی ہے، علامہ اقبال کے مدنظر جو مضامین اور مفاہیم ہیں ان کی تشریح کریں۔

آج اقبال کے بہت سے پیغامات ہم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سے بعض ان دنیا والوں کے لیے ہیں جو ابھی تک ہمارے راستے پر نہیں آئے اور اس پیغام کو جس کو ہم سمجھ گئے ہیں، انہوں نے نہیں سمجھا ہے۔

اقبال کے ''خودی'' کے پیغام کو ہماری قوم نے میدان عمل میں اور حقیقت کی دنیا میں عملی جامہ پہنایا، لہٰذا ہماری قوم کے لیے ضرورت نہیں کہ اسے خودی کا مشورہ دیا جائے۔ ہم ایرانی عوام آج مکمل طور پر محسوس کرتے ہیں کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہیں، اپنی ثقافت اور اپنی چیزوں پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس تمدن پر جس کو اپنی آئیڈیالوجی اور فکر کی بنیاد پر استوار کرسکتے ہیں۔ البتہ ماضی میں مادی زندگی اور زندگی گذارنے کے لحاظ سے ہماری تربیت دوسروں کے سہارے زندگی گذارنے کی بنیاد پر کی گئی، لیکن ہم تدریجی طور پر اپنے خیموں سے ان غیر ملکی رسیوں کو بھی کاٹ پھینکیں گے اور اپنی ہی رسیوں کا استعمال کریں گے اور ہمیں امید ہے کہ اس کام میں کامیاب ہوں گے۔

مسلمان اقوام کو اس ''خودی'' کو سمجھنے کی ضرورت ہے، خاص طور پر مسلمان شخصیتوں کو خواہ وہ سیاسی شخصیتیں ہوں یا ثقافتی شخصیتیں انہیں ضرورت ہے کہ اقبال کے پیغام کو سمجھیں اور جان لیں کہ اسلام اپنی ذات اور اپنی اصلیت میں انسانی معاشروں کو چلانے کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا حامل ہے اور دوسروں کا محتاج نہیں ہے۔

Marfat.com

ہم یہ نہیں کہتے کہ دوسری ثقافتوں کے لیے دروازہ بند کردیں اور ان کو اپنی طرف جذب نہ کریں۔ جی ہاں ہمیں جذب کرنا چاہیے لیکن ایک زندہ جسم کی مانند جو کہ ضروری عناصر کو اپنے لیے جذب کرتا ہے نہ کہ اس بے ہوش اور مردہ جسم کی مانند جس میں جو چاہتے ہیں، داخل کردیتے ہیں۔

ہم میں جذب کرنے کی توانائی موجود ہے اور دوسری ثقافتوں اور دوسروں کے افکار کے ماحصل سے خواہ غیرملکی ہی ہوں، اس چیز کو جو کہ ہم سے تناسب اور تعلق رکھتی ہو اور ہمارے لیے مفید ہو اخذ اور جذب کرتے ہیں لیکن جس طرح کہ اقبال بار بار کہتے ہیں، علم و فکر کو مغرب سے سیکھا جاسکتا ہے، لیکن سوز و زندگی کو نہیں۔

خرد آموختم از درس حکیمان فرنگ
سوز اندوختم از صحبت صاحب نظران

ایسی کوئی چیز (یعنی سوز و زندگی) مغرب کی تعلیم اور مغربی مدنیت کی تہذیب میں نہیں ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کا اقبال نے سب سے پہلے ایک علم بردار (قائد) کے طور پر احساس اور اعلان کیا ہے۔

مغربی تمدن اور مادی عمرانیت (مادی شہری زندگی) انسان کے لیے ضروری روح اور معنی سے خالی ہے۔ لہٰذا ہم مغربی ثقافت سے اس چیز کو لیتے ہیں، جو ہمارے لیے ضروری ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک اور ہمارے عوام میں خودی اور اسلامی شخصیت کا احساس انتہائی حد تک موجود ہے اور ہماری نہ شرقی نہ غربی (لاشرقیہ ولا غربیہ) کی پالیسی بالکل وہی چیز ہے، جس کی بات اقبال کرتے تھے۔ ہمارا پیغمبر اکرمؐ اور قرآن سے عشق اور قرآن سیکھنے کے لیے ہماری نصیحت اور یہ بات کہ انقلابوں اور مقاصد کی بنیاد اسلامی اور قرآنی ہونی چاہیے بالکل وہی چیز ہے، جس کا مشورہ اقبال دیتے تھے، لیکن اس وقت ان باتوں کو سننے والا کوئی نہ تھا۔

ان دنوں اقبال کی زبان اور اقبال کے پیغام کو بہت سے لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ اقبال کی کتابیں اور نظمیں اس شکایت سے بھری ہوئی ہیں کہ میری بات کو نہیں سمجھتے اور نہیں جانتے اور نگاہیں دوسری جگہوں اور مغرب کی جانب مرکوز ہیں۔ شاید اس رموز بے خودی کے مقدمے میں وہ یہ شکایت کرتے ہیں اور امت اسلام کو مخاطب کرکے اور بقول خود ان کے "پیش کش بہ حضور ملت اسلامیہ" میں کہتے ہیں:

Marfat.com

ای ترا حق خاتم اقوام کرد
بر تو ہر آغاز را انجام کرد
ای مثال انبیا پاکان تو
ہمگر دلہا جگر چاکان تو
ای نظر بر حسن ترسا زادہ ای
ای ز راہ کعبہ دور افتادہ ای
ای فلک مشت غبار کوی تو
"ای تماشا گاہ عالم روی تو"
ہمچو موج، آتش تہ پا می روی
"تو کجا بہر تماشا می روی"
رمز سوز آموز از پروانہ ای
در شرر تعمیر کن کاشانہ ای
طرح عشق انداز اندر جان خویش
تازہ کن با مصطفیؐ پیمان خویش
خاطرم از صحبت ترسا گرفت
تا نقاب روی تو بالا گرفت
ہم نوا از جلوہ اغیار گفت
داستان گیسو و رخسار گفت
بر در ساقی جبین فرسود او
قصۂ مغ زادگان پیمود او
من شہید تیغ ابروی توام
خاکم و آسودۂ کوی توام
از ستایش گستری بالاترم
پیش ہر دیوی فرو ناید سرم

یعنی اے امت اسلام! میں جو اس عاشقانہ طور پر تیری مدح سرائی کر رہا ہوں، اس لیے نہیں ہے کہ میں ایک مدیحہ سرائی کرنے والا شخص ہوں:

Marfat.com

از سخن آئینہ سازم کردہ اند
وز سکندر بی نیازم کردہ اند
بار احسان برنتابد گردنم
در گلستان غنچہ گردد دامنم
سخت کوشم مثل خنجر در جہان
آب خود می گیرم از سنگ گران

یہاں پر وہ اپنی بے نیازی کی بات کرتے ہیں اور اس وقت اقبال اس بے نیازی کے ساتھ کہ وہ دنیا کے سامنے سرنہیں جھکاتے امت اسلامیہ کے سامنے دوزانو بیٹھ کر التماس کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو پہچان، اپنے آپ کی جانب لوٹ آ اور قرآن کی بات سن:

بر درت جانم نیاز آوردہ است
ھدیۂ سوز و گداز آوردہ است
ز آسمان آبگون یم می چکد
بر دل گرم دمادم می چکد
من ز جو باریکتر می سازمش
تا بصحن گلشنت اندازمش

اگر ہم آخر تک ان کی بحثوں اور اشعار کو پڑھنا چاہیں تو بحث کی شکل ہی بدل جائے گی اور کافی زیادہ وقت لگے گا اور یہ تو ہمارے اس عظیم اقبال کی شخصیت کا ایک خلاصہ ہے، جو بلاشک مشرق کا بلند ستارہ ہیں اور بیجانہ ہوگا اگر ہم اقبال کو اس لفظ کے حقیقی معنی میں مشرق کا بلند ستارہ پکاریں۔ بہرحال ہمیں امید ہے کہ ہم اقبال کا حق ادا کرسکیں اور گذشتہ چالیس پچاس برس کے دوران اقبال کی شناخت کے سلسلے میں اپنی قوم کی تاخیر کا ازالہ کرسکیں۔

اقبال کی وفات گویا ۱۳۱۸ ہجری شمسی مطابق ۱۹۳۸ء میں ہوئی اور میرے خیال میں اس وقت سے اب تک یعنی اقبال کی وفات کے بعد سے آج تک کا جو ایک طویل عرصہ گذرا ہے، اگرچہ اقبال کے نام سے سیمینار ہوئے، کتابیں لکھی گئیں اور تقریریں ہوئیں، لیکن سب بیگانہ وار اور دور سے تھیں اور ہماری قوم اقبال کی حقیقت، اقبال کی روح اور اقبال کے عشق سے بے خبر رہی ہے اور اس کی کی انشاء اللہ تلافی ہونی چاہیے اور وہ لوگ جو اس کام سے تعلق رکھتے تھے مثلاً شعرا، مقررین، مصنفین، جرائد اور متعلقہ سرکاری ادارے مثلاً وزارت ثقافت و اعلیٰ تعلیم، وزارت تعلیم و تربیت اور وزارت ارشاد اسلامی، ہر ایک انشاء اللہ اپنی اپنی باری سے

Marfat.com

کوشش کریں کہ اقبال کو اس طرح جیسا کہ وہ ہیں، زندہ کریں اور ان کے کلام کو کورس کی کتابوں اور دیگر کتابوں میں شامل کر کے پیش کریں۔ ان کی کتابوں اور اشعار کو الگ الگ شائع کریں، اسرار خودی، کو علیحدہ، رموز بے خودی، کو علیحدہ، گلشن راز جدید کو علیحدہ، جاوید نامہ کو الگ۔ اس قسم کے کام کسی حد تک پاکستان میں ہوئے ہیں، لیکن افسوس کہ پاکستان کے عوام ان تعبیرات سے صحیح طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکتے کیونکہ وہاں پر فارسی پہلے کی طرح رائج نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ خلیج بھی پاٹ دی جائے گی۔ ہمارے پاکستانی بھائی جو یہاں موجود ہیں اور اسی طرح برصغیر ہندوستان کے تمام ادیب اپنے فرض کے طور پر فارسی زبان کے سلسلے میں خیانت آمیز سیاست کا مقابلہ کریں اور فارسی زبان کو جو عظیم اسلامی ثقافت کا ذریعہ ہے اور خود اسلامی ثقافت کا بڑا حصہ فارسی زبان میں اور فارسی زبان پر منحصر ہے، برصغیر ہندوستان میں جہاں پر مسلمان اصلی عنصر ہیں، رواج دیں اور ہمارے خیال میں خاص طور پر پاکستان میں یہ کام تیزی کے ساتھ ہونا چاہیے اور خود ہمارے ملک میں بھی اس (کلام) کے وہ مختلف اشاعتی امور جو انجام نہیں پائے، انجام پانے چاہئیں اور فنکار حضرات اقبال کے کام پر فنکاری دکھائیں۔ گلوکار ان شعروں کو پڑھیں اور ان پر دھنیں تیار کریں اور انشاء اللہ ان کو رواج دے کر ہمارے جوان اور بوڑھے عوام کی زبان اور دل میں لائیں۔

ہمیں امید ہے کہ خداوند تعالیٰ ہمیں توفیق عطا کرے گا کہ ہم اپنی حد تک امت اسلامیہ پر اقبال کے عظیم حق کی تلافی اور اس حق کو ادا کرسکیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

☆☆☆

Marfat.com

تذکرۂ اقبال بلوچستان میں

پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر☆

سرزمین بلوچستان میں اقبال شناسی کی روایت کا آغاز کم و بیش ستر بہتر سال پیشتر سے ہوتا ہے۔ عارف سیمابی سیالکوٹی لکھتے ہیں:(۱)

مئی ۱۹۳۵ء کے تباہ و برباد کرنے والے زلزلے سے پہلے بلوچستان میں ''انقلاب زندہ باد'' وغیرہ کا کوئی نعرہ یا فقرہ تک زبان سے ادا نہ کیا جاسکتا تھا۔ قانون کی سختی اور عام لوگوں کی مجبوری کا اندازہ اس ایک چھوٹے سے واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک دفعہ یوم النبیؐ کے مبارک موقع پر نعتیہ مشاعرے میں ایک شاعر نے جو علامہ اقبال سے بہت متاثر تھے، اپنی نعت میں انقلاب کا لفظ نظم کردیا۔ دوسرے روز اس شاعر کو پولیس کے دفتر میں اس خطرناک لفظ کے معنی سمجھانے پڑے۔ اس لفظ کے استعمال کا موقع محل بتانا پڑا۔ اپنی صفائی پیش کرنا پڑی۔ پھر بھی کوئٹہ کے ایک خان بہادر صاحب کی سفارش پر اس بیچارے کا چھٹکارا ہوا۔ ورنہ شاید ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑتے۔

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی جنہوں نے ایران میں علامہ اقبال کو متعارف کرانے کے لیے گرانقدر اور ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں مئی ۱۹۳۱ء میں محکمہ تعلیم بلوچستان سے بحیثیت سینئر انگلش ٹیچر وابستہ ہوئے۔ آپ کو شروع ہی سے علامہ اقبال کے کلام سے گہرا لگاؤ تھا۔ ڈاکٹر غلام سرور سابق صدر شعبہ فارسی کراچی یونیورسٹی کا کہنا ہے کہ (۲) ۱۹۲۳ء میں عرفانی، علامہ اقبال کی اسرار و رموز چکوال ہائی اسکول کے بزم اقبال کے جلسوں میں اپنی مخصوص لے میں ہمیں سنایا کرتے تھے۔

بلوچستان میں اقبال شناسوں میں ایک ممتاز مقام رکھنے والے چودھری عطا محمد مرحوم و مغفور (۷۴۔۱۹۰۵ء) سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج کوئٹہ اور ناظم تعلیمات بلوچستان اکثر کہا کرتے تھے کہ خواجہ عبدالحمید عرفانی ''فنا فی الاقبال'' ہیں اور اس طرح اقبال کے کلام سے لگاؤ پیدا کرتے ہیں کہ استاد ہوں یا شاگرد سبھی اقبال کے کلام کا اشتیاق سے مطالعہ کرنے لگتے ہیں۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ خواجہ عبدالحمید عرفانی خود تحریر کرتے ہیں:(۳)

کوئٹہ میں مقیم چند اہل علم و ادب دوستوں (جن میں ملک محمد صادق شاذ، خواجہ مسعود، منشی فضل کریم،

☆ ۱۷۲۔اے۔او بلاک III، سیٹلائٹ ٹاؤن، کوئٹہ

Marfat.com

سید اکبر حسین رضوی، سید اعجاز حسین رضوی، لطیف جلیلی، تحریک پاکستان کے معروف شاعر بشیر فاروق، نیک محمد عاطفی، بلوچستان کے ''حالی'' اور ''حسان'' صوفی نثار احمد محشر رسول نگری اور دس بارہ برس بعد آنے والے قادرالکلام شاعر سید آغا صادق حسین کے نام قابل ذکر و احترام ہیں) کے تعاون سے ۱۹۳۱ء سے قائم شدہ بزم اقبال، اردو اور فارسی زبان کی، خاص طور پر علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کی ترویج اور تبلیغ کی خدمت انجام دیتی رہی۔

بزم اقبال کے قیام کے بعد میں نے بہت حد تک شعر کہنا ترک کردیا اور تاحد مقدور اپنے پٹھان اور بلوچ شاگردوں میں اقبال کے اردو اور فارسی کلام کو مقبول بنانے میں کوشاں تھا۔ میرے شاگردوں کے لیے یہ بات خوشگوار حیرت کا موجب ہوئی کہ برصغیر ہند میں سب سے پہلا فارسی ادب کا مرکز خضدار اور سب سے معروف شاعرہ رابعہ خضداری(۴) تھی۔ اکثر طلبا غزنی، کابل اور لاہور میں فارسی کی مقبولیت سے آشنا تھے اور کوئٹہ اور قلات میں فارسی شعر کہنے والے موجود تھے اور بہت سے طلبا کی مادری زبان فارسی تھی۔ اس لیے علامہ اقبال کے فارسی کلام اور پیام کو نوجوان طلبا میں بہت جلد مقبولیت حاصل ہونے لگی۔

بلوچستان میں اقبال شناسی کی (۵)روایت قائم کرنے والے ایران میں پاکستان کے پہلے پریس اتاشی پھر کلچرل اتاشی جنہوں نے یہ روایت علامہ اقبال کے حوالے سے سرتا سر ایران پہنچائی، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی ہیں۔ جن پر سرزمین بلوچستان بھی فخر کرتی ہے۔بقول پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر:(۶)

عرفانی کی صحیح خدمات کا اندازہ مستقبل کا مورخ لگا سکے گا جو بالتفصیل اس بات کا جائزہ لے گا کہ اگر عرفانی ایران نہ پہنچتا تو پاکستان اور اقبال کی صحیح قدر و قیمت کا احساس ایران میں پیدا کرنا کیسے ممکن تھا؛

ڈاکٹر عرفانی کی ایک درجن سے زائد کتابیں تہران اور کراچی سے شائع ہوئیں اور پاکستان و ایران کے تحکیم روابط کا باعث بنی ہیں۔ ڈاکٹر عرفانی پہلے شخص ہیں جنہیں حکومت ایران نے علمی اعزازات سے نوازا اور حکومت پاکستان نے بھی خطاب دے کر ان کی قدر افزائی کی۔

بلوچستان میں سیاسی بیداری کے علمبردار اور مرد مجاہد میر یوسف علی خاں عزیز مگسی (۱۹۰۸-۳۵ء) علامہ اقبال سے بڑے متاثر تھے۔ میر محمد امین خان کھوسہ اپنے مضمون ''بلوچستان کے اولین انقلابی راہنما''(۷) میں لکھتے ہیں:

اقبال کے کلام میں ایک صحیح آدمی کے صحیح جذبات کے ابھارنے کی پوری طاقت موجود ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آدمی بھی صحیح ہو اور جذبات بھی صحیح ہوں۔ شکوہ اور جواب شکوہ اور اقبال کی دیگر نظمیں اس نوجوان سردار کی سیاسی راہنما بنیں اور آنا فانا یہ ناز ونعم میں پلا ہوا نوابزادہ اپنی قوم میں سے جہالت اور مفلسی دور کرنے کے خیال سے بلوچستان کے استبدادی حلقہ پر یلغار کرتا ہے۔

Marfat.com

یوسف عزیز نے اہل بلوچستان کو ابھارنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے۔ کراچی سے مختلف اخبارات (البلوچ، بلوچستان، بلوچستان جدید اور ینگ بلوچستان) جاری کرائے جو یکے بعد دیگرے ضبط ہوتے گئے۔ خود قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ قیدخانے میں پیام مشرق،(۸) کا مطالعہ کرتے رہے۔ جو کاپی ان کے زیر مطالعہ رہی اس پر بعض مقامات پر اپنے خیالات کو بھی درج کیا ہے جنھیں میں نے غالباً پہلی بار اپنی کتاب **علامہ اقبال اور بلوچستان** میں پیش کیا تھا۔

مئی ۱۹۳۴ء میں یوسف عزیز نے ''بلوچستان کی آواز'' کے نام سے ایک پمفلٹ طبع کراکر برطانوی پارلیمنٹ لندن کو بھجوایا۔ اپنے احباب کو اردو میں بیشمار خطوط تحریر کیے جو نہ صرف ان کی اپنی شخصیت کے آئینہ دار ہیں بلکہ مسلمانوں کے بارے میں اصلاحی تقاضوں کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ انہوں (۱۰) نے اسلام کے سماجی فلسفے کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ان کے خیالات کے مطابق اسلام کا سماجی فلسفہ یہ تھا کہ انفرادی مفاد اجتماعی مفاد کے تابع ہو۔

یوسف عزیز نے اپنے علاقے میں فلاح و بہبود کے متعدد کام کیے مثلاً کھیرتر نہر بنوائی، ایک قصبے کی بنا رکھی اور اسکول قائم کیا۔ اس زمانے میں پچاس ہزار روپے کے ذاتی عطیے سے ''جامعہ یوسفیہ عزیزیہ'' جیسی دینی درسگاہ قائم کی۔(۱۱) مزید برآں غریبوں کے لیے شفاخانہ اور دارالاقامہ کا انتظام کیا۔

مختصراً یوسف عزیز نے جہاں اپنی دوسری گوناگوں صلاحیتوں کو قومی بیداری و ترقی کے لیے وقف کر رکھا تھا، وہاں انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیت کو بھی اسی عظیم مقصد کے حصول کے لیے استعمال کیا۔ چنانچہ انتظار حسین(۱۲) کا یہ کہنا برمحل ہے کہ یوسف علی عزیز کی شاعری کے ذریعے ہم بلوچستان کے سیاسی شعور کا اس وقت کے ہندوستان کے اس بھرپور سیاسی شعور سے رشتہ پیوست ہوتا دیکھتے ہیں جس کا اردو میں علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور دوسرے ان گنت چھوٹے بڑے شاعروں کے واسطے سے اظہار ہو رہا تھا اور جس کی بنا پر اردو ہندوستان کی تحریک آزادی کی اور آگے چل کر تحریک پاکستان کی زبان بن گئی۔

یوسف عزیز کے چند شعر یہ ہیں:(۱۳)

میں اگر چاہوں تو ذرے کو بیاباں کردوں　　قطرۂ آب میں پیدا سرِ طوفاں کردوں
پھر وہی بھولا سبق یاد دلاؤں سب کو　　ہر بلوچی کو غرض عامل قرآں کردوں
جی میں آتا ہے کہ پھر طور کو آباد کروں　　آتش دل سے پہاڑوں میں چراغاں کردوں
گاندھی و مالوی کے وعظ دھرے رہ جائیں　　میں اگر قول محمدؐ کو نمایاں کردوں

Marfat.com

میں وہ مالی ہوں، اگر کھول دوں دل کی سوتیں
خشک صحراؤں میں پیدا گل و ریحاں کردوں
اسی ایقان براہیم کا وارث ہوں عزیز
اب بھی آتش کو اگر چاہوں گلستاں کردوں
قسم ہے امیٔ بطحا کے ایثار و شجاعت کی
شکم پر سنگ خارا باندھنے والی سخاوت کی
کہ اپنے ملک سے داغ غلامی دھو کے چھوڑوں گا
بلوچستاں کو آزادی کی مے پلوا کر چھوڑوں گا
میں پھر اندازِ نو سے نغمۂ حبِ وطن گا کر
سکوت اندوز تار اسلام کا بجوا کے چھوڑوں گا
سبق دے کر اخوت کا، شجاعت کا، محبت کا
میں پھر بگڑی بلوچستان کی بنوا کے چھوڑوں گا
اس کو مٹا جلدی مٹا
سردار ہو انگریز ہو
جو قوت شیطان ہو
جو ثانی چنگیز ہو
اے مطرب نغمہ نواز

علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزو است
بامن میا کہ مسلک شبیرم آرزو است

یوسف عزیز گویا ہوئے:

بلوچم و شجاعت بلوچم آرزو است
خیزید! باز نعرۂ اسلام آرزو است

۱۹۰۳ء(۱۴) میں پہلی بار علامہ اقبال بلوچستان میں بمقام فورٹ سنڈیمن (ژوب) تشریف لائے تھے۔ آپ نے ڈیرہ اسماعیل خاں سے دربن، مغل کوٹ، تنگی سر اور مانی خواہ ہوتے ہوئے براستہ دانا سر(دانے کا سرا، پہاڑ کی چوٹی، فاصلہ ۱۱۰ میل، ۱۹۰۳ء میں درہ میں سے اونٹوں کے قافلے کا قدرتی اور واحد راستہ جہاں بعد ازاں بڑی مشکل سے سڑک بنائی گئی) فورٹ سنڈیمن (ژوب) تک سفر کیا تھا کیونکہ وہاں آپ کے بھائی صاحب ایک مصیبت میں گرفتار تھے۔ اس کی تفصیل *علامہ اقبال اور بلوچستان* میں ملاحظہ کیجیے۔ کمال الدین احمد نے لکھا ہے:(۱۵)

علامہ اقبال ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۹ء میں دو مرتبہ کوئٹہ تشریف لائے۔ آپ بسنت سنگھ عین میں بابو عبدالحق جو زبردست ویٹ لفٹر تھے اور گھوڑا اٹھایا کرتے تھے اور فضل الٰہی جن کا یہاں پہلا موٹروں کی مرمت کا کارخانہ تھا کے پاس مقیم ہوئے۔ یہ دونوں علامہ اقبال کے عزیز تھے اور علامہ یہاں صرف تین یا چار دن ٹھہرے۔

۱۹۳۳ء میں نادرشاہ کی دعوت (۱۶) پر علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، علامہ سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر سر راس مسعود کابل (افغانستان) تشریف لے گئے تھے۔ چار روز کے بعد ۲ نومبر ۱۹۳۳ء کو بذریعہ چمن، کوئٹہ واپس آئے تھے۔ چمن میں شہر کے دروازے پر ہی مسلمانوں نے ان کا استقبال کیا اور ایک ریستوران

Marfat.com

میں لا کر بٹھایا۔ اہالیان شہر کا تقاضا تھا کہ اقبال اور سید سلیمان ندوی ایک شب چمن میں قیام کریں اور مسلمانوں کے سامنے تقریریں کریں لیکن ان حضرات نے معذرت کی۔

اس سفر میں علامہ اقبال کے ایک رفیق غلام رسول خاں بیرسٹر بھی ہمراہ تھے۔ سب صاحبان مغرب اور عشا کے درمیان کوئٹہ پہنچے اور یہاں کے ڈاک بنگلے میں قیام کیا۔ کوئٹہ میں اس وقت خاصی سردی تھی۔ بستر اور سامان لاری کے ذریعے رات کے دس بجے پہنچا اور سب نے شکر کا کلمہ پڑھا۔ سب نے کھانا ڈاک بنگلے کے ڈائننگ روم میں کھایا۔ کھانا انگریزی تھا مگر بہت معمولی اور بہت خراب پکا تھا۔ ناچار پاؤ روٹی اور مکھن پر گذر کیا۔

اگلے روز صبح سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود باہر گئے تو خفیہ پولیس کے انسپکٹر نے جو کلاہ و دستار، کوٹ اور شلوار میں ملبوس تھا پوچھ گچھ کی۔

۱۰ بجے کے قریب سب لوگ ڈاک بنگلہ سے چل کر اسٹیشن آئے۔ انسپکٹر موصوف موجود تھے۔ انہوں نے اسباب کے تلوانے اور ٹکٹ لینے میں مدد فرمائی، ۱۱ بجے کے قریب گاڑی آئی اور سب صاحبان آرام سے سوار ہوکر روانہ (۱۷) ہوئے۔ ملتان تک سید سلیمان ندوی اور اقبال کا ساتھ رہا۔ سید سلیمان ندوی ملتان ٹھہر گئے۔ اقبال اسی روز رات کو اپنے گھر پہنچ گئے۔

میر عبدالعزیز کرد (۱۸) کا شمار بلوچستان کی تحریک آزادی کے چند ممتاز رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ وہ قلات نیشنل پارٹی مستونگ کے صدر رہے۔ انہوں نے ۱۹۳۳ء میں حضرت علامہ اقبال سے بلوچستان کے مسائل کے بارے میں ملاقات کی۔ ان کے ہمراہ ان کے ایک رفیق جناب محمد حسین عنقا بھی تھے۔ انہوں نے اس ملاقات کی تفصیلات اپنے مضمون ''قطب عالم، عارف ہند حضرت علامہ اقبال'' مطبوعہ روزنامہ احسان، لاہور، اقبال نمبر، مئی ۱۹۳۸ء میں یوں بیان کیں:

دوران گفتگو حضرت علامہ نے متعدد مشورے دیے جن میں ایک یہ تھا کہ مغرب سے آئی ہوئی اصلاحات سے بیمار قوموں کو شفا حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے آپ شریعتِ اسلامیہ کی طرف رجوع کریں۔ میر عبدالعزیز کرد نے آخر میں عرض کیا: '' ڈاکٹر صاحب! آپ کی تعلیمات نے ملت اسلامیہ میں نئی روح پھونک دی ہے۔ آپ نے ہم کو جگایا ہے، لیکن ہم سب کو آپ سے یہ شکایت ضرور ہے کہ عملی طور پر آپ نے کوئی کام نہیں کیا۔''

اس پر حضرت علامہ نے فرمایا: بیٹا! کیا میرا یہ عمل تھوڑا ہے کہ میں نے آپ لوگوں کو ایک گہری نیند سے جگا دیا ہے اور تمہارے سامنے کردار و عمل کا ایک راستہ تیار کرکے رکھ دیا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اس راستہ پر چلو اور میری تعلیمات پر عمل کرو۔ میرا کام تمہیں درس دینا ہے۔ آگے یہ تمہارا کام ہے کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر مردانہ وار جہاد کرتے پھرو۔ دنیا میں آج تک کوئی ایسی ہستی پیدا نہیں ہوئی جس نے خود ہی ایک نظریہ قائم کیا اور خود ہی اس پر عمل پیرا ہوکر اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہو۔

ایک لمحہ توقف کیے بغیر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اس مرد باخدا نے فرمایا ''ہاں البتہ ایک ہستی

Marfat.com

ضرور ایسی ہے۔ جس نے خود ہی ایک نظریہ پیش کیا اور خود ہی اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ جانتے ہو وہ کون تھے؟ وہ محمدؐ عربی تھے۔

محمد عربیؐ کا نام اس عارفِ کامل نے ایک ایسے پرسوز اور دردناک لہجے میں ادا کیا کہ شدت تاثیر سے میری آنکھیں بند ہوگئیں اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو حضرت علامہ اقبال کی نگاہیں ہمارا جائزہ اس طرح سے لے رہی تھیں جس طرح ایک شکاری اپنے شکار پر تیر چھوڑنے کے بعد جائزہ لیتا ہے کہ نشانہ ٹھیک بیٹھا ہے یا نہیں۔ میں نے عرض کیا: ''بجا ہے جناب! میں قائل ہوگیا ہوں۔ آپ نے ملت اسلامیہ کو بیدار کر کے واقعی بہت بڑا عمل کیا ہے۔ ایک ایسا عمل جس کی نظیر کوئی نہیں۔''

بلوچستان کے ایک عالمِ باعمل اور درویش باصفا حاجی(۱۹) غلام سرور بارکزئی علامہ اقبال کے عقیدت مندوں اور پرستاروں میں سے تھے۔ اسی عقیدت کیشی کے باعث انہوں نے مستونگ (کوئٹہ سے بتیس میل اور قلات ڈویژن کا مشہور شہر اب ضلعی صدر مقام بھی ہے) سے لاہور کا سفر کیا تھا۔ وہ علامہ موصوف کو ایک عظیم شاعر اور ایک ولی اللہ مانتے تھے اور ان کی تخلیقات کو ''ھست قرآن در زبان اردو و فارسی'' سمجھتے تھے۔

حاجی سرور کے السلام علیکم، کا جواب حضرت علامہ نے ''مرحبا و علیکم السلام، اے درویش'' دیا تھا۔ حاجی سرور نے علامہ اقبال کو ویسا ہی پایا جیسا وہ سمجھتے تھے۔حاجی غلام سرور نے علامہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ قوم کو بیدار کرنے کا پیغام تو دے رہے ہیں لیکن ہندوستان کے تیرہ بخت اور نابینا اس پیغام سے بینا نہ ہوسکیں گے۔یہ سن کر علامہ اقبال نے فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ میری یہ خفتہ قوم ضرور جاگ اٹھے گی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میری قوم کا مستقبل درخشاں ہے۔صرف وقت درکار ہے۔

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے ترا مرضِ کور نگاہی!

جب حاجی غلام سرور بارک زئی واپس لوٹے تو علامہ اقبال نے ستر روپے بطور زادِراہ دیے۔ جتنا انکار کیا اتنا ہی اصرار بڑھا حتیٰ کہ حاجی موصوف کو پیسے لینے پڑے:

نہ تاج و تخت میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

بلوچستان کی ایک اور معروف شخصیت سردار بہادر نواب اسد اللہ خان رئیسانی (سراوان کے سردار اعلیٰ، سرسردار اسد اللہ خاں کے پوتے، نواب میر مہر اللہ خان کے نواسے، سابقہ ریاست قلات کی کونسل کے رکن اعلیٰ، تمام بلوچستان کے نمائندے اور منجانب سابقہ ریاست قلات خط وکتابت میں ان کو ''محب صمیم'' کے لقب سے مخاطب کیا جاتا تھا) بھی علامہ

Marfat.com

اقبال کے بڑے گرویدہ تھے۔

محمد حسین عنقا مچھ کے رہنے والے تھے۔ آپ نے اپنا مجموعۂ کلام رحیل کوہ کے عنوان سے ۱۹۳۴ء میں کراچی سے چھپوایا۔ اُس میں دو نظمیں موجود ہیں۔ ایک مرغ ہوا اور مرغ سرا، جو علامہ اقبال کے مکالمہ مابین ''مرغ سرا و مرغ ہوا'' پر لکھی گئیں، دوسری سنٹرل جیل مچھ میں بزبان فارسی علامہ اقبال کی نظم حکمتِ فرنگ (پیام مشرق) کے جواب میں تحریر کی گئی۔

تاسیس پاکستان کے بعد نامور شاعر و ادیب ش۔ ضحیٰ کی پہلی نظم جو کوئٹہ میں لکھی گئی تھی، اس کا عنوان تھا ''علامہ اقبال کی خدمت میں'' اس میں جذبات کی شدت کے ساتھ ساتھ بیان کی بلندی و تازگی اور اقبال کی تصانیف اور اشعار کے فنکارانہ ذکر نے نظم میں ایک امتیازی رنگ پیدا کردیا تھا۔ سب سے بڑھ کر اس میں وہ واقعیت جھلکتی ہے جو اردو شاعری میں عام نہیں۔ چند شعر یہ ہیں: (۲۰)

بالِ جبریل کی سوگند تجھے، دیکھ تو لے — اپنے جانباز شہیدوں کا لہو لایا ہوں
تیری آواز کی تاثیر تھی یا ضربِ کلیم — جس نے پھر شوکت اسلام کا در کھول دیا
قرطبہ جا کے لٹائے تھے جو آنسو تو نے — مہر و مہ بن کے کراچی میں درخشاں ہیں آج
فرطِ غم یہ ہے کہ مژدہ یہ سنائیں کس کو — مورِ بے مایہ نہیں ہم تو سلیماں ہیں آج
کھول دے روزنِ فردوس، خودی کے صدقے — اپنے دیرینہ نشیمن کی بہاروں کو تو دیکھ
دیکھ کشمیر کی وادی میں تبسم اپنا — سربکف مرد مجاہد کی قطاروں کو تو دیکھ

وادیِ شال میں قیام کے دوران ش۔ ضحیٰ نے علامہ اقبال سے متعلق اور نظمیں بھی کہیں۔ علامہ اقبال کے حضور، کا آخری بند یہ ہے:

وہ بدنصیب، وہ دہقان فاقہ کش جس نے
ہر ایک دانۂ گندم کو کر دیا گوہر
وہ اک عجیب تبسم کے ساتھ جاگے گا
بڑھے گا ہاتھ میں مشعل لیے بہ عزمِ دگر
ترے کلام کی تکمیل کر کے چھوڑے گا!
ترے پیام کی تعمیل کر کے چھوڑے گا!

ش۔ ضحیٰ ''ذوق نمو'' میں کس خوبصورتی اور حسن سے علامہ اقبال کے اثرات کا نقشہ بلوچستان میں کھینچ رہے ہیں۔ آخری تین بند ملاحظہ کیجیے:

''کاریز'' کا سیم پاش پانی — یہ اس کی چھپی چھپی روانی

Marfat.com

کہسار کے دل کی آرزو ہے ہے جذبِ دروں کی اک کہانی
یہ موسمِ گل یہ اس کے جلوے جلوے یہ تمام ہیں خودی کے
اے وادیِ شال! تیرے قرباں ہم کو بھی یہ بانک پن سکھا دے
ہم کو بھی، یہ رنگ و بو عطا کر یہ منزلِ آرزو عطا کر
اس میکدۂ زمرّدیں سے صدقے ترے! اک سبو عطا کر

پروفیسر انور رومان کا اہم ترین ادبی مقالہ ''پاکستانی ادب اس کا ماضیِ قریب اور اس کی ذمہ داریاں''، مطبوعۂ مخزن، لاہور، شمارے جولائی اگست ۱۹۴۹ء، ضخامت ۳۵ صفحات) کے دوسرے حصے میں مصنف نے پاکستانیت کے پیشِ نظر پاکستانی ادیب و شاعر اور فنکار و دانشور کے سامنے کچھ ٹھوس تجاویز پیش کیں تھیں۔ جنہیں پاکستانی ادب کا مقدر بننا تھا۔ ان کی تجاویز میں سرفہرست اقبال شناسی تھا۔ اقبال شناسی کے لیے انہوں نے باقاعدہ ایک پلان کی ضرورت پر زور دیا جیسے:

۱۔ ان کے کلام کی تشریح و توضیح۔ ان کے مطالب کو عوامی ذہن تک پہنچایا جائے
۲۔ وہ جامعیت کے لحاظ سے انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ اس لیے دوسرا ضروری قدم علمی و تحقیقی ہو۔
۳۔ تیسرا اہم قدم تنقیدی ہے۔ پہلے انہیں پڑھا جائے کیونکہ پہلے دوسروں کو پڑھ کر پھر ان کو پڑھنے سے اقبالیات کی روح مسخ ہو کر رہ جاتی ہے اور خود نقاد بھی الجھ کر رہ جاتا ہے۔

مثنوی صحیفۂ فطرت (مصنف نثار احمد محشر رسول نگری، کوئٹہ، ۱۹۵۷ء) ایک طویل نظم ہے جو مثنوی مولانا رومی اور علامہ اقبال کے اسرار و رموز کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ محشر رسول نگری کے نزدیک ملت اسلامیہ کے لیے عظیم ترین مقصد رضائے الٰہی ہے:

مقصدِ ہستی رضائے دوست ہے مغزِ ایماں ہے یہ باقی پوست ہے

اس مقصد کے حصول کے لیے حق سے غیر معمولی عشق بھی ضروری ہے۔ جس کی بہترین اور مکمل مثال آنحضرتؐ کی سیرت سے مل سکتی ہے۔ عشق کیا ہے؟ اتباعِ مصطفیٰؐ؛ عشق کیا ہے؟ صبر و تسلیم و رضا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا ہے:

پہلے وہ انسان کی دلداری کرے
درد کے ماروں کی غمخواری کرے

کیونکہ رازدارانِ حقیقت کا یہی شیوہ ہے:

برگِ گل پر گوہرِ شبنم بنے
زخمِ دل دیکھا جہاں مرہم بنے

Marfat.com

قلب و نظر کی عفت کی تعلیم یوں دیتے ہیں:

نفس کو قابو میں رکھ اور تن کے رہ
ان زلیخاؤں میں یوسف بن کے رہ

محشر رسول نگری اس طرح عمل پر ابھارتے ہیں:

اب نہ آہ صبح گاہی چاہیے
خون سے حق کی گواہی چاہیے

مسلمانوں کے سیاسی افکار (مصنف پروفیسر رشید احمد، لاہور، ۱۹۶۰ء) میں مذکور بارہ مسلمان مفکرین میں سے ایک علامہ اقبال ہیں۔ ان کے حالات زندگی کتابیں اور سیاسی نظریات کے متعلق مختصر جائزے ہیں۔ پروفیسر رشید احمد کے دو اور مضمون بھی شائع ہوئے ''اقبال مجدد عصر''، ھمایوں، لاہور، اگست، ۱۹۵۱ء ''اقبال کے سیاسی افکار''، ثقافت، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۹ء۔

اقبال کا نظریۂ اخلاق (مصنف پروفیسر سعید احمد رفیق، لاہور، ۱۹۶۰ء ضخامت ۲۱۴ صفحات) آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ جو تصور خودی، عمل کی مثبت اور منفی اقدار، فرد اور ملت اور اخلاقیات و مابعدالطبیعیات کے باہمی رشتہ سے متعلق ہیں۔ مصنف محض اقبال کے بنیادی اخلاقی نظریات کو واضح کرنے میں ہی کامیاب نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے اقبال کو مسلم مفکرین کے جھرمٹ میں رکھ کر تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔

علامہ اقبال کا نظریۂ اخلاقیات اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے۔ ان پر مولانا رومی کا بہت زیادہ اثر ہے۔ ان کا نظریہ ''فوق البشر'' نطشے سے بالکل مختلف ہے۔ نطشے کے نزدیک بلند ترین اخلاقی اصول طاقت تھا خواہ اس کا استعمال صحیح طریقے سے ہو یا غلط طریقے سے۔ علامہ اقبال عجمی تصوف کے سخت خلاف تھے کیونکہ وہ رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ایک متحرک زندگی کے خواہاں تھے جس کی رہنمائی عشق کرے۔

مابعدالطبیعیات کسی بھی اخلاقی نظام کے لیے ایک لازمی چیز ہے۔ اسلامی ضابطۂ اخلاق کی بنیاد بھی اسی قسم کا ایک مابعدالطبیعیات اصول ہے۔ یعنی توحید، نبوت، آزادی، قوتِ ارادی اور حیات بعدالممات پر یقین رکھنا۔

مصنف کا طرز بیان سادہ اور رواں ہے۔ انہوں نے اپنے دلائل کے ساتھ اقبال کے اردو اور فارسی شعر بکثرت پیش کیے ہیں۔

علاوہ ازیں پروفیسر سعید احمد رفیق کے متعدد مقالات شائع ہوئے ہیں۔ انہوں نے

Marfat.com

اب تک یوم اقبال کی متعدد تقاریب اور ریڈیو پر اقبال کے فکر اور شعر کے مختلف پہلوؤں پر تقاریر اور مقالات پیش کیے ہیں۔ علامہ اقبال اور بلوچستان (۲۱) میں تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

بر دوشِ ہوا (مصنف پروفیسر آغا صادق، لاہور، ۱۹۶۲ء) دس نشری تقریروں اور دو غیر نشری مقالوں کا مجموعہ ہے۔ علامہ اقبال سے متعلق دو نشری تقریروں کے عنوان ہیں: ''اقبال ایک فنکار کی حیثیت سے'' اور ''اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز''

زخمہ و ساز (از پروفیسر آغا صادق، کوئٹہ، ۱۹۶۸ء) علامہ اقبال کی چالیس غزلیات و منظومات پر چالیس تضمینوں کا مجموعہ مع تشریحی فوائد ہے۔ تفصیل یوں ہے: **بانگِ درا** ۱۴، **بالِ جبریل** ۲۱، **ضربِ کلیم** ۳، **ارمغانِ حجاز** ۲۔ پروفیسر آغا صادق نے علامہ کے کلام پر پچاس ساٹھ سال پیشتر تضمینات لکھنا شروع کی تھیں۔ جو قیامِ پاکستان کے بعد جلد ہی بلوچستان کے اخبارات میں چھپنے لگی تھیں اور بلوچستان میں اقبال کے کلام اور افکار کے پھیلاؤ میں ممد و معاون ثابت ہوئی تھیں۔ نسیم حجازی اس کے تعارف، میں لکھتے ہیں:

> اقبال کے کلام کو ہر پاکستانی کے کانوں تک پہنچانا ہمارا اولین فرض ہے۔ دریا موجود ہے زرخیز مٹی کو سیراب کرنے کا کام باقی ہے... مجھے امید ہے کہ اس کاوش کو اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھا جائے گا۔

آغا صادق کے بعض اشعار میں علامہ اقبال کے لب و لہجہ اور مضامین کا خاصا اثر ہے جیسے:

کوند رہی ہیں بجلیاں، پردہ جاں کی خیر ہو
نغمہ نواز کون ہے، سوز دروں کے ساز میں
غریب کا اقتدار ہوگا، غریب اب تاجدار ہوگا
غلام و آقا کا پردۂ امتیاز اب تار تار ہوگا

آغا صادق کی تضمینات میں سے چند بند ملاحظہ کیجیے:

اگر نیٹشے چلا آتا مرے اسرار خانے میں　　حقیقت کا مزا پاتا مرے رنگیں فسانے میں
کوئی مشکل نہ پیش آتی اسے عرفان پانے میں　　''اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے؟''

آج وہ خوبیِ کردار اڑا لی کس نے؟　　مجھ سے وہ لذتِ پیکار اڑا لی کس نے
سنتِ حیدرؓ کرار اڑا لی کس نے؟　　''عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی''

Marfat.com

فرمانِ خداوند یہ بندوں کو سنا دو　　　عالم کو وہی رنگ مساوات دکھا دو
ہر سرکش و مغرور کی گردن کو جھکا دو　　　اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو!''

مست مے حجاز ہوں اور نہیں کوئی ترنگ!　　　طبع غیور پر میری غیر کا چھا سکا نہ رنگ!
مغربیوں کی پیروی میرے لیے ہے وجہِ ننگ!　　　''خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ!
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف!''

آغا صادق نے ڈاکٹر اقبال کے فارسی کلام پر بھی تضمینیں لکھی ہیں۔ آپ نے اپنے فارسی مجموعۂ کلام شاخِ طوبیٰ کا انتساب شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے نام کیا ہے۔ علامہ اقبال سے متعلق ان کے کئی مضامین فارسی میں بھی شائع ہوئے۔ جو ان کی مطبوعہ کتاب آہنگ شیراز (ملتان ۱۹۷۲ء) میں موجود ہیں۔ شہناز بانو نے ۱۹۸۷ء میں بعنوان ''آغا صادق۔ احوال و آثار'' (تحقیقی و تنقیدی مقالہ) برائے ایم۔ اے اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور لکھا تھا جو ۵۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر نوید حسین نے ''اقبال شناسی اور آغا صادق'' مرتب کرکے لاہور سے ۱۹۹۵ء میں شائع کرائی (صفحات ۱۹۹ مجلد) بقول آغا صادق: ''جب سے ہوش سنبھالا ہے، اقبال مست ہوں.... بادۂ اقبال پیتا بھی رہا ہوں اور پلاتا بھی رہا ہوں۔'' (سرورق کی پشت)

سید صفدر حسین صفدر چند سال تک بلوچستان (مستونگ، کوئٹہ) میں بحیثیت لیکچرار فلسفہ مقیم رہے۔ علامہ اقبال سے متعلق ان کے یہ مضامین قابلِ ذکر ہیں۔ ا۔ ''اقبال اور اس کی ہمہ گیر شخصیت''، چٹان، لاہور، ۸۔ اپریل ۱۹۶۸ء؛ ۲۔ ''فکرِ اقبال کی رہنمائی''، سیارہ ڈائجسٹ، لاہور، جون ۱۹۶۸ء۔

۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کی یوم پیدائش کی صد سالہ تقریبات کی مناسبت سے پروفیسر انور رومان نے انگریزی میں ایک طویل مقالہ "Iqbal, A Hero and His Heroes" تحریر کیا تھا۔ جو سہ ماہی اقبال، لاہور کے شمارہ ۲۴، (اکتوبر ۱۹۷۷ء) میں (صفحہ ۱۰۰۔ ۵۵) میں چھپا تھا۔ اسی نسبت سے راقم الحروف کی کتاب جوئے کوثر (لاہور، ۷۷۔۱۹۷۶ء) شائع ہوئی۔ جس میں مختلف موضوعات سے متعلق مضامین ہیں شامل ہیں مگر اقبالیات کا سیکشن خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ اسی طرح راقم کی ایک اور کتاب مردِ حُر (لاہور، ۱۹۷۸ء) میں پانچ مضامین ہیں جو علامہ اقبال کے افکار کی وضاحت کرتے ہیں۔ ۱۹۷۷ء کی مناسبت سے راقم کے تین مختلف مقالوں کے ترجمے پشتو، بلوچی اور براہوئی میں شائع ہوئے۔

Marfat.com

دسمبر ۱۹۷۷ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج لورالائی کے میگزین رگ سنگ کا خصوصی شمارہ قائداعظم و اقبال نمبر چار زبانوں (اردو، انگریزی، فارسی، پشتو) میں شائع ہوا۔ جس کا سرپرست راقم تھا اور مدیر اعلیٰ پروفیسر خورشید افروز۔ ظفر مرزا نے علامہ اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ، کا براہوئی ترجمہ کیا جو ایلم مستونگ کے ۱۹ مئی ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ ترجمہ خاصا پسند کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوئی نے براہوئی میں ایک کتابچہ علامہ محمد اقبال تحریر کیا۔ جو ۱۹۷۸ء میں کوئٹہ سے شائع ہوا۔

پیر محمد زبیرانی نے علامہ اقبال کی بعض نظموں کا بلوچی اور براہوئی میں ترجمہ کیا ہے جو کوئٹہ سے ۱۹۷۸ء میں چھپا۔ انہوں نے ارمغان حجاز کا بھی بلوچی میں ترجمہ کیا جو ابھی تک غیرمطبوعہ ہے۔ میر مٹھا خاں مری نے علامہ اقبال پر بلوچی میں ایک کتاب درگال اقبال (صفحات ۴۸۸، کوئٹہ، ۱۹۷۷ء) شائع کرائی جو علامہ اقبال کی زندگی اور افکار پر مبنی ہے۔ اسی سال غوث بخش صابر نے بھی علامہ سے متعلق احمد ندیم قاسمی کے ایک کتابچہ کا بلوچی میں ترجمہ چھپوایا۔ غوث بخش صابر نے اقبال سے متعلق ایک اور کتاب لال ءِ لقا بھی بلوچی میں لکھی تھی۔ جو ۱۹۹۹ء میں اقبال اکادمی پاکستان، لاہور نے شائع کی ہے۔

پہلی ڈاکٹر محمد اقبال بین الاقوامی کانگرس لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۲دسمبر تا ۷ دسمبر ۱۹۷۷ء منعقد ہوئی۔ اس میں راقم نے ایک مقالہ بعنوان ''علامہ اقبال اور تحریک پاکستان'' پڑھا اور پروفیسر مجتبیٰ حسین جامعہ بلوچستان کوئٹہ نے ایک مضمون بعنوان ''اقبال کے قارئین،'' پیش کیا۔

علامہ اقبال اردو کانفرنس ۳ تا ۶ نومبر ۱۹۷۷ء لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس میں راقم نے ایک مقالہ بعنوان '' علامہ اقبال اور بلوچستان'' پڑھا۔

علامہ اقبال اور اردو کانفرنس میرپور، آزاد کشمیر میں ۷ تا ۸ نومبر ۱۹۷۷ء کو انعقاد پذیر ہوئی۔ ایک سیشن میں راقم سے مقالہ ''اقبال اور بلوچستان''، پڑھوایا گیا۔ ثانوی و اعلیٰ تعلیمی بورڈ لاہور کے زیر اہتمام علامہ اقبال سے متعلق ایک اہم مذاکرے میں ۹ نومبر ۱۹۸۲ء کو راقم نے ''علامہ اقبال اور بلوچستان'' کے عنوان سے خطاب کیا۔

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۸۲ء کے آخری ہفتہ میں لاہور میں ہمدرد قومی سیرت کانفرنس کا موضوع ''تعلیمات نبویؐ۔ خودی'' تھا۔ راقم نے ۲۸ دسمبر ۱۹۸۲ء کو مقالہ بعنوان ''خودی اور شیخ سعدیؒ'' پیش کیا جس کے آخر میں علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کا بھی ذکر ملتا ہے۔

Marfat.com

دوسری بین الاقوامی اقبال کانگرس منعقدہ ۹ تا ۱۱ نومبر ۱۹۸۳ء زیر اہتمام جامعہ پنجاب لاہور میں بلوچستان سے تین صاحبان نے مقالات پیش کیے۔''علامہ اقبال کا ذہنی ارتقا'' از مسز ثاقبہ رحیم الدین، ''علامہ اقبال اور بلوچستان'' از راقم، ''اقبال اور عظمت آدم'' از ملک محمد رمضان۔ملک محمد رمضان نے بال جبریل کا بلوچی میں ترجمہ کیا تھا جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

علامہ اقبال اور بلوچستان (از ڈاکٹر انعام الحق کوثر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، کل صفحات ۲۱۶

ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی کی رائے میں ''اقبال کے حوالے سے کسی صوبہ کے بارے اس قسم کی معلومات جمع کرنے کا کوئی کام اب تک نہیں ہوا ہے۔''

اقبال اکادمی پاکستان لاہور نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو پشین میں زیر صدارت جنرل محمد موسیٰ گورنر بلوچستان، ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو ایلیمنٹری کالج مستونگ اور یکم نومبر ۱۹۸۷ء کو قلم قبیلہ ادبی ٹرسٹ کوئٹہ کے ہال میں زیر صدارت جام میر غلام قادر وزیر اعلیٰ بلوچستان یوم اقبال کے سلسلے میں ادبی پروگرام ترتیب دیے جو بہت کامیاب رہے۔ راقم نے بطور صوبائی معاون ہر مرحلے پر تعاون کیا اور انہوں نے اقبال اکادمی کی جانب سے طلبہ و طالبات کے لیے علامہ اقبال سے متعلق انعامی ادبی تقریب کا بندوبست کیا۔ انعامات اقبال اکادمی پاکستان نے مہیا کیے تھے۔

ناگی عبدالرزاق خاور نے اپنے دوسرے مجموعہ کلام *قندیل* (زیر اہتمام: انجمن دبستانِ بولان کوئٹہ، ۱۹۸۸ء) میں کہا ہے:

ہے نام، اقبال کا پیوستہ جیسے شمس تبریز جلال الدین رومی سے
بہ فیض قدس روحانی اب ان کے ساتھ خاور کا بھی روشن نام ہو جائے

ناگی عبدالرزاق خاور کی *تضمینات اقبال* ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

نصاب تعلیم میں اقبالیات کے سلسلے میں ۲ اور ۳ اپریل ۱۹۸۸ء کو اقبال اکادمی لاہور کے زیر اہتمام ورکشاپ منعقد ہوئی۔

اقبالیات کے چند خوشے (از ڈاکٹر انعام الحق کوثر، کوئٹہ، ۱۹۸۸ء؛ بار دوم، لاہور، ۱۹۹۶ء) میں دو مقالوں (''بال جبریل کا تنقیدی مطالعہ''، ''علامہ اقبال اور تیسری دنیا'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔)

اقبالیات اور مغربی استعمار (از پروفیسر انور رومان، لاہور، ۱۹۸۹ء اشاعت ثانی: لاہور ۱۹۹۶ء) کا انتساب پانچ بچیوں کے نام ہے۔ جو انوکھا ہے۔ پانچویں بچی کہتی ہے:

Marfat.com

''میرے ابو کا خیال ہے کہ وہ (علامہ اقبال) پوری دنیا کے تھے کیونکہ وہ انسانوں کو اچھا بنانا چاہتے تھے۔''

اقبال شناسی اور بلوچستان کے کالج میگزین (در ۲ جلد؛ از ڈاکٹر انعام الحق کوثر، لاہور، ۱۹۸۹ء، دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۴ء)

اقبال شناسی اور ادبائے بلوچستان کی تخلیقات (از ڈاکٹر انعام الحق کوثر (جلد اول) لاہور، ۱۹۹۰ء (جلد دوم)، لاہور، ۱۹۹۲ء)۔

موجودہ دور کے بلوچی شعرا کے سرخیل اور ملک الشعرا میر گل خاں نصیر کی شاعری میں بعض جگہوں پر علامہ اقبال کی فکر اور انداز بیان کے اثرات نمایاں ہیں۔ میر گل خاں نصیر کے پہلے شعری مجموعے کا نام گلبانگ ہے جو یقیناً بانگ درا کے زیر اثر اس نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ میر گل خاں نصیر نے علامہ کے کلام کے تراجم بھی کیے اور تضمینیں بھی لکھی ہیں۔ فکری اثر کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے: (اردو ترجمہ کی صورت میں)

اگر تم صاحب ایمان و قرآن نہیں ہو
تو سب کچھ ہوسکتے ہو مگر مسلمان نہیں ہوسکتے۔

تمہاری مسلمانی اس وقت تک مکمل نہیں جب تک تم ہر طرح رسول اللہؐ کی پیروی نہیں کرو گے۔ اگر میں غلط کہتا ہوں تو بے شک گردن زدنی ہوں۔ جب تم فرنگ کے در پر سجدہ ریز ہو تو لالہ کی نگہبانی کے لائق کیسے ٹھہرائے جاسکتے ہو۔

مومن اور پھر کافر کی غلامی یہ ناممکن ہے تم نے اگر غلامی قبول کی تو مسلمانی کے اہل نہیں ہو۔

پیر محمد زبیرانی نے اپنے بلوچی اشعار میں فکر اقبال کو اپنایا ہے۔ ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

جس نے اپنی خودی پہچان لی
وہ دونوں جہانوں میں ممتاز ہوگیا۔
خودی سے موت کو شکست دی جاسکتی ہے۔
خودی کا چمن خزاں سے ناآشنا ہے۔

نوجوان شعرا میں عطا شاد نے بلوچی شاعری کو جدید رنگ اور آہنگ سے آشنا کیا۔ ان کی انفرادیت بلوچی اور اردو دونوں میں نمایاں ہے۔ عطا کی فکر میں جو بے خوفی اور کوہستانوں کی گونجتی آواز ہے اس میں اقبال کا فیض بھی شامل ہے جیسے:

Marfat.com

کوہساروں کی عطا رسم نہیں خاموشی
رات سو جائے تو بہتا ہوا چشمہ بولے

مرحوم آزاد جمالدینی کی بلوچی نظم کے اردو ترجمہ کو دیکھیے:

افسردہ شمع پھر سے درخشاں کریں گے ہم — ہر قلب، ہر نظر کو فروزاں کریں گے ہم
ہر کہنہ رسم جس سے ہے بیمار ذہنِ قوم — اس کو رہینِ آتش سوزاں کریں گے ہم

یہ عہد، یہ عزم اور لہجہ کی یہ توانائی اقبال کی یاد دلاتی ہے۔

سید ظہور شاہ ہاشمی مرحوم بلوچی کے مایہ ناز شاعر، ادیب اور نقاد تھے۔ ان کے کلام میں بھی اقبال کا اسلوب اور فکری اثر بالکل واضح ہے۔ دو شعروں کا ترجمہ یہ ہے: میں نے عالم مدہوشی میں سب کچھ پالیا۔ خوف دامن گیر ہے کہ دوبارہ ہوش میں نہ آؤں یہ رنج والم محبوب کا تحفہ ہے ہم بخوشی برداشت کریں گے بھلا مسرتوں پر بھی کوئی شکوہ کرسکتا ہے۔

علاوہ ازیں احمد زہیر، مراد ساحر، غوث صابر، بلوچی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر اور فنکار مرحوم محمد حسین عنقا، مرحوم کریم دشتی، ملک طوقی، صدیق آزاد، قاضی عبدالرحیم صابر، مولانا خیر محمد ندوی، احمد گل، غنی پرواز اور بشیر بیدار وغیرہ کسی نہ کسی طرح سے اقبال کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ بلوچی میں اقبال کے انداز میں بیشتر ترانے لکھے گئے ہیں۔ وطن دوستی، اسلامی اتحاد، اخوت و مساوات، خودی، مرد مومن، شاہین اور عقاب کے موضوعات پر کثرت سے نظمیں لکھی گئی ہیں۔

جناب غلام قاسم مجاہد نے ۱۹۹۶ء میں راقم الحروف کی نگرانی میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فل اقبالیات کے لیے بعنوان ”بلوچی ادب پر اقبال کے اثرات“ مقالہ تحریر کیا۔ اس میں انہوں نے اقبال کے اثرات، بلوچی ادب میں اقبال کے الفاظ و تراکیب کا استعمال، کلام اقبال کا منظوم بلوچی ترجمہ، مدحِ اقبال، کلام اقبال اور اقبالیاتی ادب کے منثور بلوچی تراجم، اقبال پر بلوچی کتب، اشعار اقبال کی تعبیہ کاری، کلام اقبال کی تطابق کاری، مکالمے پر اثرات، بلوچی صحافتی ادب پر اقبال کے اثرات، اقبالیاتی مواد کی مکرر اشاعت، اور جزوی بلوچی کتب میں ذکر اقبال کے ذیلی عنوانات پر مواد یکجا کیا جو قابل ذکر ہے۔ اس مقالے پر انعام بھی مل چکا ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل مقالات برائے ایم فل شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد بھی آئے ہیں۔

شاہد اقبال کامران، ” اقبال درسیات پاکستان میں“ نگران: ڈاکٹر محمد ریاض، ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی، ۱۹۹۰ء۔ اس میں بلوچستان کی درسی کتب کا جائزہ بھی شامل ہے۔ یہ

Marfat.com

۱۹۹۳ء میں بعنوان ''اقبالیات درسی کتب میں'' شائع ہوا۔

غلام یاسین، ''اقبال کی مستقبل شناسی'' نگران: ڈاکٹر محمد یوسف بخاری، کوئٹہ، ۱۹۹۵ء

اجمل صدیقی، ''اقبال اور زرعی معاشیات''، کوئٹہ، ۱۹۹۵ء

امین الحق، بلوچستان میں اقبالیات'' نگران: ڈاکٹر محمد انعام الحق کوثر، کوئٹہ، ۱۹۹۶ء

امان اللہ، ''خواجہ عبدالحمید عرفانی بحیثیت اقبال شناس'' نگران: ڈاکٹر محمد ریاض، ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی، ۱۹۹۵ء،

عبدالرؤف رفیقی، ''پشتو ادب پر اقبال کے اثرات'' نگران: ڈاکٹر محمد انعام الحق کوثر، پروفیسر عابد شاہ عابد، چمن (بلوچستان)، ۱۹۹۷ء

علاوہ ازیں تحقیقی کام برائے پی ایچ ڈی جاری:

عبدالرؤف رفیقی ''افغانستان میں اقبال شناسی'' زیر نگرانی، ڈاکٹر محمد انعام الحق کوثر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔

علامہ اقبال کے کلام کا اثر براہوئی ادب پر براہ راست پڑا ہے۔ براہوئی کی جدید شاعری میں وہی ندرتِ خیال، شکوہ الفاظ اور اسلوب واضح نظر آتا ہے۔ مثلاً علامہ محمد عمر دین پوری (التوفی ۱۹۴۸ء) علامہ اقبال کے ہمعصر تھے۔ انہوں نے براہوئی زبان میں پچاس کے لگ بھگ دینی کتابیں لکھی ہیں اور قرآن پاک کا پہلی مرتبہ براہوئی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے چند براہوئی اشعار کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔ ان اشعار میں اقبال کے فکر کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔

میں شاعر اور فلکار ہوں۔ اس لیے قلم اور زبان سے ہی آتش افشانی کرسکتا ہوں۔

مجھ میں قوتِ مشاہدہ ہے۔ میں قوم کا نباض ہوں۔ اس کے امراض کو جانتا ہوں اور ان کا علاج کرتا ہوں۔

مسلم قوم کے ماضی پر نظر دوڑاؤ، کیا اب یہ وہی قوم ہے؟ جو دنیا کو طرز تکلم سکھاتی تھی، گفتگو کے آداب بتاتی تھی؟

نور محمد پروانہ (سابق ایڈیٹر ہفت روزہ ''ایلم'' مستونگ) براہوئی کے کہنہ مشق صحافی، شاعر اور فلکار۔ ان کے چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

پیارے بھائیو! آگے بڑھو، مل بیٹھو، یہی وہ مبارک گھڑی ہے۔ اتحاد و اتفاق میں خیر و برکت ہے، قطرہ کی کوئی اہمیت نہیں مگر قطرہ قطرہ مل کر دریا بنتا ہے۔

اسلام اتحاد کا نام ہے۔اسی اتحاد کے طفیل اسلام عالمگیر نظریہ بن گیا۔ اسی اتحاد کے لیے ہر عزیز

Marfat.com

شے قربان کردو۔

پیر محمد زبیرانی نے علامہ اقبال کی کئی غزلوں اور نظموں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے اقبال کا فکری اثر قبول کیا ہے۔ جو ان کے براہوئی کلام سے ظاہر ہے۔ انہوں نے عشق، دل اور خودی کے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ جیسے عشق کیا ہے؟ (ترجمہ)

عشق اصلِ حیات، عشق خدا کا نام ہے
عشق دین و ایمان اور قرآن ہے
عشق یٰسین طٰہٰ اور اللہ الصمد ہے
عشق عرش و کرسی اور بیت ربی ہے
عشق ایک جست میں تمام منزلیں طے کرتا ہے
عشق معراج مصطفیٰ ہے، عشق اللہ کا قرب ہے

خودی کے بارے میں زبیرانی کے خیالات ملاحظہ ہوں:

خودی سے مردے بھی جلا پاتے ہیں۔
خودی کمزوروں کو قوت بخشتی ہے۔
جس قوم نے خودی پہچان لی وہ دنیا و آخرت کے عذاب سے نجات پا گئی۔
اٹھو! اس دنیا میں خودی کے پیغام کو پھیلا دو
تا کہ دنیا میں زندگی کی ایک نئی لہر اٹھے۔

زبیرانی نے دل کی حقیقت کو یوں پہچانا ہے:

اگر انسان دل کی حقیقت کو پا جائے
تو وہ دنیاوی وسائل پر قابو پالیتا ہے
اور فطرت کو تسخیر کرتا ہے
دل عقل و شعور سے زیادہ طاقتور ہے۔
دل اس حد تک رسائی حاصل کرتا ہے جہاں عقل بے بس ہوجاتی ہے۔ دل اگرچہ ایک نرم و نازک شے ہے۔
مگر اس میں وہ طاقت ہے کہ سنگِ خارا کو پگھلا دے
دل مہ و سال کی گردش اور زماں و مکاں کی قید سے ماورا ہے۔

اسحاق سوز براہوئی زبان کے نامور شاعر ہیں۔ براہوئی غزل گوئی میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ ان کی ایک نظم ''دل اور آسمان کا مکالمہ'' کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

دل آسمان سے گفتگو کے لیے محو پرواز ہے
اور گردشِ گردوں سے ہم کلام ہے۔
اور کہتا ہے اے فلکِ نیلگوں، انسان کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟
کیا وہ یہاں رنج و الم برداشت کرنے آیا ہے

Marfat.com

یا پھر عیش و عشرت اس کی زندگی کا مقصد ہے
انسان یہاں لیلیٰ بھی ہے اور خود مجنون بھی ہے
بھلا وہ کس حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہے
آسمان سے صدا آئی بس بند کر زبان
یہ سوچنے اور سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں
عقل کا بندہ نہ بن، بس عشق میں خاموشی اختیار کر
ہوشیاری اور بے ہوشی کے مابین ایک حد فاصل مقرر ہے
ان حقائق کو پانا آسان نہیں

اسحاق سوز کے ان اشعار سے اقبال کے فکر کی غمازی ہوتی ہے۔ عشق اور عقل کی حدوں کا تعین ہوتا ہے۔ جس مقام پر عقل کی راہیں مسدود ہوجاتی ہیں وہیں سے عشق کی منزل شروع ہوجاتی ہے۔ سوز شاعر سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں:

اے شاعر شیریں بیاں اپنے ماحول کا مشاہدہ کر
تو اسرار حق کا ناطق ہے اور قوم کا ترجمان ہے
زمانے کی رفتار کو بھی دیکھ اور اپنی قوم کی حالت پر بھی نظر ڈال
تو قوم کی چشم بینا ہے، تو قوم کی حالت پر نظر ڈال
تو قوم کی چشم بینا ہے، تو قوم کے لیے مشعل راہ ہے
تو شعر وسخن سے قوم کی رہنمائی کر

میر عبدالرحمٰن کرد براہوئی زبان کے بلند پایہ شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کے شعروں میں رومانی، حرکت اور عمل ہے۔ وہ نوجوانوں کو مخاطب کرکے وطن کی خوشحالی کے لیے آگے بڑھنے کا درس دیتے ہیں:

آج ہم اس جوش و جذبے سے سرشار ہیں۔ جھلسانے والی گرمی ہو یا شدید برف و باران ہو۔ سُن کردینے والی ہوائیں چل رہی ہوں یا مصائب و آلام کے پہاڑ سر کرنے ہوں، ہم بلاخوف و خطر ہر مصیبت کا مقابلہ کریں گے۔
کیونکہ ہمارا وطن محنت شاقہ کا طلب گار ہے۔
اس لیے وطن کی تعمیر و ترقی کے لیے ہمیں جدوجہد کرنی ہے۔

یہ شکوہِ الفاظ، یہ بلندیِ خیال اور عمل پیہم کا درس اقبال کا ہے۔

ادیب و شاعر قمبرانی کی ایک آزاد براہوئی نظم مرد قلندر کا ترجمہ پیش قارئین ہے:

ایک مرد قلندر آیا۔ اس نے للکارا
خودی کا پیغام دیا
اور کہا جس نے اپنی خودی پہچان لی

Marfat.com

وہی مومنِ کامل بن جاتا ہے
اقبال کے اس پیغام کی گونج
کوہ و دشت، صحراؤں اور بیابانوں میں پھیل گئی
اس نے زندگی کے اسرار بتا دیے اور کہا
موت کی آنکھوں میں جس نے آنکھیں ڈالیں
درحقیقت وہی زندہ کہلانے کا مستحق ہے
زندگی دراصل شیر کی ہے چاہے وہ ایک لمحے کی ہی کیوں نہ ہو
وہ ایک لمحہ لومڑی کی ہزار سالہ زندگی پر بھاری ہے
بھیڑ اور کبوتر کی زندگی قبول مت کرو
اگر بھیڑ کی طرح بے بس بنو گے تو بھیڑیوں کا شکار ہو جاؤ گے
اگر کبوتر بن کر زندگی بسر کرو گے تو شاہین کے لیے لقمۂ تر بن جاؤ گے
تنکا مت بنو کہ تمہیں ہوائیں ہر طرف لے اڑیں
پہاڑ کی طرح مضبوط رہو
شیر بنو، شہباز بنو۔
اور یہی دراصل زندگی ہے

علامہ اقبال کے افکار اور ان کا مکمل کلام تراجم کے ذریعے پشتونوں تک پہنچ چکا ہے اور پھر خود علامہ صاحب کو پشتونوں سے جو لگاؤ تھا وہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ اس سلسلے میں محراب گل افغان کے افکار، جمال الدین افغانی، نادر شاہ، خوشحال خان کی وصیت اور علامہ صاحب کی یہ مشہور نظم، ''اپنی خودی پہچان او غافل افغان''، پیش کی جاسکتی ہیں۔

پشتو ادب پر علامہ اقبال کے جو نمایاں اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کا اندازہ ہم موجودہ صدی کی پشتو شاعری اور ادب سے کر سکتے ہیں۔ بلوچستان کے پشتو گو شعرا اور ادبا بھی متاثر ہوئے ہیں۔ جیسے سلطان محمد صابر (پشتو ادب کا جانا پہچانا نام) نے پیر رومی اور مرید ہندی کے اثر کے تحت ایک نظم ''عالم بالا میں'' تحریر کی ہے۔ جو جمال الدین افغانی اور ڈاکٹر عبدلرحمان محمودی کے مابین ایک مکالمہ ہے۔

سید گوہر نے علامہ اقبال کی کئی نظموں کا پشتو میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ فکر اقبال سے بھی اثر پذیر ہوئے ہیں۔ اردو اور پشتو کے نامور شاعر اور ادیب سید عابد شاہ عابد بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔ وہ اقبال کے حضور گویا ہوتے ہیں:

تجھ کو دیکھا تو خود کو بھول گیا　　کس مصور کا شاہکار ہے تو
حسن تخلیق لازوال سہی　　ہر بلندی سے ہمکنار ہے تو

Marfat.com

فلسفہ ہے رموز انسانی جس طرح روشنی چراغوں میں
فلسفہ آرزوئے جہد جمال مے چھلکتی ہوئی ایاغوں میں

یہ مغنی ہے کائنات جمال
ساری دنیا جسے کہے اقبال

اردو اور پشتو کے معروف قلمکار فضل احمد غازی نے ایک پمفلٹ بعنوان اقبال اور پشتون، (۱۶ صفحات) چھپوایا تھا۔ وہ اپنے مضمون ''عظیم اقبال ثقافتی نظریہ''(۲۴) میں لکھتے ہیں:

علامہ اقبال کے مطالعے سے انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ہم سب اسلام کے وسیع دامن میں پروان چڑھے ہیں جس کی حیثیت رنگا رنگ ثقافتوں کے سرچشمے کی ہے۔ اقبال نے شعری ثقافت کے ناتے عظیم الشان اسلامی تحریک کو اس قدر زبردست قوت عطا کی ہے کہ ہم اپنے سے کئی گنا دو بڑی طاقتوں سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور یہ اقبال کا کارنامہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں میں وہ شعور، قوت، عظمت اور جلال پیدا ہوا جس کے سامنے اکثریت مغلوب ہو کر رہ گئی۔

زیرنظر موضوع سے متعلق مزید کتب کے کوائف یہ ہیں:

ایم صلاح الدین مینگل، ''اقبال اوورناک'' (اقبال اور نوجوان) (براہوئی) کوئٹہ، ۱۹۹۵ء

سورن براہوئی، '' اقبال ءُ اسلام'' (اقبال اور اسلام) (براہوئی) کوئٹہ، ۱۹۹۹ء

ڈاکٹر انعام الحق کوثر، تحریک پاکستان، علامہ اقبال اور قائداعظم، کوئٹہ، ۲۰۰۲ء

زلزلۂ عظیم (۳۱ مئی ۱۹۳۵ء) میں زندگی کے سارے نظام کے تہ و بالا ہوجانے کے بعد جب دوبارہ وادی شال میں آثار حیات پیدا ہوئے تو ادبی زندگی بھی ازسرنو زیادہ رونق کے ساتھ نمودار ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں موسم بہار کے اوائل میں 'یوم اقبال' (۲۵) منایا گیا۔ جو پوری طرح کامیاب رہا۔

جنوری ۱۹۴۱ء میں کوئٹہ میں ''بزم اقبال'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو اقبال کی یادگار کو بلوچستان میں قائم کرنا، دوسرے اردو زبان کی نشر و اشاعت اور اردو ادب کو فروغ دینا۔ اس کے صدر اس خطے کے مشہور وکیل ملک کرم الٰہی اور جنرل سیکرٹری ڈاکٹر غلام نبی تھے۔ اس بزم کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں جن صاحبان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیاان میں شامل تھے یعقوب توفیق، بشیر احمد فاروق، وزیر زادہ عبدالاحد خان، صادق شاذ، ارشد امروہوی، مرزا طالب شیرازی، غلام محمد جمیل، خواجہ عبدالمجید عرفانی، محشر رسول نگری، راجپال صحرائی، سید اکبر حسین رضوی، الطاف گوہر، راجہ عبداللطیف کلیم، سید اعجاز حسین رضوی،

Marfat.com

عیش فیروز پوری، مذاق العیشی، غلام حسین سیماب، بشیر احمد صمصام، ملک عبدالرب نسیم، راجہ احمد خان، آغا صادق، مولانا عبدالکریم، مرزا فیض اللہ، میاں نصیر الدین احمد، عبیداللہ خان، محمد نواز خان وکیل، دیوان سنگھ، خان صاحب شیر زمان خان، حسن نذیر، نذیر احمد شیخ، محمد عیسیٰ، عبدالرشید، ماسٹر محمد اسماعیل، محمد یوسف، مسٹر محمد اسماعیل، سردار چانن سنگھ، قاضی حفیظ الدین، بشیر احمد ہاشمی، وغیرہ۔ قیام پاکستان تک بزم ادب کوئٹہ اور بزم اقبال کوئٹہ کے جلسوں میں باہر سے مختلف ذی علم شخصیتیں بھی حصہ لیتی رہیں۔ ان میں خاص طور پر سر شیخ عبدالقادر، مولانا عبدالمجید سالک، وقار انبالوی، نشتر جالندھری، حاجی لق لق، احسان دانش، مولانا نصر اللہ خان عزیز، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا ثناء اللہ خان، مولانا غلام فرید، ڈاکٹر شجاع ناموس، شہزاد فضل داد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۱۹۴۷ء کے آخر میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں، بزم اقبال، کا افتتاح ہوا۔ اس کی روح رواں پروفیسر خواجہ عبدالحمید عرفانی تھے۔ (آپ نے ۱۹۵۶ء میں ''شرح احوال و آثار ملک الشعرا بہار'' پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کی تاریخ میں فارسی زبان میں انہوں نے پہلا تحقیقی مقالہ لکھا۔) ان کا ذکر پہلے بھی اس مقالہ میں آیا ہے۔ ان کے ایران جانے کے بعد پہلے پروفیسر آغا صادق اکیلے اس چمن کی آبیاری فرماتے رہے۔ پھر دو سال (۱۹۵۸ء، ۱۹۵۹ء) تک اس کی سرگرمیوں کی نگرانی ایک کمیٹی کرتی رہی۔ جس میں آغا صادق، سعید احمد رفیق، رشید احمد اور راقم الحروف شامل تھے۔ پروفیسر آغا صادق کے تبدیل ہونے پر ۱۹۵۹ء سے مارچ ۱۹۷۰ء تک بزم اقبال راقم الحروف کے زیر نگرانی علامہ اقبال کی تعلیمات سے طلبہ کو آگاہ کرتی رہی۔ جلسوں کے علاوہ علامہ اقبال سے متعلق مختلف انداز کے عنوانات پر مضامین کے مقابلے بھی کرائے جاتے تھے اور باقاعدہ انعامات کا بندوبست ہوتا تھا۔ پبلک جلسوں کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔

اس بزم کی کارگزاریوں میں پروفیسر ش۔ ضحیٰ، پروفیسر انور رومان، پروفیسر خلیل صدیقی، جناب عبدالصمد درانی، مولانا عبدالکریم، چودھری عطا محمد، پروفیسر کرار حسین، سردار نقوی، ڈاکٹر اسلم قریشی، ڈاکٹر اکبر حسین قریشی، ظہیر الحق (۲۶) ساقی الحسینی، صفدر حسین صفدر، پروفیسر محمد مسعود احمد، اور پرنسپل اکرم انصاری وغیرہ بھی حصہ لیتے رہے۔ متعدد طلبہ و طالبات اس بزم کے سرگرم رکن رہے جس کی تفصیل علامہ اقبال اور بلوچستان میں موجود ہے۔

راقم الحروف مارچ ۱۹۷۰ء میں کوئٹہ سے تبدیل ہو کر مستونگ چلا گیا۔ جون ۱۹۷۲ء تک وہاں اقبالیات کے سلسلے میں علمی و ادبی کام جاری رہا۔ میرے معاونین میں سعید خالد،

Marfat.com

سید اعجاز حسین، حیات علی، محمد حنیف، نادر خاں، شیخ خوش محمد اور سلطان الطاف علی وغیرہ شامل تھے۔ بندہ نے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۹ء تک گورنمنٹ ڈگری کالج لورالائی میں اس علمی، قومی اور ملی فریضہ کو سرانجام دیا اور باقاعدگی سے علامہ اقبال کے بارے میں مجالس کا انتظام کرایا۔ میرے معاونین میں خورشید افروز، محمد حنیف، سید بادشاہ، حمید اللہ، رشید انجم، سید حسین احمد، خدمت خاں، محمد رمضان عامر، تابش نگینوی، قاضی ضمیر عالم، چودھری منظور احمد، وکیل شیخ غلام صابر، اور ڈاکٹر نصیر الدین جوگیزئی وغیرہ شامل تھے۔ ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰ء میں بندہ گورنمنٹ ڈگری کالج سبی میں رہا۔ وہاں بھی یہ علمی سرگرمیاں جاری رہیں۔ میرے ساتھیوں میں مجیب الرحمٰن یوسفی، معین الدین، خالد علی حسنی اور ڈاکٹر بشیر وغیرہ شامل تھے۔ ۱۹۸۰ء میں دوبارہ کوئٹہ آگیا۔ بفضل ربی اس وقت سے لے کر اب تک کوئٹہ کے علاوہ سارے صوبے میں علمی وادبی سرگرمیوں کی سرپرستی کا موقع مل رہا ہے۔

۱۹۴۱ء میں جو بزم اقبال، کوئٹہ شہر میں قائم ہوئی تھی اور تقسیم ملک سے پہلے تک برسرکار رہی، اس کا احیا ۱۹۵۶ء میں ہوا۔ سرپرستوں میں کمشنر معزالدین احمد اور ڈائریکٹر محکمہ تعلیم سی۔ ایم صادق تھے۔ صدر آقای افراسیاب نوائی، نائب صدور صادق شاذ اور آغا صادق، جنرل سیکرٹری اے۔ ایچ دلشاد، جوائنٹ سیکرٹری انعام الحق کوثر، خازن عبدالعزیز ملک اور سیکرٹری نشرو اشاعت یعقوب توفیق تھے۔ (جو بعد میں کراچی چلے گئے اور وہاں اقبال کونسل کے اعزازی سیکرٹری رہے اور یادگار ہفتہ اقبال ۲۱ اپریل تا ۷ اپریل ۱۹۶۸ء کی روداد مرتب کرکے شائع کرائی)۔ تین سال تک یہ بزم باقاعدگی سے یوم اقبال کا وسیع پیمانے پر انتظام کرتی رہی۔ اس کے ارکان چھوٹے پیمانے پر بھی نشستوں کا بندوبست کرتے تھے۔ وادی شال کی بعض دوسری ادبی انجمنوں جیسے حلقہ ارباب ذوق کوئٹہ، بزم ثقافت کوئٹہ (قائم شدہ ۳۰ مارچ ۱۹۶۱ء)، رائٹرز گلڈ کوئٹہ برانچ، اقبال یوتھ کونسل کوئٹہ، خانہ فرہنگ ایران کوئٹہ، انجمن دبستان بولان کوئٹہ، ادارہ نصابیات و مرکز توسیع تعلیم بلوچستان کوئٹہ (۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۱ء)، انجمن فارسی بلوچستان کوئٹہ (۱۹۹۲ء سے)، قلم قبیلہ ادبی ٹرسٹ کوئٹہ (۱۹۷۹ء سے)، سیرت اکادمی بلوچستان رجسٹرڈ کوئٹہ (۱۹۹۳ء سے)، اور بلوچستان بھر کے تعلیمی اداروں اور اکادمی ادبیات کی بلوچستان شاخ، پاکستان چلڈرنز اکیڈمی کوئٹہ (۱۹۷۶ء سے)، اور عمل فاؤنڈیشن کوئٹہ کے تحت بھی یوم اقبال منانے کا خاطر خواہ اہتمام ہوتا رہا ہے اور بعض کی زیر نگرانی اب بھی ہو رہا ہے۔

وفاقی حکومت نے بلوچستان میں مختلف مقامات پر نیشنل سنٹر اور بارڈر پبلسٹی آرگنائزیشن کے مراکز قائم کیے تھے۔ ان میں بھی علامہ اقبال کے بارے میں تقاریب کا

Marfat.com

بندوبست ہوتا رہتا تھا۔

ریڈیو اسٹیشن کوئٹہ (قیام ۱۹۵۶ء)، تربت اور خضدار سے علامہ اقبال سے متعلق مختلف زبانوں میں بیشمار تقریریں اور فیچر نشر ہوئے ہیں۔ بلوچستان بھر کے کالجوں کے جریدوں میں علامہ اقبال سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی تفصیل اقبال شناسی اور بلوچستان کے کالج میگزین (جلد اول، دوم از راقم الحروف) میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اولس (پشتو) کوئٹہ (اجرا کا زمانہ ستمبر ۱۹۶۱ء) اور اولس (بلوچی) کوئٹہ (اجرا کا زمانہ دسمبر ۱۹۶۱ء) اور احوال (براہوئی) خضدار میں بھی علامہ اقبال کے بارے میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ جس کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہوگی۔

بلوچستان بھر کے اخبارات (کم و بیش) اور رسائل علامہ اقبال کی یوم پیدائش اور یوم وفات پر خصوصی نمبر شائع کرتے ہیں۔

بلوچستان میں علامہ اقبال کے افکار کے بارے میں متعدد لکھنے والوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بعض یہ ہیں۔ امداد نظامی، خدائے رحیم بیتاب، خورشید احمد، ریاض قمر، مسز سلطانہ یاسمین نظامی، مسز آفتاب مسرور عالم خان، نور محمد ہمدم، فضل حق میر، اجمل صدیقی، ڈاکٹر فاروق احمد، شرافت عباس، عابد رضوی، مسز طاہرہ بلقیس، مسز نگہت عاطف، مسز فریدہ ستار، فرزانہ آغا، افشاں خانم، ذکیہ نذیر پروین، ابراہیم، جاویریہ عبدالحق، ڈاکٹر سلطان الطاف علی، محمد صدیق، نجم واحد، علی کمیل قزلباش، عرفان الحق صائم، عرفان بیگ، اوریا مقبول جان، طاہر محمد خان، امتیاز حسین، حمیرا سدوزئی، منصور الہدیٰ عباسی، عالی سیدی، شمیم کوثر، مسز ثمینہ عامر، صائمہ رفیق، مسز امینہ زہرہ، اور عصمت جمال وغیرہ۔

سبّی سے وادی شال (کوئٹہ کا قدیم نام) کی طرف سفر کرتے ہوئے ایک خیال انسان کے ذہن میں ابھرتا ہے کہ بلوچستان خوابوں کی سرزمین ہے۔ لمبی لمبی سرنگیں، مٹیالے رنگ کے پہاڑ جن کی تہیں ایک دوسرے پر جمی ہوئی ہیں اور ایک سیاہ پتھریلی تہہ ایک پٹی کی طرح ان تمام تہوں کو آپس میں باندھے ہوئے ہے۔ جیسے یہ پہاڑ کبھی ایک قلعہ تھا، چار چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر چھت ڈال کر بلوچوں کے بنائے ہوئے مکان اور دور پگڈنڈی پر کسی پہاڑی جھرنے سے مٹکا بھرتی ہوئی بلوچ لڑکی، دور جھرنے کے کنارے اترا ہوا کارواں اور پہاڑ کی تلہٹی میں ننھے منے مکان، چھوٹی سی سفید مسجد اور ہلتے جلتے سائے، ندی کے خشک پاٹ پر چمکتی ہوئی ریت، پل سے گذرتی ہوئی گاڑی اور پل کے نیچے خشک ندی میں بلوچ ساربان اونٹ پر بیٹھا ہوا حُدی خوان ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ کی تلہٹی کو جارہا ہے یہ!!

Marfat.com

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مرد کہستانی!

ان پہاڑوں کو دیکھ کر علامہ اقبال ایک بار پھر یاد آتے ہیں جو ہماری روحوں کو جھنجھوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں:

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے
تنے محکم تر از سنگین حصارے
درونِ او دلِ دردِ آشنائے
چو جوئے در کنارِ کوہسارے

ان ہی لمحات میں علامہ اقبال بوڑھے بلوچ سے اپنے لخت جگر کو کہلوا رہے ہیں کہ اس جہانِ تگ و تاز میں غیرت بڑی چیز ہے جو درویش کو تاج سردارا کا اہل قرار دیتی ہے۔ انسان سعی پیہم سے ناممکن کو ممکن میں تبدیل کرسکتا ہے۔ اسی لیے افراد کے ہاتھوں میں اقوام کی تقدیر پوشیدہ ہے اور قوم کیا ہے؟ افراد کا مجموعہ۔ غیرت کے باعث ہی ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ بنتا ہے۔ فرد جبھی کچھ حاصل کرسکتا ہے جب زندگی کے سمندر میں حوادث سے کھیلنا سیکھے اور مسلمان کے لیے دین لازم و ملزوم ہے۔ اگر وہ اسے چھوڑ کر بامِ عروج پر پہنچے تو سمجھے کہ اسے خسارہ ہی خسارہ ہے۔ اگر وہ سچا مسلمان بن جائے تو فائدہ ہی فائدہ ہے اور مومن کی فراست تمام دکھوں کا مداوا ہے اور یہ کہ سب کچھ اسے اسی وقت حاصل ہوگا جب وہ اللہ پر پورا بھروسہ رکھ کر عمل، عمل اور سراپا عمل بن جائے گا۔ علامہ کی آواز آرہی ہے:

اخلاص عمل مانگ نیاکانِ کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

اہل بلوچستان سیماب فطرت، خطر پسند اور جہاں گرد واقع ہوئے ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں:

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کر ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

بلوچستان کے لق و دق صحراؤں اور بیابانوں سے گذریے، ہواؤں اور فضاؤں کو سونگھیے۔ خودی کی تربیت ہوتی نظر آئے گی۔ اقبال ہماری روح سے پکار اٹھے گا:

Marfat.com

اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی!
خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز!

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری　　جوانمرد کی ضربتِ غازیانہ
اے باد بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو　　خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی

چلتے چلتے اور گذرتے گذرتے ایک مقام آجائے گا جہاں روشنی کا دیا یا تو کسی مرد قلندر کا مزار ہوگا:

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو　　کہ خورشید قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

یا پھر نزد و دور سے بہتی ہوئی ندی:

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی!　　اٹکتی لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی　　بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ!　　پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ!

ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پلا کر زندگی کا وہ پیام دیتی ہے جس سے ضمیر حیات روشن ہو، مستی کائنات حاصل ہو، سوز و ساز ازل نصیب ہو اور راز ازل واشگاف ہوجائے اور اقبال کے الفاظ میں یہ دعا مانگے بغیر آگے روانہ ہونا مشکل ہو:

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

بلوچستان کے کسی دور افتادہ ہائی اسکول تک جایئے وہاں دیواروں پر علامہ اقبال کے اشعار خوبصورت انداز میں لکھے ہوئے نظر آئیں گے جو دل کے تاروں کو چھیڑ کر عمل پر ابھارتے ہیں۔

ایک بار بلوچستان بھر کے تعلیمی اداروں میں یہ سروے کیا گیا تھا کہ طلبا کس شاعر کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں تو بھاری اکثریت کا جواب تھا: ''اقبال''

اس مختصر جائزے سے اس امر کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے کہ سرزمین بلوچستان میں وطن عزیز پاکستان کے قومی اور مسلمانان عالم کے ملی شاعر حکیم الامت علامہ اقبال کے افکار کی شرح وبسط کے لیے اچھا خاصا کام ہوا ہے اور بفضل ایزدی ہو رہا ہے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

Marfat.com

حوالہ جات

۱۔ ''قائداعظم اور بلوچستان''، ماہ نو، اسلام آباد، نومبر دسمبر ۱۹۷۶ء، ص ۲۳۵

۲۔ خواجہ عبدالحمید عرفانی، اقبال ایرانیوں کی نظر میں، کراچی، ۱۹۵۷ء؛ ڈاکٹر انعام الحق کوثر، علامہ اقبال اور بلوچستان، اسلام آباد، تعارف، ۱۹۸۶ء ص ۱۱۶

۳۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالمجید عرفانی، اقبالِ ایران، سیالکوٹ، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱، ۱۲

۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: ڈاکٹر انعام الحق کوثر، بلوچستان میں فارسی شاعری، کوئٹہ، ۱۹۶۸ء ڈاکٹر انعام الحق کوثر، شعر فارسی در بلوچستان، لاہور، ۱۹۷۵ء

۵۔ پیر غلام دستگیر القادری ناشاد کے مجموعہ کلام پیر مغان پر تبصرہ، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی، پیش لفظ ڈاکٹر انعام الحق کوثر، کوئٹہ، ۱۹۸۴ء ص ۳

۶۔ علامہ اقبال اور بلوچستان، خواجہ عبدالحمید عرفانی بحیثیت اقبال شناس، ایم فل اقبالیات، امان اللہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۲۶۸

۷۔ نصرت، کراچی، (عزیز مگسی نمبر)، ۵ جون ۱۹۵۷ء

۸۔ بشکریہ عزیز محترم عزت عزیز کرد خلف الرشید میر عبدالعزیز کرد مستونگ

۹۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر (مرتب)، مکاتیب یوسف عزیز مگسی، لاہور، ۱۹۷۸ء

۱۰۔ پروفیسر انور رومان، ''یوسف عزیز مگسی''، سالنامۂ بولان، کوئٹہ، ۱۹۵۵ء، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، ''بلوچستان کا پہلا مرد قلندر''، میزان، کوئٹہ، ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۶ء

۱۱۔ ینگ بلوچستان، کراچی، ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۴ء

۱۲۔ ''بلوچستان میں اردو پر تبصرہ،'' مشرق، لاہور، ۲۲ مارچ ۱۹۷۰ء

۱۳۔ ہفتہ وار تنظیم، کوئٹہ، ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء، نظام، کراچی، ۲۰ مارچ ۱۹۴۷ء زمیندار، لاہور، ۲۲ اپریل ۱۹۳۴ء؛ نوکیں دور، کوئٹہ، ۸ جون ۱۹۶۵ء

۱۴۔ علامہ اقبال اور بلوچستان، ص ۲۹، ۳۰، ۲۰۵۔۲۰۰

۱۵۔ صحافت وادی بولان میں، کوئٹہ، ۱۹۷۸ء، ص ۴۹

۱۶۔ سید سلیمان ندوی، سیر افغانستان، حیدرآباد دکن، پیش لفظ، ص ۱۸۰۔۱۷۸ جاوید اقبال، زندہ رود (جلد سوم)، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۵۲۷، ۵۲۸

۱۷۔ سیر افغانستان، ص ۱۸۴۔۱۸۱، ۲۰۲، ۲۰۳

۱۸۔ صحیفہ، لاہور، اقبال نمبر (حصہ اول) قاضی افضل حق قرشی، ''نادراتِ اقبال،'' اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۲۲۱ تا ۲۲۸ جعفر بلوچ، مجالس اقبال، لاہور، ۲۰۰۲ء، میر عبدالعزیز کرد، ص ۲۳۵ تا ۲۴۳

۱۹۔ بلوچی دنیا، ملتان، فروری ۱۹۶۹ء، ص ۲۸۔۲۵

☆☆☆

Marfat.com

اقبال کا تصورِ حریت و ارتقا

پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان ☆

اقبال کے نزدیک آزادی انسان کو خدا کی طرف سے ملنے والی وہ نعمت اور اعتماد ہے جس کی بدولت انسان کو خودی کی حامل مخصوص شخصیت رکھنے والی ہستی کا شرف حاصل ہوا؛ ایک ایسی ہستی جو اپنے اعمال و افعال میں اور خوب و زشت کے انتخاب میں آزاد اور اپنے عمل کی ذمہ دار ہو۔ شخصیت کا تصور حریت کے بغیر اور حریت کا تصور اعمال کی مکمل ذمہ داری کے بغیر نامکمل ہے۔ انسان کائنات میں وہ واحد ہستی ہے جسے خدا نے شخصیت کی نعمتِ عظمیٰ کے ساتھ سرفراز کیا۔ حریت عمل کے ساتھ شخصیت انسان کو ملنے والی ایک ایسی امانت ہے جسے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔(۱) تاہم انسان حریت و آزادی کی محبت میں، عمل کی ذمہ داری کے بوجھ کو قبول کرتے ہوئے ایک بھرپور شخصیت کے روپ میں نظامِ عالم میں جلوہ افروز ہوا۔ چنانچہ اقبال انسانی شخصیت اور خودی کے ارتقا میں حریت و آزادی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک انسان کی پوشیدہ صلاحیتیں حریت و آزادی کے ماحول میں ہی نشوونما پاسکتی ہیں۔ آزادی، ٹھہراؤ اور جمود کی دشمن اور تخلیق و ارتقا کی نقیب ہے۔ تقلید سے قوائے عملیہ پر جمود طاری ہوجاتا ہے جبکہ حریت و آزادی کی بخشی ہوئی قوت عمل کی بدولت اشہبِ دوراں سرپٹ دوڑتا ہے اور ترقی و ارتقا کی نئی سے نئی صورتیں جنم لیتی ہیں۔ آزادی کے ماحول میں اٹھنے والا ہر قدم انسان کو عمل و تجربہ کی نئی دنیا میں لے جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس پر فکر و شعور کی نئی جہتیں وا ہوجاتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ سعی و عمل کے نتیجے میں ہر نیا تجربہ خوشگوار نتائج کا حامل ہو تاہم تجربے کے ناخوشگوار ہونے کا احساس و شعور بھی ناخوشگوار تجربے کا وہ مثبت اور خوشگوار پہلو ہے جو اصلاح احوال (Miliorism)(۲) کی سمت سعی و عمل کا رخ موڑ دیتا ہے۔ اسی لیے اقبال کہتے ہیں: صد لطف سعیِ بے حاصل میں ہے۔(۳) انسان کی راز جو فطرت کے لیے حیات کے خوب تر پیکر کی

☆ شعبہ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ

Marfat.com

تلاش اور یافت کا امکان صرف اور صرف آزادیِ عمل میں پوشیدہ ہے۔ اگرچہ آزادیِ عمل کا راستہ ہرگام پُرخطر اور جاں گسل ہے تاہم اقبال کے نزدیک فطرتِ ہستی کی گرسنگیِ عمل ظاہری نفع ونقصان کے معیاروں کو خاطر میں نہیں لاتی کیونکہ:

Man is the Trustee of a free personality which he accepted at his peril.(4)

نہیں ہے جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں، میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں(۵)

چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگران رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارِ نادر آید
گناہے هم اگر باشد ثواب است(۶)

تقلید اور غلامانہ روش اپنی صلاحیتوں پر بے اعتمادی، فکری جمود اور تعطل کی علامات ہیں، جبکہ حریتِ فکر اور عملی آزادہ روی تگاپوئے ناتمام کا ایک ایسا بیکراں تسلسل ہے جو مستقبل کے امکانات کو ہر لحظہ تسخیر کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ تقلید اور غلامانہ روش ٹھہراؤ کو ظاہر کرتی ہے اور اس طرح افسردگی، بیچارگی اور شکستگی اس کا مقدر بن جاتی ہے:

ذوقِ ایجادِ نمود از دل رود
آدمی از خویشتن غافل رود(۷)
کیشِ او تقلید و کارش آزری است
ندرت اندر مذہب او کافری است(۸)
بر زبانش گفتگوہا مستعار
در دلِ او آرزوہا مستعار(۹)

مردِ حر وہ ہے جو نقد ونظر کے نئے معیار اور فکر وعمل کی نئی جہتیں اور راہیں متعین کرتا ہے:

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات!

Marfat.com

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات!
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات!
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات!(۱۰)

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا(۱۱)

اقبال کے تصور کی ترجمانی کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سلیم چشتی رقمطراز ہیں:

جب انسان کسی انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے تو دائرہ انسانیت (آدمیت) سے خارج ہوجاتا ہے اور حیوانات کے گروہ میں داخل ہوجاتا ہے، بلکہ ان سے بھی گیا گزرا ہوجاتا ہے کیونکہ حیوانات میں عقل نہیں ہے اور انسان اس نعمت سے بہرہ ور ہے۔(۱۲)

آدم از بے بصری بندگیِ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است(۱۳)
من نہ دیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد(۱۴)

تقلید اور محکومی سے فہم و فراست ختم ہوجاتی ہے۔ غلاموں کی بصیرت پر کوئی اعتماد نہیں کرتا جبکہ مردانِ حر زمان کے خارجی انتداب سے آزاد اپنی چشمِ بصیرت کی بدولت مستقبل میں پیش آنے والے حالات کا احساس و ادراک کرنے کے ساتھ ساتھ زمانے کی آغوش سے نئے جہان تخلیق کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں:

صد جہان مثلِ جہانِ جزو و کُل
روید از کشتِ خیال او چو گُل(۱۵)

اقبال لکھتے ہیں: Directive force in the ego's activity clearly shows that the ego is a free personal causuality.(۱۶)

اقبال کے نزدیک تحرک خودی کی باطنی طاقت اس کے آزاد شخصی معیار کی نشاندہی

Marfat.com

کرتی ہے۔ آزادی کے ماحول میں انجام پانے والا ہر عمل بیدار مغزی اور فکر و فراست کی تخلیقی قوت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام عقل و شعور کو متاعِ بے بہا ہی قرار نہیں دیتا بلکہ اسے خودی کے استحکام، پختگی اور ارتقا کے لیے ناگزیر بھی سمجھتا ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

> Indeed Islam recognizes a very important fact of human pyschology, i.e., the rise and fall of the power to act freely and is anxious to retain the power to act freely as a constant and undiminished factor in the life of the ego. (۱۷)

اس ضمن میں ڈاکٹر جمیلہ خاتون رقمطراز ہیں:

> In the act of deliberation, the element of insight is fully manifested. It guides the ego to make a data out of ■ complex whole in view of the present purpose or goal.(۱۸)

اقبال مردانِ حُر کی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: Every act of a free ego creates a new situation and thus offers further opportunities of creative unfolding. (۱۹)

اگر آگاہی از کیف و کمِ خویش
بِہ تعمیر کن از شبنمِ خویش
دلا دریوزۂ مہتاب تا کے!
شب خود را بر افروز از دمِ خویش(۲۰)

رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو
موجِ آب از چشمۂ خاور مجو
ماہ را روزی رسد از خوانِ مہر
داغ بر دل دارد از احسانِ مہر
زیرِ گردون آن جوان ارجمند
میرود مثلِ صنوبر سربلند(۲۱)

تا کجا در تہ بال دگراں می باشی
در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز(۲۲)

Marfat.com

اپنی شبنم سے سمندر تعمیر کرنے کا خیال، دوسروں سے روشنی طلب کرنے کے بجائے خود روشن ہونے کا پیغام، دوسروں پر انحصار کرنے کے بجائے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد اور اپنی فطری آزادی کو مجروح نہ ہونے دینے کا مشورہ، دراصل ارتقا حاصل کرنے کا مشورہ ہے:

سحر در شاخسارے بوستانے
چہ خوش می گفت مرغِ نغمہ خوانے
بر آور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے، نالہٗ، آہے، فغانے(۲۳)

انسان کی خوبی یہ ہے کہ وہ تازہ اور نئی سے نئی واردات کو پسند کرتا ہے۔ نئی بستیاں بسانا، اپنی دنیا آپ پیدا کرنا، ہر لحظہ نئی وادیِ سینا کے سفر کا شوق اس کی جدت پسند اور تازہ کار طبیعت کا تقاضا ہے اور یہی چیز ارتقا کا باعث ہے:

خنک انسان کہ جانش بیقرار است
سوارِ راہوارِ روزگار است
قبائے زندگی بر قامتش راست
کہ او نو آفرین و تازہ کار است(۲۴)

اقبال اسرار خودی میں لکھتے ہیں:

نکتہ می گویمت روشن چو در
تا شناسی امتیازِ عبد و حُر
عبد را تحصیلِ حاصل فطرت است
وارداتِ جانِ او بے ندرت است
دمبدم نو آفرینی کارِ حُر
نغمہ پیہم تازہ ریزد تارِ حُر
فطرتش زحمت کشِ تکرار نیست
جادۂ او حلقۂ پرکار نیست
عبد را ایام زنجیر است و بس
بر لبِ او حرفِ تقدیر است و بس

Marfat.com

ہمتِ حُر با قضا گردد مشیر
حادثات از دست او صورت پذیر(۲۵)

یہاں تک کہ اقبال حریت عمل کا معیار متعین کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں:

نقش دگر طراز دہ، آدمِ پختہ تر بیار
لعبتِ خاک ساختن می نہ سزد خداے را(۲۶)

پرانے ہیں یہ ستارے، فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز!(۲۷)

غلام السیدین اقبال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

He believes that life cannot unfold all its possibilities, nor can the individual develop his latent powers except in an atmosphere of freedom. (۲۸)

ایک اور جگہ پر غلام السیدین رقمطراز ہیں:

He further makes the significant point that the development of creativity which is the highest attribute of man and links him with God and originality which is the condition precedent for all progressive change, also postulates freedom.(۲۹)

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی(۳۰)

اقبال کا خیال یہ ہے کہ حقیقتیں کبھی نہیں بدلتیں۔ ان حقیقتوں کے ادراک اور ان تک رسائی حاصل کرنے کے طریقوں میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ مردانِ حر وہی ہیں جو ''تجدید اندازِ عمل'' سے گردشِ شام و سحر پر غالب آتے ہیں۔ وہ ذوقِ ایجاد اور شوقِ پرواز کی بدولت کہنگی اور فرسودگی کو شکست دیتے ہوئے دنیا کے رہنما بن کر دنیا میں عزت کی زندگی بسر کرتے ہیں:

زندگی بخشد ز اعجازِ عمل
می کند تجدید اندازِ عمل
زندگی را می کند تفسیر نو
می دہد ایں خواب را تعبیر نو(۳۱)

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی لکھتے ہیں:

اقبال محکوموں کی مصوری اور شاعری کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ ان غلاموں کے قلم سے

Marfat.com

صرف موت کا مضمون ہی نکلتا ہے اور جدھر دیکھو موت ہی کا افسانہ قلمبند ہو رہا ہے۔ محکوم چونکہ بے یقین ہوتا ہے اس لیے وہ لذتِ تخلیق اور قوت تخلیق دونوں سے محروم ہے۔ محکوم قوم کے مذہبی پیشوا برہمن سے زیادہ کافر ہیں کیونکہ ان کا بُت خانہ باہر نہیں بلکہ ان کے دماغ میں پوشیدہ ہے۔(۳۲)

می چکد از خامہ ہا مضمون موت
ہر کجا افسانہ و افسونِ موت
بے یقین را لذتِ تخلیق نیست
بے یقین را قوتِ تخلیق نیست(۳۳)
شیخِ ما از برہمن کافر تر است
زانکہ او را سومنات اندر سر است(۳۴)

اقبال کے خیال میں قوم کو محکومی کے نغموں کی نہیں بلکہ حریت و آزادی کی لے کے حامل ایسے تند و تیز نغموں کی ضرورت ہے جو تلاطم خیز ہوں، دلوں کو نئے ولولوں سے آشنا کریں، جو جنوں پرور ہوں اور دلوں کو ہر غم و اندیشہ سے پاک کر کے سوئے منزل گامزن کردیں:

نغمہ باید تُندرو مانند سیل
تا برد از دل غمان را خیل خیل
نغمہ می باید جنون پروردۂ
آتشے در خونِ دل حل کردۂ(۳۵)

مندرجاتِ بالا سے یہ بات اظہر من الشمس ہوجاتی ہے کہ حریت و آزادی کی فضا میں اٹھنے والا ہر قدم انسان کو زندگی کے میدان میں آگے بڑھاتا ہے جبکہ محکومی و تقلید سے زندگی میں جمود اور تعطل پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ فلسفۂ اقبال میں حریت و آزادی کو ایک ایسی بے پایاں قدر کی حیثیت حاصل ہے جسے عملِ ارتقا میں بہت اہمیت حاصل ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔انا عرضنا الامانة علی السموت والارض و الجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها و حملها الانسان انه کان ظلوماً جهولاً (۷۲:۳۳)

2- Muhammad Iqbal, *The Reconstruction of religious thought in Islam*, Lahore, 1962, p. 81

Marfat.com

۳۔بانگ درا، ص ۵۰

4. *The Reconstruction of religious thought in Islam,* p. 95

۵۔بانگ درا، ص ۱۳۸

۶۔پیام مشرق، ص ۵۹

۷۔زبور عجم، ص ۱۸۸

۸۔ایضاً، ص ۱۸۹

۹۔رموز بیخودی، ص ۱۶۰

۱۰۔ضرب کلیم، ص ۷۸

۱۱۔بال جبریل، ص ۲۴

۱۲۔یوسف سلیم چشتی، شرح پیام مشرق، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور: سن ندارد، ص ۳۸۳

۱۳۔اقبال نے یہ مضمون قرآن پاک کی درج ذیل آیات سے اخذ کیا ہے:

" اولئك كالانعام بل هم اضل" (۷:۱۷۹)

" ان هم الا كالانعام بل هم اضل سبيلاً" (۲۵:۴۴)

۱۴۔پیام مشرق، ص ۱۳۴

۱۵۔اسرار خودی، ص ۴۴

16- *The Reconstruction of religious thought in Islam,* p. 108

17- *The Reconstruction of religious thought in Islam,* p. 109

18- Jamila Khatoon, *The Place of God, Man and Universe,* Lahore, 1977, p.140

19- *The Reconstruction of religious thought in Islam,* p. 123

۲۰۔پیام مشرق، ص ۶۶

۲۱۔اسرار خودی، ص ۲۴

۲۲۔پیام مشرق، ص ۱۵۸

۲۳۔ایضاً، ص ۳۳

۲۴۔ایضاً، ص ۹۶

۲۵۔اسرار خودی، ص ۷۳-۷۲

۲۶۔پیام مشرق، ص ۱۶۲

۲۷۔بال جبریل، ص ۱۶

Marfat.com

28. K. G.Saiyidain, *Iqbal's Educational Philosophy,* Lahore, 1965,p. 24

۲۹۔ایضاً، ص ۲۶

۳۰۔بانگ درا، ص ۲۵۹

۳۱۔اسرار خودی، ص ۴۵

۳۲۔رضی الدین صدیقی، اقبال کا تصورِ زمان و مکاں اور دوسرے مضامین، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۶۳

۳۳۔زبور عجم، ص ۸۷۔۱۸۶

۳۴۔رموز بیخودی، ص ۱۶۷

۳۵۔زبور عجم، ص ۱۸۴

☆☆☆

Marfat.com

اقبال کی شاعری کا پس منظر

طارق بن عمر☆

اقبال ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب مشرق اور مغرب میں زندگی اور اس کے مختلف شعبوں میں ایک عجیب و غریب انقلاب نمودار ہورہا تھا۔ مشرق کی جہاں گیریاں جہاں ستانیاں ختم ہوچکی تھیں اور مغرب کی سیاسی فتح مندیاں اپنا نقش قائم کررہیں تھیں اور ان کے قدم بقدم مشرق پر مغربی ذہن وفکر کی فتوحات کا سکہ بھی بیٹھ چکا تھا۔ اہل مشرق علی الخصوص مسلمانوں کی آنکھیں مغربی افکار سے چندھائی جا رہی تھیں، ہر سمت زوال اور پستی کا احساس تھا اور ذہنی مرعوبیت کی حد یہ تھی کہ ہر شعبہ حیات میں مغرب کی تقلید ایک ضروری جز بن گئی تھی۔

اقبال اگرچہ خود بھی دوستانِ فرنگ سے فیض یاب ہوچکے تھے، مگر اس کو اتفاق کہیے کہ انہیں جس قدر مغربی افکار و خیالات کے مطالعہ کا زیادہ موقع ملتا گیا، اسی قدر ان کے ذہن میں مغربی تہذیب کے خلاف نفرت کا جذبہ بھی بڑھتا گیا۔ ارمغان حجاز ان کے پختہ افکار کی نمائندہ کتاب ہے۔ اس میں مغرب کے خلاف ان کی نفرت انتہا کو پہنچی ہوئی ہے:

می از میخانۂ مغرب چشیدم
بجانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم با نکویانِ فرنگی
ازان بی سوز تر روزی ندیدم!

جو شاعر آزاد فضا میں جنم لیتے اور پروان چڑھتے ہیں ان کی نغمہ سرائی کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے اور جو غلام قوم میں پیدا ہوتے ہیں، جن کی سخن سنجی اور نطق و کلام پر پابندیاں ہوتی ہیں، ان کی مصیبت بڑی دردناک ہوتی ہے، وہ خاموش نہیں رہ سکتے اگر خاموش رہیں تو ان کا سینہ پھٹ جائے، کھل کر دل کی بات زبان پر نہیں لا سکتے، اگر ایسی جرأت کریں تو زبان کٹتی ہے۔

بدقسمتی سے اقبال جس قوم میں پیدا ہوئے وہ نہ صرف غلام تھی بلکہ غلامی پر رضامند

☆ طارق ہاؤس، بابو شاہ کالونی، خیرپور میرس، سندھ

Marfat.com

بھی تھی۔ اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگانا اور جہد حیات اور جہاد حریت کے میدان میں گام فرسا کرنا تھا، راستہ خطرات سے گھرا ہوا تھا، لیکن وہ اپنے فرائض انجام دیے جا رہے تھے، قوم میں زندگی کی حرارت پیدا کر رہے تھے۔ اُسے سودائے حریت سے آشنا کر رہے تھے، اُسے جانثاری اور فداکاری کا سبق دے رہے تھے، اُسے ایک نئی آزاد دنیا بسانے پر اکسا رہے تھے۔ اگر وہ یہ نہ کرتے تو اپنے فرض سے غافل رہتے اور وہ اپنے فرض سے کسی قیمت پر بھی غافل نہیں رہنا چاہتے تھے۔ جب وہ اپنے آس پاس پر نظر ڈالتے، اپنی دشواریوں کو دیکھتے اور ان پابندیوں اور قدغنوں پر نگاہ ڈالتے تھے جو حریت طلب کرنے والوں پر عائد تھیں تو وہ محسوس کرتے کہ، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کم ہے، ناکافی ہے۔ میری لے اور تیز ہونی چاہیے، میری حدی خوانی میں کچھ اور کیفیت ہونی چاہیے، لیکن حالات سد راہ بن کر کھڑے ہو جاتے تھے اور وہ بہت سی باتیں دل کے نہاں خانہ میں قید کر دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری
یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں؟
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

چمن والوں کو اس راز سے بھی آشنا کرتے ہیں:

اڑا لی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

یہ کہہ کر اب اپنی داستانِ درد سناتے ہیں:

ریاضِ دہر میں ناآشنائے بزمِ عشرت ہوں
خوشی روتی ہے جس کو، میں وہ محرومِ مسرت ہوں
مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی
میں حرفِ زیرِ لب، شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں
پریشاں ہوں میں مشتِ خاک، لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں

اور اس کے بعد فرماتے ہیں:

Marfat.com

اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا
مرا آئینۂ دل ہے قضا کے راز دانوں میں

اور بالآخر دنیا نے دیکھ لیا اقبال نے یہ جو کچھ کہا تھا محض ایک شاعرانہ تعلی نہ تھی بلکہ ایک پیشین گوئی تھی اور وہ پوری ہو کر رہی۔

قوم کی بے بسی، غفلت، خود فراموشی، غلامی اور تباہی و بربادی نے اقبال کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ان سے قوم کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی مگر دیکھتے تھے۔ زندگی کا کون سا ایسا شعبہ تھا جس میں مسلمان پس رو اور تہی دامن نہ تھے۔ علم کے میدان میں وہ سب سے پیچھے تھے۔ تجارت اور کاروبار میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا، ایجاد و تخلیق کا مادّہ ان میں نہیں رہا تھا، جدّت اور تعمیر کے جذبے سے وہ عاری ہو چکے تھے اور ان سب خامیوں پر مستزاد ایک غیر قوم کی غلامی نے ان کے قوائے عمل کو شل کر دیا تھا۔ وہ زندہ تھے لیکن مردوں سے بدتر، نہ امنگ نہ حوصلہ، نہ ولولہ۔ جو رہزن رہنما کے بھیس میں سامنے آتا وہ اس کے ساتھ ہو لیتے۔ اسی کو کعبۂ مقصود اور قبلۂ آرزو سمجھنے لگتے۔

اقبال یہ دل دوز اور جگر فگار منظر دیکھتے اور افسوس کرتے۔ وہ ایسے دور میں اپنی شاعری کے ذریعے طرح طرح سے قوم میں حوصلہ اور امنگیں پیدا کرنا چاہتے تھے، اسے زندگی کی حرارت سے آشنا کرنا چاہتے تھے لیکن نہ قوم سنتی تھی اور نہ قوم کے راہنما۔

اقبال اپنی شاعری کی مدد سے اپنی قوم کو آزاد کرنا چاہتے تھے اور اقوام عالم میں اسے سربلند دیکھنے کی آرزو کرتے، لیکن قوم کو اس کا احساس تھا نہ قوم کے ناخداؤں میں ایسا کوئی جذبہ تھا۔ جب یہ چبھن ان کے دل میں اٹھتی تو وہ پکار اٹھتے:

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

اقبال نے ایک مرتبہ کہا تھا،

مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

اقبال چاہتے تھے کہ وہ ایسی شاعری کو یکسر ترک کر دیں جس کا مقصد رندی اور ہوسناکی ہو، اور ایسی شاعری اختیار کی جائے جو ملت کے مفادِ عمومی کی نگہباں ہو:

شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آزری

Marfat.com

پھر کھل کر اور صاف کہتے ہیں کہ وہی شاعری، شاعری ہے جو قوم کے آزر بت تراش کے لیے نوائے خلیل کا حکم رکھتی ہو:

اہل زمیں کو نسخۂ زندگی دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری

دنیا والے اس شاعری سے حیاتِ دوام حاصل کر سکتے ہیں، جس کی تربیت خون جگر سے ہوئی ہو، اور ایسی شاعری کا وجود اگر مٹ جائے تو پھر نہ قوم کی خیر ہے نہ امور ملی کی:

گلشن دہر میں اگر جوئے مے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

اقبال کی شاعری متعین روحانی اور اخلاقی مقاصد کے لیے ہے۔ وہ اپنے سامع کے دل میں جذب وقوت کی ایسی کیفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں، جس کے ذریعہ وہ فطرت پر قابو پاسکے۔ ان کے آرٹ کے دو محرکات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو انسانی زندگی کے لامحدود امکانات کا عقیدہ اور دوسرے نفس انسانی کی کائنات میں فوقیت۔

اقبال اپنے پیغام کو اس سلیقے سے رنگ و آبِ شاعری میں سمو کر پیش کرتے ہیں کہ وہ جاذبِ دل ونظر بن جاتے ہیں۔ وہ منطقی مقدمات سے نتائج نہیں نکالتے بلکہ وہ انسان کی ذاتی صلاحیت سے اپیل کرتے ہیں۔ وہ اپنے آرٹ سے ایسا معنی خیز طلسم پیدا کرتے ہیں جس میں زندگی اور فطرت دونوں کی اندرونی اور خارجی کیفیات شامل ہوتی ہیں۔ ان کی نظر اشیا اور حقائق کے معنی تک پہنچتی ہے اور بصیرت افروز ہوتی ہے۔

اقبال پہلے شاعر ہیں جو صدیوں کے جمود اور بے حسی کے بعد مشرق کی خواب آلود اور مردہ سرزمین میں پیدا ہوئے۔ اسلام کے ذہنی احیا میں ان کا مقام نہایت بلند ہے۔ اقبال نے فکر حاضر کے آغاز، تدریجی نشوونما، مقصد و منہاج اور اساسی تصورات کا بالاستیعاب جائزہ لیتے ہوئے ایک ایسی تحریک کی ابتدا کی جس کی روح خالصتاً مذہبی اور مدعا یہ تھا کہ اسلام کے عقلی اور عمرانی حقائق کو ازسرنو اجاگر کیا جائے۔ خوش قسمتی سے اس کے لیے انہیں شاعری کا مؤثر پیرایہ ہاتھ آ گیا اور وہ عالم اسلام کے ایک نئے رومی کی حیثیت سے اس خدمت کی تکمیل میں مصروف ہوگئے جو معلوم ہوتا ہے شروع ہی سے ان کے لیے مقدر ہو چکی تھی۔ رومی کی طرح اقبال نے بھی شاعری میں قرآن اور سنت کو دلیل راہ ٹھہراتے ہوئے الحاد و بے دینی کے اس سیلاب کو روکنے کی کوششیں کیں جو مغربی تہذیب و تمدن اور علم و حکمت کی آڑ میں دنیائے اسلام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس مقصد میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا جواب

Marfat.com

کچھ اس حرکت اور سرگرمی سے ملے گا جو اقبال کی شاعری اور حکیمانہ تحریروں نے مسلمانوں کے ان پڑھ اور بالخصوص نوجوان طبقے میں پیدا کردی ہیں۔

اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اقبال اقوامِ مغرب کو بالعموم اور ملت اسلامیہ کو بالخصوص اہرمنی تہذیب کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتے رہے۔ ضربِ کلیم کے ذریعے اقبال بتکدۂ عصر حاضر کے تمام بتوں کو پاش پاش کرکے رکھ دیتے ہیں۔ وہ اپنے عصائے کلیمی سے صرف فرعونیت اور قارونیت ہی کے نگاہ فریب سحر کو نہیں توڑتے بلکہ اس کے بعد وہ اپنی قوم کی قندیلِ قرآنی کی روشنی میں فاران و سینا کی اُن محفوظ و بابرکت وادیوں کی طرف رہنمائی بھی کرتے ہیں، جہاں زمین سے فلاح کے چشمے ابلتے اور آسمان سے رشد و سعادت کے من و سلویٰ اترتے ہیں۔

اقبال کی شاعری میں جو جذبات ہیں وہ فرضی اور خیالی نہیں، وہ ذاتی ہیں۔ اس لیے ان میں صداقت موجود ہے۔ اقبال کی قومی نظموں کے داعیات و اسباب اور ان کا پس منظر ایک سیر حاصل بحث کے محتاج ہیں، جن پر مستقل اظہار خیال کی ضرورت ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اپنے مضمون ''اردو'' میں اقبال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ان کی ابتدائی شاعری قومی اور وطنی قسم کی تھی، لیکن فی الحال اس میں عالمگیر احساسات پیدا ہوگئے ہیں۔ وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ وہ مذہب کو اتحاد پیدا کرنے کا بنیادی اصول بنائیں اور اسلاف کی خصوصیات اپنے اندر پیدا کریں۔ وہ اس دن کا خواب دیکھ رہے ہیں، جو عنقریب آنے والا ہے جب کہ اسلام نہ صرف ایشیا بلکہ تمام دنیا کی نجات کا باعث ہوگا۔

کتابیات

۱۔ مقامات اقبال	ڈاکٹر سید عبداللہ
۲۔ فکر اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
۳۔ معیار ادب	ڈاکٹر شوکت سبزواری
۴۔ مکاتیب اقبال	شیخ عطا اللہ
۵۔ اشارات اقبال	عبدالرحمٰن طارق
۶۔ اقبال اپنے آئینے میں	رئیس احمد جعفری
۷۔ اقبال اور قرآن	پرویز
۸۔ بانگ درا	اقبال
۹۔ بال جبرئیل	اقبال

Marfat.com

۱۰۔پیام مشرق		اقبال
۱۱۔اسرار خودی		اقبال
۱۲۔ضرب کلیم		اقبال
۱۳۔شرح ضرب کلیم		پروفیسر سلیم چشتی
۱۴۔تشکیل جدید الهیات اسلامیہ		اقبال/ترجمہ سید نذیر نیازی
۱۵۔اقبالیات کا تنقیدی جائزہ		قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی
۱۶۔جہان اقبال		عبدالرحمٰن طارق
۱۷۔خطبات اقبال		رضیہ فرحت بانو
۱۸۔اقبال اور عطیہ بیگم		عطیہ بیگم
۱۹۔اقبال کا فلسفۂ حیات و موت		اعظمی حسن
۲۰۔مکتوبات نیاز		نیاز

☆☆☆

Marfat.com

مولانا جامی و اقبال بحیثیت نعت گو شعرا

محمد شاہ ضعیف ☆

حضور اکرمؐ کی ذات بابرکت کی رفعت و بلندی کا تصور کرنا شعور بشر سے باہر ہے لہٰذا آپ کے کمالات واوصاف ،ثنا وصفت بیان کرنا حیطہء انسان میں نہیں ۔آپ کی تعریف و توصیف میں افراط وتفریط کا خدشہ لاحق رہتا ہے ۔عرفی شیرازی نے نعتیہ قصیدہ میں کیا خوب کہا کہ اے عرفی اپنے زور بیان مین تیزی نہ دکھا کہ کہیں تو حد ادب سے تجاوز نہ کر جائے اور گمان کر کہ نعت گوئی ایک تیز دھار تلوار کی مانند ہے یہاں خامہ کا واسطہ تلوار کی دھار سے ہے ذرا پھسلا اور گیا۔عرفی کا شعر ملاحظہ ہو:

عرفی مشتاب این رہ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قلم را

اسی لیے کسی نے کہا ہے :

با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

اس بارگاہ اقدس میں ادب لازم ہے۔دبستان رسالت میں جب بایزید بسطامیؒ اور جنید بغدادیؒ جیسے جلیل القدر اولیاء اللہ بھی حاضر ہوتے ہیں تو رعب وجلال اور ہیبت سے کانپتے اور لرزتے دکھائی دیتے ہیں :

ادب گاھیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

رسول اکرمؐ کا دربار وہ دربار ہے جسے فرشتے ،جنّات، انسان اور دیگر مخلوقات ،سب سجدہ گاہ سمجھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں:

بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہ ہست
سجدہ گاہ ملک و جن و بشر اینجا ہست

☆ شعبہ فارسی، اورینٹل کالج ،پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Marfat.com

اس ادب کو سب نے ملحوظ رکھا ہے کیونکہ اس کے علاوہ محبت کی تکمیل نہیں ،اقبالؒ فرماتے ہیں:

خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

نعت گو شعرا نے ادب کو سامنے رکھتے ہوئے حضورؐ کی مدحت سرائی کی ہے
شیخ سعدیؒ کے اس شعر میں جو کہ مکمل و کامل ہے آپؐ کے تمام اوصاف و شمائل سب سے اعلیٰ اور مثالی ہیں :

بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ و آلہٖ

ایک اور شاعر نے نعت کا نچوڑ اور لب لباب ان چار مصروں میں جمع کر دیا، ملاحظہ کیجیے :

یا صاحب الجمال و سیّد البشر من وجھک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقہ بعد از خدا بزرگ توئی، قصہ مختصر

نعت گوئی تاریخ کے چودہ سو سالہ دور میں ابتدا ہی سے نظر آتی ہے۔حضرت حسّان بن ثابتؓ مشہور صحابی رسولؐ ، مداح رسول کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔آپؐ حضرت حسّان بن ثابتؓ کی لکھی ہوئی نعت سننے کے لئے مسجد نبوی میں منبر رکھوانے کا اہتمام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت لبیدؓ اور حضرت کعب ابن زہیرؓ کے نام نمایاں ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ نعت گوئی ، نعت خوانی اور نعت سننا جائز اور مباح ہے کیونکہ رسول خدا نے خود نعت سنی۔ امام شرف الدین محمد بن حسین بوصیریؒ نے جو نعتیہ قصیدہ لکھا اس کو بارگاہ رسالت میں بڑا مقام حاصل ہے اور آپ کو انعام و اکرام سے بھی نوازا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کا قصیدہ خود رسول عربیؐ نے سنا اور چادر عطا فرمائی جس کی وجہ سے یہ نعتیہ کلام قصیدۂ بردہ کے نام سے مشہور ہوا جس کا پہلا شعر یہ ہے:

امن تذکر جیران بذی سلم
مزجت دمعاً جریٰ من مقلۃٍ بدم

عربی کی طرح فارسی اور اردو میں جن بے شمار شعرا نے نعت گوئی کو اپنا شعار بنایا۔ ان میں سے رومیؒ ، سعدیؒ ،خسروؒ ،خاقانیؒ ،عرفیؒ ،نظیریؒ ،جامیؒ ،قدسیؒ ،اقبالؒ ،امیر مینائی،محسن کاکوروی، مولانا احمد رضا خان بریلویؒ ، کرامت علی شہیدی ، بیدم وارثیؒ، اکبر میرٹھی اور بہزاد لکھنوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔جن دوسرے شعرا نے جملہ اصناف سخن میں نعت گوئی کا حق ادا کیا، ان میں سے قدسی مشہدیؒ کی نعت کا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے:

Marfat.com

مرحبا سیّد مکی مدنی العربی
دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

مولانا رومیؒ کے نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

سیّد و سرور محمد نور جان
مہتر و بہتر شفیع مجرمان
شاد باش اے چشمِ مستِ مصطفیٰؐ
شد اسیر این قضا میرِ قضا
گر جدا بینی ز حق تو خواجہ را
گم کنی تو متن و ہم دیباجہ را

مولانا نور الدین عبد الرحمٰن جامیؒ (۸۹۸۔۸۱۷ھ) کے یہ اشعار بھی بہت مشہور ہیں :

ز مہجوری بر آمد جان عالم
ترحّم یا نبی اللہ ترحّم
نہ آخر رحمۃ للعالمینی
ز محرومان چرا فارغ نشینی
برون آور سر از بُردِ یمانی
کہ روی تست صبح زندگانی
شب اندوہ ما را روز گردان
ز رویت روزِ ما فیروز گردان

علامہ محمد اقبال نے مثنوی اسرار خودی میں ملاّ جامی کو اپنا طبیب کہا کیونکہ اقبال عاشق رسولؐ ہیں اور عاشق کے لیے محبوب کی باتیں سننا اور صفات بیان کرنا ہی علاج ہے اور ملاّ جامی رسول اکرمؐ کی نعت کے ممتاز شعرا میں سے ہیں۔اقبال کہتے ہیں :

کشتۂ اندازِ ملاّ جامیم
نظم و نثرِ او علاج خامیم
شعرِ لبریزِ معانی گفتہ ست
در ثنای خواجہ گوہر سفتہ ست

اقبالؒ کہتا ہے کہ جامیؒ کے انداز کا کشتہ ہوں اور ان کا یہ انداز میری خامیوں کا علاج ہے۔ انہوں نے جامیؒ کے شعروں کو موتی پرونے سے تشبیہ دی ہے۔اس کی مثال ملاحظہ ہو :

Marfat.com

نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم مفلس اند و خواجہ اوست

جامیؒ پندرہویں صدی کے صرف بڑے صوفی ہی نہیں بڑے شاعر اور نثر نگار نیز عاشق رسول صلعم بھی ہیں۔ انہوں نے عشق رسولؐ میں جو نعتیں کہی ہیں وہ اس عشق میں ان کی سرشاری کی غمازی کرتی ہیں اور ان میں جذبے اور محبت کا خلوص پوری طرح کارفرما ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے ہر قاری اور سامع متاثر ہوتا ہے۔ جامی کی پُرخلوص، پرجوش، پرسوز اور پراثر نعتیں اپنی مثال آپ ہیں۔ حافظ کی غزل کی طرح جامی کی نعت اس قدر مقبول بارگاہ ہے کہ بعد کا ہر نعت گو شاعر اس سے بھرپور استفادہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے زمانہ میں جسقدر نعت لکھی ہے اس کا بھی ثانی نہیں ملتا۔ اقبال ستار کے ساتھ حالی کی نعت ''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا'' سنتے اور سنتے ہی ان کا دل بھر آتا اور اکثر بے اختیار رو پڑتے۔ اسی طرح اگر کوئی عمدہ نعت سنائی جاتی تو ان کی آنکھیں ضرور پرنم ہو جاتیں ۔ ان کا یہ سوز و گداز عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور عشق رسولؐ میں ان کی سرشاری اور استغراق کمال کے درجے پر جا پہنچا ۔ ایک روز علامہ اپنے کمرہ میں استراحت فرما رہے تھے کہ ایک فقیر کی زبان سے نعتیہ اشعار سنے ، ان اشعار کی واضح سمجھ تو نہ آئی لیکن تڑپ اٹھے اور اپنے خادم کو کہا کہ اس فقیر کو بلا لاؤ کہ یہ کلام یقیناً کسی مرد قلندر کا ہے۔ بلانے پر اس نے نعت کے شعر پڑھنے شروع کیے :

اج سک متراں دی ودھیری اے
کیوں دلڑی اداس گھنیری اے
لوں لوں وچ شوق چنگیری اے
اج نیناں لائیاں کیوں جھڑیاں

جب مقطع پڑھا تو چونک اٹھے کہ میں نہ کہتا تھا کہ یہ کلام کسی مرد قلندر کا ہے جبھی تو اس میں اس قدر تاثیر ہے کہ مجھے ہلا کے رکھ دیا ہے :

کتھے مہر علیؒ، کتھے تیری ثنا
گستاخ اکھیاں کتھے جا اڑیاں

آخر میں تو یہ حال ہوگیا تھا کہ ذرا حضورؐ کا نام کسی کی زبان پر آیا اور آپ کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ اسی طرح آپ کو فریضۂ حج کی ادائیگی اور روضۂ مبارک کی زیارت کی شدید آرزو تھی، جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی تھی۔ آخر زمانے میں بیماری اور ضعف کی وجہ

Marfat.com

سے چلنا پھرنا مشکل ہو گیا تھا مگر اس وقت بھی یہی لگن تھی کہ شاید طاقت عود کر آئے اور مجھے یہ مقدس سفر نصیب ہو جائے:

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستان سے اے اقبال
اڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

اوروں کو دیں حضورؐ یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

عجب بات یہ ہے کہ اقبال تمام عمر زمین ِ حجاز کی زیارت نہ کر سکا، ہجر و فراق میں تڑپتا رہا لیکن ان کا عشق برقرار رہا:

باایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نواخوان از سرورِ عاشقانہ
چون آن مرغی کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

علامہ اقبالؒ کی تمام شاعری عشقِ رسولؐ اور اتباع رسولؐ کا پیغام دیتی ہے ان کا آخری مجموعہ ارمغانِ حجاز خصوصاً امیر عربؐ کی بارگاہِ اقدس میں نذرانہ ہے:

گہی شعر عراقی را بخوانم
گہی جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگ عرب را
شریکِ نغمہ ہای سار بانم

مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ بھی آنحضرتؐ کے مداح اور عاشقِ صادق تھے۔ آپ نے ایک نعت کہی اور ارادہ تھا کہ روضۂ اطہر (علیٰ صاحبہا صلوٰۃ و سلاماً) کے پاس کھڑے ہو کر اسے پیش کریں گے۔ حج بیت اللہ کے بعد مدینہ منورہ کی حاضری کا ارادہ کیا تو امیرِ مکہ معظمہ نے خواب میں حضور اکرم (ص) کی زیارت کی۔ آپؐ نے خواب میں امیر مکہ معظمہ کو ہدایت کی کہ جامیؒ کو مدینہ منورہ نہ آنے دیں، چنانچہ امیر مکہ معظمہ نے جامیؒ کو سفر مدینہ منورہ سے روک دیا۔ مگر حضرت جامیؒ جذب و شوق کے ہاتھوں مجبور تھے اور چھپ کر مدینہ طیبہ کی طرف چل دیئے۔ حضرت رسول (ص) نے خواب میں دوبارہ امیر مکہ کو ارشاد فرمایا کہ جامی کو یہاں نہ آنے دو۔ امیر مکہ مکرمہ نے آدمی دوڑائے جو مولانا جامیؒ کو راستے سے پکڑ لائے اور جیل خانہ میں ڈال دیا۔ تیسری مرتبہ حضرت رسولؐ نے خواب میں امیر مکہ کو ارشاد فرمایا یہ کوئی مجرم

Marfat.com

نہیں ہے۔ اس نے کچھ نعتیہ اشعار کہے ہیں جنہیں وہ میری قبر پر پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو قبر سے مصافحہ کے لیے میرا ہاتھ نکلے گا (یہ اس کے نعتیہ کلام کا جذب و شوق ہے) جس سے عوام الناس میں شور بپا ہو گا۔ اس پر شیفتہ رسولؐ جامیؒ کو جیل خانہ سے نکالا گیا۔ حضرت کی اس مشہور نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

ز مہجوری برآمد جانِ عالم
ترحّم یا نبی اللہ ترحّم
نہ آخر رحمۃ للعالمینی
ز محروماں چرا فارغ نشینی
بہ حسنِ اہتمامت کارِ جامی
طفیلِ دیگران یابد تمامی

یہ کل ۳۲ اشعار ہیں یہ مشہور نعت مثنوی ''یوسف و زلیخا'' کی ابتدا میں موجود ہے۔ ولیم جونز (William Johns) لکھتا ہے کہ میں نے یوسف زلیخا سے بہتر کوئی عاشقانہ مثنوی نہیں پڑھی۔ یہ مثنوی فارسی ادب کا ایک نہایت قیمتی ذخیرہ ہے۔ ملا جامیؒ نے قصیدہ بردۂ شریف کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے جو کہ ادبیات میں پذیرائی کے قابل ہے۔ آپ خاتم الشعرا اور جامع الصفات شخص تھے۔ آپ کے اشعار کا دلآویز پہلو عرفان، عشق و محبت خصوصاً عشقِ رسولؐ اور مختلف دینی مسائل کا بیان ہے۔ نعت آپ کا خاص موضوع تھا اشعار ملاحظہ ہوں :

ای صدر نشین تختِ کونین
تخم و ثمر درخت کونین
ما دولت طاعت از تو داریم
امید شفاعت از تو داریم

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ میں نے اس کائنات میں انسان کے خلق کیے جانے کا اصل مقصد ہی اتباع رسولؐ مشاہدہ کیا ہے وہ کہتے ہیں :

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

مولانا جامیؒ قرآن مجید کے مطابق مدینہ منورہ کی سرزمین کو اعلیٰ و افضل کہہ رہے

Marfat.com

ہیں لا اقسم بھذا البلدہ و انت حلّ بھذا البلدہ تیسویں پارہ میں سورۂ بلد (جو کہ مکی سورہ ہے) کی ان آیات میں باری تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ اے محبوب جہاں تو رہتا ہے اس کی قسم اور قسم تو پیاری اور ارفع چیز کی کھاتے ہیں۔ جامیؒ کو حضور کی ذاتِ اقدس سے بے حد عشق ہے۔ اس لیے محبوب کی مٹی اور سر زمینِ مدینہ کو افضل کہا:

جامیؒ:

ارض بطحا کہ زیر پای تو بود　　خاک نعلین عرش سای تو بود
ریگش آید بہ چشم اہلِ نظر　　خوشتر از خرد کردہ لعل گہر
خاکِ یثرب کہ با گلت آمیخت　　آب روی زمین روضہ بریخت
کالای مدینہ چو بود خاک رہ او　　ملک دو جہان قیمت کالای مدینہ

اقبالؒ:

مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا　　تیرے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ　　سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است　　ای خنک شہری کہ آنجا دلبر است

جامیؒ کا معراج کے متعلق شعر ملاحظہ کیجیے:

ز سرِ سینہ اش جامی الم نشرح لک بر خواں　　ز معراجش چہ می پرسی کہ سبحان الذی اسریٰ

اقبالؒ:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے　　کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں
عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے
اختر شام کی آتی ہے فلک سے آواز　　سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات
رہ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں　　کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

نبی اکرمؐ سے جامیؒ کی والہانہ محبت و عشق ہے کہ اپنے اشعار میں آپؐ کے اوصاف بیان کرنا اپنے لیے وجہ سعادت سمجھتے ہیں خصوصاً مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حج کے موقع پر جو نعتیہ غزلیں لکھی ہیں وہ اپنے سوز کی وجہ سے مقبول بارگاہ ہیں۔ نبی اکرمؐ کے لیے جامیؒ کی دیوانگی و شیفتگی ان اشعار سے عیاں ہے جن میں مدینہ جانے اور روضہ منورہ پر حاضر ہونے کی آرزو ظاہر ہوئی ہے۔ نمونے کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

Marfat.com

جامیؒ :

مشرف گرچہ شد جامی ز لطفش　　خدایا این کرم بارِ دگر کن

کی بود یارب کہ رو در یثرب و بطحا کنم　　گہ بہ مکہ منزل و گہ در مدینہ جا کنم

یا رسول اللہ بہ سوی خود مرا راہی نمای　　تا ز فرقِ سر قدم سازم ز دیدہ پا کنم

خواہم از سودای پاپوشت نہم سر در جہان　　یا بہ پا یت سر نہم یا سر درین سودا کنم

علامہ اقبالؒ کو حجاز مقدس اور روضہ ء اطہر کی زیارت کا بڑا شوق تھا۔ترانۂ ملی میں کہتے ہیں:

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا　　اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

جامیؒ :

نسیما جانب بطحا گذر کن
ز احوالم محمدؐ را خبر کن

اقبالؒ :

اے باد صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

جامیؒ :

تویی سلطان عالم یا محمدؐ
ز روی لطف سوی من نظر کن

اقبالؒ :

گہی اشتر گہی مستانہ خیزم　　چہ خون با تیغ و شمشیری بریزم
نگاہِ التفاتی بر سرِ بام　　کہ من با عصر خود اندر ستیزم

جامیؒ اور اقبالؒ کے خیال میں ایک نمایاں فرق مجھے یہ نظر آیا ہے کہ جامیؒ حضور اکرمؐ کی زیارت اورقربت کے زیادہ خواہاں ہیں جبکہ اقبالؒ اس سے احتراز فرماتے ہیں اور شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضورؐ اسقدر با وفا اور میں اسقدر بے وفا اور فاسق و گنہگار، میں کیسے آپؐ کا سامنا کروں۔خدا سے بھی استفسار کرتے ہیں کہ قیامت کے دن بھی میرا حساب کتاب حضور اکرمؐ سے اوجھل لینا کہ مجھے شرمندگی ہوگی۔

جامی :

برون آور سر از برد یمانی　　کہ روی تست صبح زندگانی

Marfat.com

مہر روی تو ہوش برد ز من | بنما روی خود ز بردیمن
بہر این جان مشتاقم در آنجا | فدای روضۂ خیر البشر کن

اقبالؒ :

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر | روز محشر عذر ہای من پذیر
در حسابم را تو بینی ناگزیر | از نگاہ مصطفیؐ پنہان بگیر

جامیؒ :

بی نشان است کز و نام و نشان چیزی نیست | بخدا غیرِ خدا در دو جہان چیزی نیست
عشق است و بس کہ دو جہان جلوہ میکند | گاہ از لباس شاہ و گہ از کسوتِ گدا

اقبالؒ :

بہ مصطفیؐ برسان خویش را کہ دین ہمہ اوست | اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

علامہ محمد اقبالؒ کے آخری اشعار میں سے ایک دو بیتی ملاحظہ ہو :

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید | نسیمی از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روز گار این فقیری | دگر دانای راز آید کہ ناید

☆☆☆

Marfat.com

بیسویں بین الاقوامی یومِ جوانان (۲۰ اگست ۲۰۰۵ء) کے موقع پر

عزت مآب پوپ بینڈکٹ شانزدہم کا سفرِ کولون اور حاضرین سے خطاب

عزیز مسلمان دوستو!

نہایت مسرت کا مقام ہے کہ میں آج آپ لوگوں کے درمیان موجود ہوں اور آپ کو تہہ دل سے خوش آمدید کہنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں یہاں یورپ اور دنیا کے ہر علاقے سے آئے ہوئے نوجوانوں سے ملاقات کی غرض سے آیا ہوں۔ نوجوان انسانیت کا مستقبل اور قوموں کی امید ہوتے ہیں۔ میرے محبوب پیشرو پوپ جان پال دوم نے مراکش میں کاسا بلانکا کے اسٹیڈیم میں نوجوان مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے ایک مرتبہ کہا تھا ''اگر نوجوان خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے خدائی منصوبے کے مطابق دانشمندی اور اعتماد کے ساتھ ایک نئی دنیا کی تعمیر کا عزم کرلیں تو وہ ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کرسکتے ہیں۔''(۱)

میرے پیارے اور محترم مسلمان دوستو! میں بھی آج اسی جذبے کے ساتھ آپکی طرف متوجہ ہورہا ہوں تاکہ آپ کو اپنی امیدوں میں شریک کروں اور اپنی تاریخ کے خاص طور پر اس مشکل مرحلے پر اپنے اندیشوں سے آگاہ کرسکوں۔ مجھے یقین ہے کہ جب میں دہشت گردی کے پھیلاؤ سے متعلق اپنی پریشانی کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں تو گویا میں خود آپ ہی کے افکار کی صدائے بازگشت آپ کو سنارہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ میں سے بہت سوں نے اسے کھلم کھلا طور مسترد کردیا ہے، اور خاص طور پر اپنے مذہب اور دہشت گردی کے درمیان ہر قسم کے تعلق کی مذمت کی ہے۔ میں آپ کے اس اقدام کے لیے آپ کا مشکور ہوں کیونکہ یہ اعتماد اور بھروسے کی اس فضا کی تخلیق میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے جسکی ہمیں

Marfat.com

ضرورت ہے۔ دہشت گردی پر مبنی اقدامات جو لوگوں کو غم اور افسردگی میں ڈبو دیتے ہیں دنیا کے مختلف حصوں میں رونما ہو رہے ہیں۔ جو عناصر ان حملوں کے لیے لوگوں کو اکساتے اور ان کی منصوبہ بندی کرتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ ہمارے تعلقات کو زہر آلود اور باہمی اعتماد کو تباہ کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے وہ مذہب سمیت تمام ذرائع کا استعمال کرتے ہیں تاکہ پرامن اور پُرسکون ہم زیستی کی فضا کو نقصان پہنچا سکیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ہم سب اس حقیقت پر متفق ہیں کہ دہشت گردی ایک گمراہ، اور ظالمانہ روش ہے جس سے زندہ رہنے کے مقدس حق سے تنفر کا اظہار ہوتا ہے اور عمرانی بقائے باہمی کی بنیادوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اگر ہم سب باہم متحد ہوکر اپنے دلوں کو تلخی اور تعصب کے ہر ایسے شائبے سے پاک کرنے میں متحد ہو جائیں جو عدم رواداری کی ہر شکل سے مزاحمت اور تشدد کے ہر روپ کی مخالفت کے لیے ضروری ہوتا ہے تو ہم انتہا پسندی کی اس ظالم لہر کا رخ موڑ سکتے ہیں، جو بہت سارے لوگوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈالتی اور امن عالم کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ ہر مومن اور ہم سب بہ حیثیت عیسائی اور مسلمان مومن ہیں، جانتا ہے کہ وہ اپنی کمزوری کے باوجود دعا کی روحانی طاقت پر بھروسا کر سکتا ہے۔

عزیز دوستو! میرا یہ پختہ یقین ہے کہ ہمیں نہ صرف یہ کہ اپنے درمیان موجود منفی طاقتوں کے سامنے ہرگز نہیں جھکنا چاہیے بلکہ یقینی طور پر باہمی احترام، یگانگت اور امن کی اقدار کو آگے بڑھانا چاہیے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کے عقیدے کے مطابق ہر انسان کی زندگی مقدس ہے۔ بنیادی اخلاقی اقدار کی خدمت کے سلسلے میں ہمارے دونوں ادیان کے درمیان تشریک مساعی کے وسیع امکانات موجود ہیں۔

ہر معاشرتی جستجو کو انسانی احترام اور اس احترام سے حاصلہ حقوق کے دفاع کے سلسلے میں ثمر بخش ہونا چاہیے۔ بے شک و شبہ ہمیں ضمیر کا یہ صاف اور واضح پیغام ملتا ہے۔ یہ ایسا پیغام ہے جس پر کان دھرنا اور اسے دوسروں تک پہنچانا چاہیے۔ اگر اس پیغام کی صدائے بازگشت لوگوں کے دلوں تک پہنچنا رک گئی تو دنیا ایک نئی بربریت کی تاریکیوں سے ہمکنار ہو جائے گی۔

صرف فرد کی مرکزیت کی شناخت ہی سے باہمی افہام و تفہیم کے لیے ایک مشترک بنیاد حاصل ہو سکتی ہے، ایک ایسی بنیاد جو ہمیں ثقافتی اختلافات کو پیچھے چھوڑ کر باہمی پیشروی کے قابل بناتی ہے اور نظریات کی تباہ کن تخریبی قوتوں کے اثرات کو زائل کرنے کی اہلیت

Marfat.com

سے بہرہ ور ہے۔

گزشتہ سال اپریل میں کلیساؤں اور مسیحی برادریوں اور مختلف مذہبی روایات کے نمائندوں سے ملاقات کے دوران میں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ''چرچ دنیا کے مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان دوستی کے پل تعمیر کرنے کے سلسلے کو جاری رکھنا چاہتا ہے تاکہ ہر انسان اور مجموعی طور انسانی معاشرے کی خیر و خوبی کی جستجو کی جائے۔''(۲)

ماضی کے تجربات ہمیں یہ بات سکھاتے ہیں کہ بدقسمتی سے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات ہمیشہ باہمی احترام اور تفاہیم پر مبنی نہیں رہے۔ تاریخ کے کتنے ہی صفحات ان کی باہمی آویزش و پیکار کے عکاس ہیں جبکہ دونوں فریق خدا سے مدد کے طالب اور دشمن سے جنگ اور اسے ہلاک کردینے ہی کو خدا کی خوشنودی و رضا کا سبب جانتے تھے۔ ان افسوسناک واقعات کی یاد سے ہمارے سرشرم سے جھک جاتے ہیں کیونکہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ماضی میں مذہب کے نام پر کیسے کیسے ظلم و تشدد کیے گئے۔

ماضی کے درس سے ہمیں اس بات میں مدد ملنی چاہیے کہ ہم اس قسم کی غلطیوں کو نہ دہرائیں۔ ہمیں باہمی پیوند اور تعلق کے رشتوں کو مستحکم کر کے ایک دوسرے کے تشخص کا احترام کرتے ہوئے مل جل کر رہنا چاہیے۔ اس تناظر میں مذہبی آزادی کا دفاع ایک مستقل ضرورت ہے اور اقلیتوں کا احترام ایک سچے تمدن کی واضح علامت۔ اس سلسلے میں دوسرے ویٹیکن کونسل کے فادرز کی شوریٰ نے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں جو کچھ کہا اسے یاد رکھنا مناسب ہوگا:

> چرچ مسلمانوں کو بہ نگاہِ احترام دیکھتا ہے۔ وہ اس خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں جو زندہ، حی، باقی، رحیم اور قدیر ہے، جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے، جس نے بشریت سے تکلم کیا اور جس کے احکام، یہاں تک کہ مخفی احکام کی بھی، وہ دل و جان سے اطاعت کرتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے کہ ابراہیمؑ نے کی، وہ (ابراہیم) جس سے اسلامی عقیدہ خود کو منسلک کرتا ہے، جس نے خدا کی اطاعت و بندگی کی۔ اگرچہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان گزشتہ صدیوں کے دوران شدید اختلافات اور دشمنیاں وجود میں آئیں، پھر بھی یہ اجلاس دونوں فریقوں پر زور دیتا ہے کہ وہ ماضی کے واقعات کو بھلا دیں اور خود کو ایک دوسرے سے مخلصانہ افہام و تفہیم کی تربیت دیں اور باہمی تعاون کے ذریعے معاشرتی انصاف اور اخلاقی اقدار کے علاوہ تمام لوگوں کے لیے امن و آزادی کو فروغ دیں۔ (۳)

دوسری ویٹیکن کونسل کے یہ الفاظ ہمارے لیے آپ سے گفتگو کے سلسلے میں عظیم منشور ہیں، عزیز مسلمان دوستو! میں خوش ہوں کہ آپ نے ہم سے اسی جذبے کے ساتھ گفتگو کے ذریعے ان ارادوں کی تائید کی ہے۔

Marfat.com

میرے محترم دوستو! آپ اس ملک کے بعض مسلمان معاشروں کی نمائندگی کرتے ہیں جہاں میں متولد ہوا، تعلیم حاصل کی اور زندگی کا ایک بڑا حصہ گذارا۔ اسی لیے میں آپ سے ملاقات کا خواہشمند تھا۔ آپ مسلمان مومنین کی رہنمائی اور اسلامی عقائد کے سلسلے میں ان کی تربیت کرتے ہیں۔

تدریس ایک ایسا وسیلہ ہے جس سے افکار اور عقائد کا ابلاغ ہوتا ہے۔ ذہن کی تربیت میں الفاظ کو بڑا اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے جوان نسل کی تربیت میں آپ کی ایک بڑی خطیر ذمہ داری ہے اور جس تندہی سے آپ اپنی یہ ذمہ داری نبھا رہے ہیں میری روح اس کے لیے آپ کی شکر گزار ہے۔ عیسائیو اور مسلمانو! ہمیں اس دور میں بڑے بڑے چیلنجوں کا سامنا ہے۔ بے پروائی، بے حسی اور الگ تھلگ رہنے کی کوئی گنجائش نہیں اور طرفداری اور فرقہ پرستی کی تو بالکل بھی نہیں! ہمیں خوف اور ناامیدی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں۔ اسکے برعکس ہمیں اپنے اندر امید اور رجائیت پیدا کرنی چاہیے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان بین المذہبی اور بین الثقافتی گفتگو کو ایک فاضل اختیاری موضوع کا کمتر درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک ناگزیر حیاتیاتی ضرورت ہے جس پر ہمارے مستقبل کا بڑے پیمانے پر انحصار ہے۔ کولون میں دنیا کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے یہ نوجوان اتحاد، برادری اور محبت کے زندہ شاہد اور گواہ ہیں۔

عزیز اور محترم مسلمان دوستو! میں دل کی گہرائیوں سے دعا کرتا ہوں کہ رحیم اور مہربان خدا ہمیشہ آپ کی حفاظت کرے، آپ پر برکتیں نازل کرے، اور آپکی فکروں کو روشن کرے۔ امن کا خدا ہمارے دلوں کو بلندی عطا کرے، ہماری امیدوں کی پرورش کرے اور ہمارے قدموں کی دنیا کی راہوں میں راہنمائی فرمائے! آپ کا شکریہ

منابع

Insegnament, VIII/2, 1985, p.500-۱

L'Osservatore Romano, 25 April 2005, p.4-۲

Declaration Nostra Aetate, n. 3-۳

☆☆☆

Marfat.com

مغرب اور اسلام

محمد شفیع بلوچ☆

مغرب یا یورپ اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے مختلف براعظموں کے درمیان نقطۂ اتصال کا درجہ رکھتا ہے۔اس لحاظ سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یورپ کا نام آتے ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے سارے لوازم کا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے۔ اعلیٰ درجے کی یونیورسٹیاں، عظیم الشان لائبریریاں اور تجربہ گاہیں، سائنس، فلسفہ، تاریخ اور ادب وغیرہ کے ایک سے بڑھ کر ایک علما، لیکن ہزار سال پہلے کا یورپ آج کے یورپ سے قطعی مختلف تھا۔ گندا، اجڈ، جاہل اور گنوار!! چھٹی صدی سے سترہویں صدی عیسوی تک کا وہ زمانہ تاریخ میں ''قرون مظلمہ'' (Dark Ages) کے نام سے مشہور ہے۔ مغرب تو درکنار مشرق بھی ظلمت و جہالت میں ڈوبا ہوا تھا جبکہ اسلامی دنیا اس وقت علم و حکمت کی روشنی سے مطلع انوار بنی ہوئی تھی۔

یورپ کے نیم متمدن پادریوں کو جب مسلمانوں کی ثقافتی عظمت اور علمی برتری کا احساس ہوا تو ایک تحریک شروع ہوئی جس کا مقصد مختلف علوم و فنون کی کتابوں کو عربی سے لاطینی میں منتقل کرنا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں طب و ریاضیات اور طبعیات و الٰہیات کی کتابوں کا خصوصیت سے ترجمہ کیا گیا۔ اس تحریک کا آغاز گیارہویں صدی عیسوی میں پوپ سلوسٹر دوم نے کیا۔ یہ تحریک نشأۃ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ فطری تقاضا تھا کہ یورپ کے اندر جن لوگوں میں تحصیل علم کی تڑپ تھی وہ اسپین یا مشرق کی طرف رخ کریں۔ اسپین کا سفر یورپ کے شائقین علم نے دسویں صدی عیسوی میں ہی شروع کردیا۔ گربرٹ جو سلوسٹر دوم کے نام سے پوپ کے عہدہ پر فائز ہوا وہ اسپین کی اسلامی یونیورسٹیوں میں تعلیم پاچکا تھا۔ ویبر، تاریخ فلسفہ میں لکھتا ہے کہ اس ''تنویر ذہنی'' کی اولین تحریک کے بانی، گربرٹ کا علم و فضل مسلمانوں ہی کا رہین منت تھا۔(۱) لیکن قرونِ وسطیٰ کے یورپی فضلا میں گربرٹ اکیلا شخص نہیں ہے جس نے اسلامی اسپین کی یونیورسٹیوں میں تعلیم

☆ موضع درگاہی شاہ، ڈاک خانہ ۱۸ ہزاروی، تحصیل و ضلع جھنگ

Marfat.com

پائی ہو۔ قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیاں یورپی فضلا سے بھری رہتی تھیں اور اسپین کی اسلامی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل یہی فضلا آگے چل کر مغربی تہذیب و ثقافت کے شمع بردار بنے۔ چنانچہ ڈریپر لکھتا ہے:

یورپ کے مختلف حصوں سے حصول علم کی غرض سے آئے ہوئے تشنگان علم سے اسپین کی یونیورسٹیاں بھری رہتیں۔ پیٹر جو کہ ۔۔۔ بڑی روانی سے عربی بول لیتا تھا۔ اس نے قرآن کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ برطانیہ تک طلبہ ہیئت اور فلکیات پڑھنے اسپین آئے ہوئے تھے۔ (۲)

اسلام سے قبل دنیا کی عظیم الشان ثقافت رومی و بازنطینی تہذیب تھی۔ رومیوں نے ۱۴۶ ق۔م میں یونان کو اور ۴۰ ق۔م میں مصر کو جو یونانی ثقافت کا گہوارہ تھا، فتح کر کے رومی سلطنت میں مدغم کرلیا۔ یونانی دنیا میں متمدن ترین قوم تھی جس نے سائنٹفیک طور پر مختلف علوم کو مدون کیا۔ حکمائے یونان میں پہلا مہندس و ریاضی دان اور ماہر فلکیات ثالیس تھا جس نے ان علوم کو مصریوں سے حاصل کیا اور واپس آکر یونان میں علم وحکمت کے تعلیم و تعلم کا آغاز کیا۔ یونان میں فلسفہ و سائنس کا دور ایک ہزار سال ہے۔ اس کے بعد چھٹی صدی عیسوی میں یونان میں زوال آگیا۔ بعد ازاں یورپی تہذیب کا آغاز ہوا جو دورِ ظلمت کہلاتا ہے اور یہ کم و بیش ایک ہزار سال پہ محیط ہے۔ یونان کی علمی عظمت کتنی ہی تابندہ و درخشاں سہی لیکن قرونِ مظلمہ (Dark Ages) کی تاریکی نے اس کے علم وحکمت کے چراغ کو بھی بجھا کر رکھ دیا۔ سقوط رومۃ الکبریٰ اور مسیحی تعصب کی چیرہ دستیوں کے بعد جہالت و تنگ نظری کی جو صرصر تند چلی، یونانی علم وحکمت کے جواہر پارے اس آندھی میں دب کر رہ گئے اور اکثر بادِ حوادث کی نذر ہوکر ہمیشہ کے لیے صفحہ دہر سے نابود ہوگئے، جو باقی رہے وہ صرف مسلمانوں کی اعتنا و اہتمام سے باقی رہے۔ اگر مسلمانوں نے بھی مسیحی متعصبین کی طرح ان جواہر پاروں کے ساتھ ثقافت بیزاری کا سلوک کیا ہوتا تو آج صفحۂ ہستی پر ان کا نام و نشان بھی نہ ہوتا۔ (۳)

بے شک دنیائے تہذیب یونانی مفکرین کی کاوشوں کے احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتی مگر ایک قوم اور بھی ہے جس نے ماضی قدیم کے مٹی کے دیوں اور عہد حاضر کے بجلی کے قمقموں کے درمیان شمع کا فوری کا کام کیا، یہ مسلمان ہیں۔ اس حیثیت سے دنیائے انسانیت مفکرین اسلام کی جگر کاویوں کی جس قدر بھی شکر گزار ہو کم ہے۔ (۴) نشأۃ ثانیہ کے آغاز کے مابین اگر اسلامی ثقافت کا واسطہ نہ ہوتا تو یقیناً یورپ یونانِ قدیم کے اکتشافاتِ علمیہ سے محروم ہوجاتا اور تہذیب و ترقی کی جو فلک بوس عمارت معمارانِ فرنگ نے تعمیر کی ہے وہ کبھی نہ بن

Marfat.com

سکتی۔ مورخین قرونِ وسطیٰ کے یورپ کے بارے میں کچھ ہی کیوں نہ کہیں یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ جدید یورپ کی علمی و ثقافتی ترقی قرونِ وسطیٰ کے یورپ کا ہی تسلسل ہے اور قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں اجالا پہنچا تو قلمروِ اسلام ہی سے پہنچا۔

قدیم یونانی حکما ہوں (جنہوں نے یونانی علم و حکمت کی بنیاد ڈالی) یا قرونِ وسطیٰ کے یورپی فضلا جو عہدِ حاضر کی دانشِ فرنگ کے بانی ہیں، دونوں نے علم و حکمت سیکھنے کے لیے مشرقی ممالک کا سفر کیا۔ یونانیوں نے مصر، شام، بابل و فارس کا اور اہلِ یورپ نے قلمروِ اسلامی کا، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے ریاضی و ہیئت وغیرہ کی تحصیل کے لیے یونان، روم یا بازنطیہ (قسطنطنیہ) کا سفر نہیں کیا۔ (۵)

یورپ کی ترقی اور عظمت بڑی حد تک ان علوم و فنون کی ترقی کا نتیجہ ہے جو نشاۃ ثانیہ کے بعد سے عام یورپی سماج کا خصوصی امتیاز بن گئے۔ ان علوم و فنون میں ریاضی و ہندسہ کا بلند مقام ہے جنہوں نے صرف تسخیرِ کائنات ہی میں انسان کی معاونت نہیں کی بلکہ اس کی فکر کو صیقل مجلّی کر کے اور نظر میں تدقیق و باریک بینی پیدا کر کے عہدِ حاضر کے انسان کو بھی "فوق الانسان" بنادیا۔ (۶) ان علوم و فنون کو بروئے کار لا کر یورپ ایک غالب طاقت میں تبدیل ہوگیا اور آج جو یہ علم و حکمت کا گہوارہ اور ثقافتی برتری و تمدنی تفوق کا بلند منارہ ہے تو یہ سب کچھ اسلام ہی کا رہین منت ہے۔ یورپ نے اسلام سے اخذ و استفادہ کر کے نئی شاخیں اور تازہ برگ و بار کیا نکالے کہ ان کے علم و فن میں تموج آگیا۔ فلسفے کو ایک نیا رنگ ڈھنگ دیا، سائنس کی حقیقت افروز تحلیل کو جانچا اور تجربوں میں عمریں گھلا کر اختراع و ایجادات کی بجلیاں دوڑا دیں، بادشاہت کو جمہوریت کی راہ سجھائی، فنونِ لطیفہ میں لطافت، نزاکت اور تنوع پیدا کر کے اسے آرٹ کے درجے تک پہنچایا، علوم میں ایسا تفقہ پیدا کیا کہ کئی شاخیں اور کئی شعبے معرضِ وجود میں آگئے۔ کلیسا کے فتوے، صلیبیں اور آگ کے شعلے ان کی ترقی میں سد راہ نہ بن سکے یہاں تک کہ انہوں نے فی الواقع ستاروں پہ کمندیں جا ڈالیں۔ چاند اور مریخ اب ان کی گردِ راہ ہیں۔ انہوں نے خورشید کا دل چیر کر ایسا جوہر حاصل کرلیا ہے کہ پوری دنیا کو اپنا تابع فرماں بنالیا ہے۔ ایک وہ یارانِ تیز گام ہیں کہ جنہوں نے منزل کو جالیا ہے اور ایک ہم ہیں کہ کافر گری میں اپنی مثال آپ ہیں، محوِ جرسِ کارواں بلکہ غبارِ کارواں بن کے رہ گئے ہیں۔ آج مسلمان اپنے اسلاف کی میراث سمجھ کر اس تمام تر ترقی سے استفادہ بھی کر رہے ہیں اور حیرت زدہ حیران و پریشان بھی ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ یورپ علم و حکمت سے عموماً اور یونانی فلسفہ اور سائنس سے خصوصاً

Marfat.com

صرف مسلمانوں کی تصانیف و تراجم ہی کی مدد سے آشنا ہوا۔ تھلی لکھتا ہے:

Westeren Europe first became acquainted with Aristotelian writings through translation from Arabian texts, and through the system and commentaries of Arabian philosophers.(7)

یورپ کو اصرار ہے کہ اس کی یہ عظیم الشان تہذیب جو محض علم و حکمت کا کرشمہ ہے، اسلامی تہذیب و ثقافت کا تسلسل نہیں بلکہ نشأۃ ثانیہ کا نتیجہ ہے، جو اپنی نوبت میں سقوطِ قسطنطنیہ کا نتیجہ تھی لیکن صلیبی جنگوں نے تو بقول ڈریپر علم و حکمت کے بے شمار جواہر پاروں کو بھی تہس نہس کر ڈالا گیا۔ ہزاروں قلمی نسخوں اور کتب کو آگ لگا دی گئی تھی جس سے عہدِ یونان کے متعدد مصنفین کا علمی کام صفحۂ دہر سے غائب ہوگیا۔(۸) لیکن دنیائے علم و حکمت پر یہ مسلمانوں کا احسان ہے کہ انہوں نے ان علمی جواہر پاروں کو پہلے ہی عربی میں منتقل کرلیا تھا اور اس طرح آج یہ صفحۂ دہر پر باقی ہیں ورنہ اصل یونانی کے اندر ان میں سے بہت سی کتابوں کا آج پتہ نہیں ہے۔ چنانچہ عہد حاضر میں علم و حکمت کے ان شہ پاروں کو جب منصۂ شہود پر لانے کی کوشش کی گئی تو انہیں صرف عربی نقول و تراجم ہی کی مدد سے مرتب کیا گیا۔

مسلمان تو رہے ایک طرف، یورپ اپنی موجودہ سائنسی، ثقافتی و تہذیبی برتری کے لیے یونانیوں کے علاوہ اہل مصر و بابل کے رہین احسان ہونے کا بھی منکر ہے۔ چیمبرلین جیسا بیسویں صدی کے اوائل کا ماہر ساجیات معاصر تہذیبوں کے جن چار تشکیلی عناصر کا ذکر کرتا ہے ان میں اسلام کے ثمرات کا دور دور تک کوئی ذکر نہیں۔ وہ جدید تہذیب کی تشکیل میں یونانی، رومن، یہودی ٹیوٹانی تہذیب کے عناصر کی کارفرمائی تو دیکھتا ہے مگر اسلام کی آفاقیت اور انسانیت نوازی کا بھولے سے بھی ذکر نہیں کرتا، اور ایک چیمبرلین ہی پر کیا موقوف اشپنگلر سے لے کر کارل پوپر تک سبھی اہم مغربی دانشوروں کا یہی المیہ ہے کہ انہوں نے اسلام کی بہترین علمی روایات سے استفادہ کیا مگر اس کے اعتراف میں دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا۔ ڈیکارٹ، غزالی کے بعض افکار ہضم کرتا ہے مگر ڈکار تک نہیں لیتا۔(۹) اگرچہ بعض حق شناس دانشوروں نے سچائی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ ایچ جے جے ونٹر لکھتا ہے: ''ہمیں مغرب سے مشرق اور مشرق سے مغرب کی جانب سائنس کی ترسیل میں اسلام کے بنیادی کارنامے ہرگز نہیں بھولنے چاہئیں۔''(۱۰) اسی طرح رومر ٹیلر، ایڈیٹر *Voice Across Boundries* کا کہنا ہے: ''مغرب کے متعلق ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ عالم اسلام ہی کا پروان چڑھایا ہوا علمی تہذیبی اور فلسفی سلسلہ تھا جس نے بالآخر قرونِ

Marfat.com

وسطیٰ میں یورپ کی تحریک احیائے علوم اور روشنی کی منزل کی طرف رہنمائی کی۔''(۱۱)

یورپ کے پندارِ قومی اور احساس برتری پر یہ حقائق شاق تھے کہ وہ مسلمانوں کی علمی وثقافتی خدمات کا رہین احسان ہے۔ چنانچہ کرد علی نے اسلام اور عربی تمدن میں سرویر کی کتاب اسلام اور مسلمان کے حوالے سے نقل کیا ہے: ''یورپ کے بعض اہل قلم اب تک عربوں کی تمدنی خدمات کو گھٹا کر دکھانا چاہتے ہیں۔۔۔ بعض کا دعویٰ ہے کہ عربوں کی پیدا کردہ تہذیب قابل اعتنا نہیں ہے اور صرف یونان و روما ہی اہل مغرب کے استاد تھے۔''(۱۲)

اور ڈاکٹر گستاؤلی بان، تمدن عرب میں لکھتا ہے: ''اس مورد تعصب کے ساتھ جو ہمیں اسلام کے خلاف ہے اگر ہم دوسرے تعصبات کو بھی شریک کرلیں جسے ہماری کم بخت تعلیم نے سالہائے دراز سے ہمارے ہمیں ذہن نشین کردیا ہے کہ کل علوم و آداب صرف یونان کے سرچشمے سے پھوٹے ہیں تو بخوبی ہماری سمجھ میں آجائے گا کہ تمدن یورپ کی تاریخ میں عربوں کے حصے سے کیوں انکار کیا جاتا ہے۔''(۱۳)

بارہویں صدی عیسوی اور بالخصوص صلیبی محاربات نے یورپ کے عیسائیوں اور عرب کے مسلمانوں کو صف بہ صف ایک میدان میں لاکھڑا کیا۔ چنانچہ اس تناظر میں اسلام کو مغرب نے صرف کلیسائی آئینے میں دیکھا۔ اسلام کے بارے میں درحقیقت مغرب کی معلومات ناقص علم، فکری بدنیتی اور بددیانتی پر مبنی ہیں اور مغربی دانشوروں کے خیالات ابہام اور غیر منطقی متعصبانہ سوچ کے آئینہ دار ہیں۔ ایک اطالوی مصنف کا خیال ہے:

کلیسا کی اسلام سے مخالفت اسلام کے ابتدائی دور ہی سے شروع ہوگئی تھی اور صدیوں سے چل رہی ہے اور اس میں حالات کے مطابق کمی بیشی ہوتی رہی مگر یہ کبھی بند نہیں ہوئی۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں یہ مخالفت بہت تیز ہوگئی۔ بعدازاں ترکوں کی فتح استنبول کے بعد اور پھر سترہویں صدی کے آخر میں جب ترک آسٹریا کے پائے تخت ویانا کا محاصرہ کررہے تھے تو نفرت کی یہ آگ اور بھی تیز ہوگئی۔ اس آخر زمانے میں عیسائی مذہب کا دفاع گویا یورپ کے دفاع کا مسئلہ بن گیا۔(۱۴)

ایک فرانسیسی مصنف نے بھی کم و بیش انہی الفاظ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ

''یورپ پر ازمنہ وسطیٰ میں جو رنگ چھایا ہوا تھا وہ مسلمانوں سے نفرت کا رنگ تھا اور یہ نتیجہ تھا اس جنگ کا جو صدیوں تک ان کے خلاف لڑی گئی اور اس صدیوں کی نفرت سے صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا۔''(۱۵) ایک امریکی محقق اور دانشور ڈاکٹر جان ایل الیپوزیٹو، کا کہنا ہے کہ ''مغربی ذہن کے لیے اس عقیدے کو پوری طرح سمجھنا دشوار ہے کہ اسلام ایک مکمل طرز حیات ہے۔''(۱۶)

Marfat.com

مغربی اہل علم نے اسلام کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور اس میں سب سے زیادہ کردار مستشرقیت (۱۷) کا ہے۔ متذکرہ بالا مصنف مزید لکھتا ہے:

اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کے سلسلے میں مستشرقیت نے بھی بڑا حصہ لیا ہے۔ مستشرقین نے اسلامی علوم کے ضمن میں جو کام کیا ہے اس کا ہمیں یقیناً اعتراف کرنا چاہیے۔ انہوں نے ان مخطوطات کو جو عرصۂ دراز ہوا فراموش ہو چکے تھے جمع کیا۔ ان کی تدوین کی اور ان کے ترجمے کیے۔ ان کی ان کاوشوں ہی کے نتیجے میں اسلامی تاریخ اور روایات کی گراں قدر باقیات کی بازیابی ممکن ہوئی۔ تاہم بہت سے مستشرقین کی تحریروں میں اس وقت سنگین نوعیت کی دشواریاں پیدا ہوجاتی ہیں جب وہ اسلام کی تعبیر پیش کرنا شروع کردیتے ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا بہت ہی ضروری ہے کہ اٹھارویں صدی سے اب تک جتنے بھی مستشرقین پیدا ہوئے ہیں وہ مغربی نوآبادیاتی یہودی مسیحی مذہبی پس منظروں کی پیداوار تھے۔ اس پس منظر کا ایک جزو ثقافتی اور مذہبی تعصب بھی ہے جو خود کو تمام دوسری ثقافتی روایات سے افضل تر گردانتا رہا ہے۔" (۱۸)

ایک زمانہ تھا کہ اسلام، پیغمبر اسلام اور اہل اسلام کے لیے مستشرقین کا تعصب اپنی انتہا پر تھا۔ بعد میں بعض مستشرقین نے اپنے نظریات واقعتاً تبدیل کر لیے یہاں تک کہ بعض حلقہ بگوش اسلام بھی ہو گئے۔ مثلاً مارٹن لنگز (Martin Lings)، شن (Schun) اور حامد الگر (Hamid Algar) وغیرہ۔ مارٹن لنگز نے تو سیرتِ رسول پر ایک ضخیم کتاب: *Muhammad (His life based on the earliest sources)*, George Allen & Unwin, London 1983. اسلامی ابتدائی مآخذ کی روشنی میں لکھی۔

اسلام کے بارے میں مستشرقین کا رویہ ہر زمانے میں یکساں نہیں رہا۔ اسی لیے ان کے ہاں علم، تجربہ، اندازِ استدلال، مذہبی حیثیت اور وابستگی کے مختلف نمونے نظر آتے ہیں چنانچہ ان کے فکر و فن اور تحقیق و تالیف کا معیار بھی جدا جدا ہے۔ اپنے علمی تنوع کے باوجود اسلام، پیغمبر اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے حوالے سے ان کا رویہ ماسوا چند استثنائی مثالوں کے بہرحال معاندانہ رہا۔ بحیثیت مجموعی اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں مغرب کی معلومات انتہائی ناقص اور مبہم تھیں۔ اس خلا کو افسانہ طرازی اور دیومالائی کہانیوں سے پُر کیا گیا۔ (۱۹)

استثنائی مثالوں میں سے ایک ڈاکٹر ہنری اسٹب (Dr. Henry Stubbe) سترہویں صدی (۱۶۷۶ـ۱۶۳۱ء) کا مشہور مستشرق ہے۔ اس کی مشہور کتاب جو پہلے پہل لندن سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی: اس کا نام ہے: *An Account of the Rise and Progress of Mohammatanism*۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس کتاب کی کچھ غلطیاں نظرانداز کردی جائیں تو اسے

Marfat.com

سیرتِ رسولؐ پر ایک معقول اور معتدل تصنیف قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس نے انتہائی عالمانہ شان سے اقرار کیا کہ ''اس آسمان کے نیچے سوائے محمدؐ کے کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو تمام دنیائے انسانیت کی مرکزِ توجہ بنی ہو کہ اپنے تو اس پہ عقیدت کے پھول نچھاور کریں اور غیر اسے نگاہِ آتشیں سے دیکھیں۔ مشرق میں اسے سراہا گیا، لیکن مغرب نے التفات نہ کیا۔''(۲۰) کاؤنٹ ہنری دے بولین ڈیمیر نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ فلسفیانہ اور اخلاقی لحاظ سے اسلام عیسائیت سے برتر ہے۔(۲۱)

اسلام کے خلاف محاذ نام نہاد ''علمی و فکری'' تحقیقات اور مطالعات کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ ان مطالعات، کتابوں اور تجزیات کے ذریعے مغربی ذہنوں میں اسلام کے خلاف زہر بھرا جارہا ہے اور بتایا جارہا ہے کہ انسانی تہذیب کے لیے سب سے بڑا خطرہ اسلام ہی ہے۔ مسلمان ملکوں کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں اسلام کی جھلک میں اضافے کی خبریں مغرب میں ''احیائے اسلام'' اور اسلام کی پیش قدمی جیسے فقروں کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔ ایک جرمن خاتون نے ۱۹۹۵ء میں شائع ہونے والی کتاب *The Next Threat; Western Perceptions of Islam* میں شامل اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اسلام کو بالواسطہ اور بلاواسطہ بنیاد پرستی سے متواتر مطعون کیا جاتا ہے، اس کے بارے میں خوف پیدا کیا جاتا ہے کہ یہ مغربی تہذیب اور تمدن کے لیے خطرناک ہے اور اس طرح اسلام کے خلاف ایک محاذ اور ماحول پیدا کردیا جاتا ہے۔ مغرب میں اسلام کو وحشیانہ نظام بتایا جاتا ہے اور یہ کہ وہ جارحیت پسندی اور تعصبات سے بھرا ہوا ہے اور غیر منطقی، قدیم، پسماندہ اور عورتوں کے حقوق کا دشمن اور نسل پرست ہے۔(۲۲)

اسلام کے بارے میں مغرب کی اصل سوچ کیا ہے؟ مغربی تہذیب کے سب سے طاقتور نمائندے اور بزعم خود ''دنیا کی سپر پاور'' امریکہ کا ایک سابق صدر رچرڈ نکسن اپنی تصنیف *Seize the Moment* کے پانچویں باب *The Muslim World* میں لکھتا ہے:

> بہت سے امریکی عموماً تمام مسلمانوں کو جاہل، بدتہذیب، گندے، وحشی اور جھگڑالو لوگوں کے طور پر جانتے ہیں۔۔۔ دنیا میں کسی بھی قوم کے بارے میں اس قدر بُری رائے نہیں ہے، یہاں تک کہ کمیونسٹ چین کے بارے میں بھی ان کی رائے مسلمانوں کی نسبت قدرے بہتر ہے۔۔۔ امریکیوں کو صرف اس وجہ سے مسلمانوں کی طرف خاص توجہ دینی پڑتی ہے، کیونکہ ان میں سے کچھ مسلم ممالک کے پاس خوش قسمتی سے ایسے علاقے ہیں جن میں دنیا کے تیل کی دو تہائی دولت موجود ہے۔۔۔ دنیا بھر کے مسلمانوں میں صرف دو باتیں مشترک ہیں۔ ایک عقیدہ اور دوسری بات سیاسی افراتفری ہے۔
> بہت کم امریکیوں کو مسلم اقدار کی بلندی اور تاریخ کا علم ہے۔ وہ صرف جانتے ہیں کہ (نعوذ

Marfat.com

باللہ!) تلوار کے زور پر حضرت محمدؐ اور ان کے ساتھیوں نے مسلم عقیدے کو ایشیا، افریقہ حتیٰ کہ یورپ تک پہنچا دیا اور دوسرے مذاہب کو انہوں نے حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔وہ اس حقیقت کو نظرانداز کرتے ہیں کہ اسلام میں دہشت گردی کی کوئی جگہ نہیں ہے اور ابھی صرف تین صدیاں ہی گذری ہیں، جب عیسائی یورپ میں مذہبی جنگیں لڑ رہے تھے، یورپ قرونِ وسطیٰ میں پستی میں گرا ہوا تھا اور اسلامی معاشرہ اپنے سنہری دور سے گذر رہا تھا۔ مسلم دنیا نے سائنس، طب اور فلاسفی کے میدان میں بڑی ترقی کی۔ اپنی کتاب ''دی ایج آف فیتھ'' میں ول ڈیوراں نے لکھا ہے کہ اس دور میں ان شعبوں میں مسلمانوں نے بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ بوعلی سینا ادویات کا سب سے بڑا مصنف تھا۔ الرازی طب کا ماہر تھا، البیرونی کو جغرافیہ پر پورا عبور حاصل تھا، الہیثم آنکھوں کا ماہر تھا، جابر عظیم کیمیا دان تھا اور ابن رشد ماہر فلاسفر تھا۔ سائنس میں مشق کا طریقہ عرب مسلمانوں نے ایجاد کیا جیسا کہ ویل ڈیوراں نے لکھا ہے کہ جب راجر بیکن نے یورپ میں اس طریقہ کے موجد ہونے کا دعویٰ کیا تو جابر کو اس طریقہ کے متعلق بتائے ہوئے پانچ سو سال گذر گئے تھے۔ راجر کو رہنمائی اسپین کے موروں سے ملی تھی جن کو یہ تعلیم مسلمانوں نے دی تھی اور جب یورپ کے لیڈروں نے اپنے تعلیمی ارتقا کا دور شروع کیا تو مسلمانوں کے فراہم کردہ وسیع علم کے کاندھوں پر کھڑے تھے۔ (۲۴)

نکسن کا کہنا ہے کہ دنیائے اسلام ایک اہم تہذیب ہے جو اپنے سابق عروج کی تلاش میں ہے۔ اس کے علی الرغم، چاہے اس کی وجوہ سیاسی ہوں یا کچھ اور ایک حقیقت کا اعتراف برطانیہ کے شہزادے چارلس نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو آکسفورڈ یونیورسٹی کے علمی مطالعاتی مرکز میں اپنے صدارتی خطبے میں یوں کیا:

۔۔۔ ایک طرف تو مغرب میں اسلام کے بارے میں بہت ساری غلط فہمیاں ہیں اور دوسری طرف اس بارے میں بھی بہت زیادہ لاعلمی ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب و ثقافت پر اسلام کا کتنا احسان ہے۔ یہ ایک ایسی ناکامی ہے جو ہمیں ہمارے متعصبانہ تاریخی رویوں سے ورثے میں ملی ہے۔ وسطی ایشیا سے بحیرۂ اوقیانوس کے ساحلوں تک پھیلی ہوئی قدیم اسلامی دنیا میں عظیم دانشوروں، اہل علم اور اہل دانش نے حکمت کے پھول کھلائے لیکن ہم چونکہ اسلام کو مغرب کا دشمن تصور کرنے لگے ہیں، اس لیے اسے ایک اجنبی ثقافت، نامانوس معاشرہ، اور مختلف عقیدہ قرار دے کر ہم نے وہ تمام اثرات نظرانداز کر دیے جو اسلام نے ہمارے طرز زندگی اور ثقافت پر مرتب کیے تھے، مثلاً ہم نے آج تک آٹھویں اور پندرھویں صدی کے درمیانی عرصے میں آٹھ صدی کے اس عظیم ثقافتی ورثے کو صحیح طریقے سے درک ہی نہیں کیا جو مسلمانوں نے یورپ کے علاقے سپین میں چھوڑا تھا۔ قدیم علم و دانش کے تحفظ، زمانہ جہالت کے تہذیبی ورثے کی نگہداشت اور یورپ میں احیائے علوم کی تحریک پر مسلم اسپانیا کے مثبت اثرات کا ادراک اب کیا جانے لگا ہے؛ تاہم مسلم اسپانیا میں صرف یونانی فضل و دانش کی حفاظت ہی نہیں ہوئی بلکہ اسے آج کی ترقی میں استعمال کے قابل بھی بنایا گیا ہے۔ اسلام نے اسپانیا میں یونانی تمدن اور رومن تہذیب کو اس کے علمی ورثے سمیت جمع کیا، اسے جدید دور کی ضرورتیں مدنظر رکھ کر قابل استعمال بنایا اور اس تہذیب کو نئے دور کا مفہوم عطا کیا۔ مسلم اسپانیا میں بہت سے جدید علوم کو

Marfat.com

فروغ حاصل ہوا جن میں سائنس، ستارہ شناسی، نجوم، ریاضی، الجبرا جو خود عربی لفظ ہے، قانون، تاریخ، طب، ادویہ سازی، علم بصارت، زراعت، معماری، مذہب اور موسیقی وغیرہ شامل ہیں۔ مسلم اسپانیا میں مشرقی زمین کے ابن سینا اور ریز (رازی) کی طرح ایوروس (ابن رشد) اور ایونزور (ابن زہر) نے علم و دانش اور طب کے میدان میں وہ کارنامے انجام دیے جن سے صدیوں تک یورپ کے فضلا نے استفادہ کیا۔

اسلام نے حصول علم کے جذبے کو متعارف کرایا اور اس جذبے کی پرورش کی۔ پیغمبر اسلامؐ کی حدیث ہے: ''دانشور کے قلم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ قیمتی رکھتی ہے۔''

دسویں صدی میں قرطبہ یورپ کا سب سے مہذب شہر تھا۔ اسپین میں اس وقت کتب خانے قائم کیے گئے جب ہمارے ہاں کنگ الفریڈ علم الاغذیہ کو ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس زمانے میں قرطبہ کے حاکم کی ذاتی لائبریری میں چار لاکھ کتابیں موجود تھیں اور یہ تعداد پورے یورپ کی لائبریریوں کی کتابوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ تھی۔ یہ اس لیے ہوسکا کہ مسلمانوں نے چین سے کاغذ سازی کا علم اہل یورپ سے چار سو سال پہلے ہی حاصل کرلیا تھا۔ علم و دانش کے بہت سے میدان جن پر آج یورپ ناز کرتا ہے، مسلم اسپانیا کے راستے یورپ میں متعارف ہوئے۔ سفارت کاری، آزاد تجارت، کھلی سرحدیں، اکادمی تحقیق کی تکنیک، قدیم علوم کا مطالعہ، آداب زندگی، رسوم مجلس، فیشن، متبادل طب، شفاخانے، یہ سب شہروں کے شہر قرطبہ سے یورپ آئے۔

قدیم اسلام زبردست برداشت کا مذہب تھا۔ اس میں یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے اپنے طریقے سے عبادت کرنے کی وہ آزادی حاصل تھی جو بدقسمتی سے صدیوں بعد تک خود یورپ میں ناقابل تصور تھی۔

یہ بات حیرت ناک ہے کہ اسلام کو یورپ اور بلقان میں اتنے طویل عرصے تک پذیرائی حاصل رہی۔ اسلام نے اس خطے کے تمدن پر اتنے گہرے نقوش مرتب کیے مگر ہم ان کو اسلامی نقوش کے طور پر سمجھنے میں ناکام رہے اور آج بھی غلطی سے ان نقوش کو یورپی سمجھتے ہیں۔ اسلام ہمارے ماضی اور حال کا اہم حصہ ہے اور ہماری انسانی جدوجہد کا لازمہ ہے۔ اسلام نے جدید یورپ کے قیام میں مدد کی۔ اسلام ہمارے اپنے ورثے میں شامل ہے۔ اس سے الگ نہیں۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اس دنیا میں افہام و تفہیم سے زندگی گذارنے کے حوالے سے اسلام کا مرکزی خیال اس کائنات کا ابدی، الحاقی تصور ہے۔ اسلام میں انسان، قدرت، مذہب، سائنس، عقل اور عشق کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا گیا۔ اسلام نفس کے مابعدالطبیعیاتی اور اجتماعی تصور کو دنیا کے ایسے تصور سے مطابقت دیتا ہے۔ (۲۴)

چارلس کے خطبے کا ماحصل یہ تھا کہ ہم نے اسلام کو انتہا پسندی کا نام دے کر غلطی کی ہے۔ امریکی محقق اور دانشور ڈاکٹر جان ایل ایسپوزیٹو، کا کہنا ہے کہ اہل امریکہ کے اسلام کو سمجھ نہ پانے کے بہت سے اسباب ہیں۔ پہلے سبب کا تعلق مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات اور توسیع کے دور سے ہے۔ اسلامی دور کے پہلی صدی میں اسلام کا پھیلاؤ ایک بڑا مہتم بالشان واقعہ ہے۔ محض سو سال کے عرصے میں ایک اتنی بڑی سلطنت کبھی قائم نہیں ہوسکتی تھی اور مسیحی دنیا یہ

Marfat.com

محسوس کرنے لگی تھی کہ اس کی وجہ سے خود اس کا اپنا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ ایک ممتاز عیسائی ماہر دینیات نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اپنے ارتقا کی ابتدائی صدیوں میں مسیحیت بیرونی خیالات اور اثرات کو قبول کرلیتی تھی لیکن ساتویں یا آٹھویں صدی میں اسلام کی توسیع کے ردعمل کے طور پر عیسائی مذہب نے بیرونی اثرات کے دروازے اپنے اوپر بند کرلیے۔ اس بے اعتمادی میں صلیبی جنگوں کے باقی اثرات کی وجہ سے اور بھی اضافہ ہوگیا۔(۲۵)

امریکہ اور یورپ میں اسلام کو ایک بنیاد پرست، آمرانہ اور جاہلانہ مذہب کے طور پر پیش کیا جارہا ہے حالانکہ بنیاد پرستی ایک مغربی مفہوم ہے اور ایک مغالطہ آمیز کلمہ ہے۔

سوویت یونین کی شکست، سرد جنگ کے خاتمے اور نیوورلڈ آرڈر کے قیام کو مغربی تہذیب کی نمایاں کامیابیوں اور کامرانیوں میں شمار کیا جارہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مغرب کے کارناموں نے بھی اس کا سر اونچا کردیا ہے۔ ان تمام باتوں نے اہل مغرب کو اپنی تہذیب کی برتری اور پائیداری کا احساس عطا کیا۔ ان کا خیال ہے کہ اس تہذیب کو کبھی زوال نہیں آئے گا۔

مغرب اور خصوصاً امریکہ کے احساس برتری کی تازہ ترین مظہر امریکی محکمہ خارجہ کے ایک منصوبہ ساز افسر فوکویاما نے اپنی کتاب *The End of History and the Last Man* میں جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی، لکھا کہ اسلام کی ثقافتی فتوحات کے دن بیت چکے۔ فوکویاما نے مغربی تہذیب کو تاریخ کا نقطۂ انتہا قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ تہذیب کا مغربی ماڈل اپنے اندر اتنی خوبیاں رکھتا ہے کہ وہ ساری دنیا پر چھا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں ایک خطرہ بھی درپیش ہے۔ امریکہ ہی ایک پروفیسر سیموئل پی ہن ٹنگ ٹن نے ۴۰۰ صفحات پر مشتمل تہذیبوں کا تصادم نامی کتاب میں تہذیبوں کے درمیان تصادم کے امکان کی پیش بینی کرتے ہوئے لکھا کہ مغربی تہذیب کو صرف اسلام سے خطرہ ہوسکتا ہے۔ اس کتاب نے فکری اور ابلاغی دنیا کو متاثر کرنے کے علاوہ مغرب کی اسلام سے متعلق پالیسیوں پر بھی اثر ڈالا اور اسلام کے خلاف ایک فضا تیار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ مغرب اور اسلام کے درمیان تصادم کو ایک حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں مغرب اور اسلام کا تصادم ایک ناگزیر حقیقت ہے کیونکہ یہ دونوں الگ الگ تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس لیے اسلام کو مغرب کے لیے ایک چیلنج کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے خیال میں یورپ کی سرد جنگ اب تہذیبوں کے درمیان (اسلام اور مغرب) گرم جنگ کی صورت اختیار کرتی نظر آرہی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

Marfat.com

ان چھپن ریاستوں کو نہیں بھولنا چاہیے جو بے شک الگ الگ تاریخ، جغرافیہ، زبان، ثقافت اور تمدنی روایات رکھتی ہیں لیکن اسلام کی رسی میں بندھ کر بلائے جان بن سکتی ہیں۔

وہ امریکہ کو مشورہ دیتا ہے کہ مغربی تہذیب کے تحفظ اور اس کے عرصۂ زوال کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کے لیے یورپ کے ساتھ سیاسی، معاشی اور عسکری روابط کو وسعت دے اور مسلم ملکوں اور چین کی روایتی اور غیر روایتی فوجی طاقت کی ترقی میں ہر ممکن طریقے سے رکاوٹیں ڈالے۔(۲۶)

بدقسمتی سے مغرب میں دانشوروں کا ایک بڑا گروہ ایسا ہے جو اسلام کو غلط رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور اپنے سرپرستوں کے مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے اسلام کو تواتر کے ساتھ بدنام کررہا ہے۔ انہوں نے اسلام کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لیے بہت ادارے کھول رکھے ہیں اور وہ اپنے آپ کو اسلام کے خلاف فکری جنگ کا ہراول دستہ سمجھتے ہیں۔ اس دانشور گروہ میں نام نہاد ماہرین اسلام اور مستشرقین شامل ہیں۔ انہی میں ایک برنارڈ لیوس بھی ہے جو تاریخِ اسلام کے ماہر ہونے کا دعوے دار ہے اور اس کی یہ حیثیت مغرب میں تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کی اسلام اور تاریخ اسلام پر تصانیف مغرب میں مقبول ہیں اور وہ اسلام سے نفرت کے کارخانے کا اہم فرد ہے جو ۱۱ ستمبر کے بعد مغرب میں قائم کیا گیا ہے۔ اس کی کتاب The Crises of Islam, Holy War and Unholy Terror(2003) میں اسلام کو نسل پرست، دہشت گرد، شر اور فساد کا منبع قرار دیا گیا ہے۔ اس کی کتابیں اور تحریریں ذرائع ابلاغ میں کثرت سے استعمال کی جاتی ہیں۔(۲۷)

مغرب کی سوچ کے برعکس اسلام بلاشبہ دینِ انسانیت اور آفاقی تہذیب کا حامل ہے۔ ایک مفکر کا قول ہے کہ اصل تہذیب یہ ہے کہ انسان، ملتوں اور جماعتوں کے تعصبات سے بلند تر ہوسکے۔ اسلام کے نزدیک بنی نوع انسان، بقول شیخ سعدیؒ ایک ہی بدن کے اعضا ہیں۔ کیونکہ وہ تخلیق اور پیدائش میں ایک ہی گوہر سے ہیں:(۲۸)

بنی آدم اعضای یک پیکرند
کہ در آفرینش ز یک گوہرند

مغرب کا سارا زعم اور طاقت اصل میں اس کے علم وفن اور حکمت و ہنر میں پوشیدہ ہے اور یہ علوم وفنون اور سائنس و ٹیکنالوجی مسلمانوں ہی کی گمشدہ میراث ہے۔ اس لیے ہمیں بقول علامہ اقبال مغربی تہذیب و معاشرت کے سامراجی اور استحصالی کردار کے خارجی مظاہر سے بے نیاز ہوکر اس کی باطنی حرکی روح سے دوستی کرنا ہوگی۔ مغربی علم و حکمت سے اکتساب گویا

Marfat.com

اپنی ہی آتش رفتہ کا سراغ پانے اور اپنے ہی کھوئے ہوئے معیار و اقدار کا سراغ لگانے کا عمل ہے۔ مغرب نے علم و حکمت اور سائنس و ٹیکنالوجی کے چراغ ہم مسلمانوں ہی کی آگ سے روشن کیے ہیں:

قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمین آتش چراغش روشن است

حوالے

۱۔الفرڈ ویبر، تاریخ فلسفہ، مترجم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶۴

۲۔Drapier, *History of the Intellectual Development of Europe*, p. 30

۳۔مسلمانوں کی ریاضیاتی عبقریت، از شبیر احمد خاں، مشمولہ سہ ماہی مجلہ اقبال، بزم اقبال، لاہور، جلد ۱۳، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۶۵ء، ص ۱۰۰

۴۔ایضاً، ص ۱۰۱

۵۔ایضاً، ص ۸۷

۶۔ایضاً، ص ۹۹

۷۔Thilly, *History of Philosphy*, p. 163

۸۔Drapier, History of The Intellectual Development of Europe, Book II p. 57

۹۔اولیور لی بین، رٹلج، ہسٹری آف ورلڈ فلاسفی، جلد دوم، ص ۱۰۲۱

۱۰۔ریاضیاتی سائنس، (مقالہ) از ایچ جے جے ونٹر اردو ترجمہ: پروفیسر خادم علی ہاشمی، مشمولہ سیارہ ڈائجسٹ " چودہ صدیاں نمبر، جلد ۳۴، شمارہ ۲ فروری، مارچ ۱۹۸۱ء، ص ۳۶۸

۱۱۔رومر ٹیلر، ایڈیٹر *Voice Across Boundries* بحوالہ سہ ماہی پیغام آشنا " اسلام آباد، شمارہ ۱۸، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۴، ص ۱۴

۱۲۔اسلام اور عربی تمدن، ترجمہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۲۲۲

۱۳۔ڈاکٹر گستاؤ لی بان، تمدن عرب، اردو ترجمہ ڈاکٹر سید علی بلگرامی، مطبوعہ حیدر آباد دکن

۱۴۔Aldobrandino Malvezzi, *L'Islamismo e la Cultura Europea Firenze*, 1956, pp. 4-5

۱۵۔Pierre Martino, *L'Orient dans la Literarture Francasie au xvii et xviii slecte*, Paris, 1906, p.5

۱۶۔ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک (پشاور)، جلد ۱۶، شمارہ ۶، مارچ ۱۹۸۱ء، ص ۱۶

۱۷۔☆ استشراق (Oriantalism) اور مستشرق (Orantialist) کی اصطلاحیں زیادہ قدیم العہد نہیں۔

Marfat.com

انگریزی زبان و ادب میں ان کا استعمال اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہوا۔ اس سے مراد وہ یورپی عالم ہے جو مشرقی زبانوں، علوم وفنون، آداب و ثقافت اور تہذیب وتمدن وغیرہ پر عبور رکھتا ہو۔ صلیبی جنگوں کو اگر ہم تحریکِ استشراق کا فوری سبب قرار دیں تو غلط نہ ہوگا۔ ۱۰۹۶ سے ۱۲۹۲ء تک کے معرکہ ہائے صلیب و ہلال کے نتائج ارباب کلیسا کے حق میں اچھے نہ نکلے۔ اس لیے انہوں نے عسکری محاذ پر شکست کھانے کے بعد گویا یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے علمی وفکری محاذ کو منظم کیا جائے۔ یہی فیصلہ بالآخر تحریکِ استشراق کی شکل میں سامنے آیا۔۔۔ چنانچہ تحریکِ استشراق کی صورت میں اہل یورپ اور ارباب کلیسا کی تمنائیں پوری ہوئیں اور اس طرح تحریکِ استشراق کے جلو میں دنیائے مغرب کا یہ منظم حملہ، واقعتاً عسکری محاذ پر ان کی صلیبی حملوں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ یہ جماعت اپنی اصل ونسل میں یہودی یا عیسائی ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اسلام اور یہودیت اور عیسائیت کے مابین آویزش کے ساتھ ہی استشراقی جذبہ کی نمو ہوگئی تھی۔ شکوک و شبہات پیدا کرنا، مستشرقین کی حکمتِ علمی کا مستقل لازمی حصہ رہا ہے کیونکہ اس جہت سے یہ گنجائش باقی رہتی ہے کہ معصوم الذہن لوگ اور وہ افراد جن کا علم و مطالعہ راسخ نہیں ان کے پروپیگنڈے سے بآسانی منفعل ومتاثر ہوں۔(**مستشرقین اور مطالعہ سیرت**، از ڈاکٹر نثار احمد، مشمولہ **نقوش** ۱۱، شمارہ ۱۳۰، جنوری ۱۹۸۵ء، ص ۴۹۳ تا ۵۳۱) بقول ایڈورڈ سعید یہ *Orientalists- cum- Imperial agents* (*Orientalism*, p: 197) یعنی شہنشاہیت کے گماشتے ہیں۔

۱۸۔ماہنامہ *الحق*، محولہ بالا، ص ۱۴

۱۹۔*مستشرقین اور مطالعہ سیرت*، از ڈاکٹر نثار احمد، مشمولہ *نقوش*، ص ۴۹۸

۲۰۔Dr. Henry Stubbe, *An Account of the Rise and Progress of Mohammatanism*, London, 1911, p. 211

۲۱۔Heinz Herz, *Morgenland*, Leipzig, 1963,p. 234

۲۲۔*اسلام اور مغرب*، از محمد عباس، مشمولہ *پیغام آشنا* اسلام آباد، شمارہ ۱۹، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۴، ص ۴

۲۳۔ماہنامہ *محافظ*، لاہور، جلد ۲، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۹۳ء، ص ۶۲۔۶۱

۲۴۔اسلام اور مغرب، شہزادہ چارلس کا علمی مطالعاتی مرکز آکسفورڈ میں ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء دیا گیا خطبہ/اردو ترجمہ: ڈاکٹر یاسین رضوی، مطبوعہ ماہنامہ *قومی ڈائجسٹ*، لاہور، جلد ۱۶، شمارہ ۱۰، مارچ ۱۹۹۴ء، ص ۱۰۱۔۱۰۰

۲۵۔ماہنامہ *الحق*، محولہ بالا، ص ۱۵

۲۶۔Samuel P. Huntington, *The Clash of Civilizations and the Remarking of World Order*, Penguin Books, 1996. pp. 209, 217

۲۷۔*اسلام اور مغرب*، از محمد عباس، محولہ بالا، ص ۱

۲۸۔شیخ سعدی، *کلیات سعدی*، از نسخہ فروغی، انتشارات علمی، گلستان، ص ۱۸

☆☆☆

Marfat.com

جدید دور میں اسلام کو درپیش چیلنج ☆

بروس واٹسن ☆☆

آج کل اسلام اندرونی اور بیرونی چیلنجوں سے دوچار ہے۔ سب سے بڑی مشکل اسلام کے اندرونی اصولی اختلافات ہیں۔ بیرونی دنیا کا رائج طرزِ عمل اور تنقید اگرچہ غلط ہے یا دشمنی پر مبنی ہے، اسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے مگر اسلام کے اندر موجود اختلافات کا دنیا بھر میں مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

ایک سادہ جغرافیائی مفہوم میں اسلام اس بات پر مجبور ہے کہ اپنے تغیر پذیر مراکز کے ساتھ جنگ کرے۔ مذہبی مراکز اسلام کے حیاتی مراکز کی نشان دہی کرتے ہیں۔ کویت، عراق، متحدہ عرب امارات، ایران اور یمن کی مجموعی آمدنی سعودی عرب کی تیل سے حاصل ہونے والی دولت کے قریب ہے مگر یہ دولت محدود وسائل پر منحصر ہے اور آئندہ سالوں میں اقتصادی مرکز ان اسلامی علاقوں میں منتقل ہوجائے گا جو ہمیشہ مرکز رہے ہیں اور جن میں پیداواری دولت موجود ہے۔ مغربی ممالک کی ایشیا میں سرمایہ کاریاں اس مشکل کی گذشتہ دور سے اب تک تائید کرتی ہیں۔ اگرچہ یہ سرمایہ کاریاں زیادہ تر مغربی اور غیر اسلامی بنیادوں پر ہیں۔ قاہرہ میں الجامعۃ الازہر جو اسلام کا فکری، روحانی مرکز مانا جاتا ہے اس کے تعلیمی افکار اور نقطہ ہائے نظر امت اسلامی اور عالم اسلام کے زیادہ آبادی والے مراکز یعنی انڈونیشیا، پاکستان، بنگلہ دیش، بھارت اور ملیشیا میں پھیل جاتے ہیں۔ مختلف مراکز کی طاقت بدلتی رہتی ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اہم اسلامی مراکز کے موافقانہ یا مخالفانہ دعوے جو ان سے وابستہ نسبتاً کم اہم مسلمان معاشروں کی طرف سے سامنے آتے ہیں ماضی کے اختلافات کو ابھاریں گے اور اسلام کے روایتی مرکز پر اس سے وابستہ آزادی پسند، فعال اور اختلاف کرنے والے مسلمانوں کا دباؤ بڑھے گا۔

مسلمان اگرچہ مطلوب و معقول مادی زندگی کے نصب العین کی تبلیغ کرتے ہیں لیکن

☆ ترجمہ فارسی از رامین گلکانی، بشکریہ مجلۂ مشکوۃ، شمارہ ۶۶، ۱۳۶۹ش

☆☆ نیو انگلینڈ یونیورسٹی، آرمیڈیل، آسٹریلیا

Marfat.com

اس کے باوجود اکثر مسلمانوں کی زندگی کسی بھی معیار پر پوری نہیں اترتی۔ تیل پیدا کرنے والے دولت مند مسلمان ملکوں میں اس معاملے میں تضاد زیادہ آشکار ہے۔ مثالیت پسندی کے حوالے سے عدالت اور بھائی چارے پر زور تو دیا جاتا ہے تاہم ان ملکوں میں دولت مندوں کی حد سے زیادہ مصرف پسندی، بے پناہ دولت خرچ کر کے فوجی ٹیکنالوجی اور اسلحے کی خریداری اور فلسطین، پاکستان، فلپائن وغیرہ سے آئے ہوئے مسلمان دوست مہمان ہنرمندوں سے بہرہ برداری دکھائی دیتی ہے۔ یہ لوگ خلیج کی جنگ میں اور بعدازاں ۹۱-۱۹۹۰ میں واضح طور پر مشکلات کا شکار رہے ہیں۔ اگر امت اسلامی کو ایک ہمہ گیر عالمی قوت میں تبدیل ہونا ہے تو شہروں کی طرف بے ہنگم انتقال آبادی، عوام کی بے روزگاری اور غیر متوازن ترقی جیسے سب امور کا تجزیہ کرنا ہوگا اور امت اسلامی کو جلد ان مسائل پر قابو پانا ہوگا۔ مسلمان معاشروں میں دولت اور آمدنی کی بڑے پیمانے پر غیر مساویانہ تقسیم کا عالم یہ ہے کہ تقسیم کے اس طرز عمل میں موثر تبدیلی بعید نظر آتی ہے۔

انتہا پسندوں نے بدامنی کی جو صورت پیدا کر رکھی ہے اور مالی معاملات (جن میں سود کی حرمت بھی شامل ہے) میں حائل فقہی احکام کی وجہ سے سرمایہ کاروں میں سرمایہ کاری کے لیے کوئی رغبت نہیں، یہاں تک کہ مسلمان سرمایہ کار بھی ترجیح دیتے ہیں کہ وہ اپنا سرمایہ مغربی اقتصادی نظاموں کے حوالے کردیں، جہاں اجتماعی سیاسی حالات میں زیادہ استحکام ہے اور انہیں زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

دوسری طرف جہاں لوگ اپنے معاشرے کی مدد کرنا چاہتے ہیں انہیں زیادہ تر وسائل کی کمی کی مشکلات درپیش ہیں۔ بنگلہ دیش کا گرامن بینک بہت کم مقدار میں قرضہ دیتا ہے اور وہ بھی زیادہ تر دیہاتی عورتوں کو تاکہ وہ چھوٹے چھوٹے کام کرسکیں اور بعض عورتیں گروہی شکل میں بھی کام کرتی ہیں۔

ان قرضوں کا میزانیہ بہت کم ہے اور ان کا ایک مقرر سود ہوتا ہے۔ پہلے اصل زر واپس کیا جاتا ہے اور اصل زر نکال کر سود کا حساب کیا جاتا ہے۔ اگرچہ سال میں ۲۰ فیصد سود زیادہ معلوم ہوتا ہے تاہم ماہانہ ۲۰ فیصد اور روزانہ ۱۰ فیصد جو روایتی قرض دار ادا کرتے ہیں اور بنگلہ دیش کے تجارتی بینک جو سود لیتے ہیں وہ اس کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ گرامن بینک ایسے افراد کو قرض دیتا ہے جو رائج تجارتی مفہوم میں شرائط ہی پوری نہیں کرتے۔ لوگوں کی صرف اتنی مدد کی جاتی ہے کہ وہ اپنی ابتدائی ضروریات پوری کرلیں۔ گرامن بینک اپنے کھاتہ داروں کی توجہ حاصل کرتے ہوئے انہیں یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ بینک کے

Marfat.com

بارے میں مثبت رائے اور حسن نیت رکھ سکیں۔ یہ روش تقریباً ۹۸ فیصد موثر ثابت ہوئی ہے۔ بینک کو ایک طرف روایتی طور پر قرض دینے والے اور تجارتی بینکوں کا مقابلہ ہے جو دعوی کرتے ہیں کہ یہ منصوبہ اس سے کہیں چھوٹا ہے کہ بنگلہ دیش کی اقتصادی ترقی کا موجب بن سکے اور دوسری طرف اسے ان مسلمانوں کا سامنا ہے جو اس منصوبے کو دیہات میں عورتوں کی آزادی کا موجب سمجھتے ہیں۔ اس بینک نے ایک حد تک اسلامی سوچ کے اہداف کو ملحوظ رکھا ہے تاہم اسے ان گروہوں کے اعتراضات کا سامنا ہے جو فقط اپنی سوچ کو اسلامی روش کے طور پر قبول کرتے ہیں۔

اقتصادی بدحالی اور غیر مساوی مواقع احتجاج اور مخالفت کے لیے زمین ہموار کرتے ہیں۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اکثر مسلمان حکومتیں عام تعلیم کی ضروریات پوری کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ اصولاً جدیدیت سے بچا نہیں جاسکتا۔(۱) آج کی دنیا میں جدیدیت عاقلانہ اور پوری طرح قابل برداشت زندگی گذارنے کا ناگزیر راستہ ہے۔ جدید ہونے کا مطلب مغربی ہونا نہیں۔ البتہ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی علم معرفت میں بعض غیر مذہبی علوم کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ ڈاکٹر مہاتیر محمد نے یہ نکتہ پالیا ہے کہ دینی و غیر دینی علوم میں کوئی فاصلہ نہیں ہے کیونکہ اسلام تمام علوم پر محیط اور انسانی زندگی کے تمام مسائل کا جواب دہ ہے۔ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ ڈاکٹر مہاتیر محمد جیسے ایک اہم اور کامیاب مسلمان رہنما کو ایک حساس راستے پر قدم رکھنا چاہیے۔ ایک طرف آزادی اور ہر ممکن زیادہ علم حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو نقطۂ نظر میں ترقی پر زور دینا چاہیے، دوسری طرف اسے اسلام میں علم کی اہمیت پر زور دینا چاہیے اور دین کی حمایت کرتے ہوئے روایتی اختلافات میں کمی کرنا چاہیے۔ روشن فکر مسلمانوں کو یہ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے کہ آج کی دنیا میں مسلمان ہونے سے کیا مراد ہے، لیکن وہ اہل مغرب کی ان رپورٹوں کی اہمیت کی طرف متوجہ نہیں ہوئے جو انتہا پسند مسلمانوں کے بارے میں آئی ہیں۔

مغربی ذرائع ابلاغ پرسکون مگر گہرے موضوعات کی نسبت تشدد اور ہیجان کے بارے میں بات کرنے کے زیادہ مشتاق ہیں یعنی معنوی اقدار کے بارے میں ایسے موضوعات جو مغربی معاشروں کی فتنہ انگیز شخصیت پرستی کے باوجود اپنے اندر اب بھی انسانیت کا جوہر رکھتے ہیں۔ مسلمان روشن فکر نہ فقط اپنے معاشروں کے روایتی عناصر کے دباؤ کا شکار ہیں بلکہ مغرب کی جس حمایت اور قدردانی کا حق رکھتے ہیں، وہ اس سے بھی محروم ہیں۔ ان سب کے باوجود مسلمان رہنماؤں کو چاہیے کہ اس سطح کی تحقیق اور نظرثانی کے ذریعے اپنے معاشروں میں تعمیر نو

Marfat.com

کو ایک عوامی یقین کی صورت میں قبول کروائیں۔ اجتہاد کے دوبارہ احیا سے مبانی اسلام کی دوبارہ تفسیر ہوگی اور انتقاد پذیری کے اخلاقی اصولوں کی حفاظت ہوسکے گی اور اس کے ساتھ ساتھ پورے عالم اسلام میں روایتی مسلمان حکمرانوں نے جن کچھ مشکوک چیزوں کا اضافہ کردیا ہے ان کی اصلاح بھی ہوجائے گی۔

سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کے مظاہر قبول کیے جانے کے قابل ہیں۔ البتہ مغرب کے ایسے مظاہر سے دور رہنا ضروری ہے جو عالم اسلام کو محض مغرب کا دست نگر بنا دیں۔ اس مقام پر ایک بنیادی رکاوٹ اور مشکل یہ ہے کہ کونسی چیز مغربی معاشروں کو خرابی کی طرف کھینچتی ہے؟ کیا جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ اور اس پر انحصار افکار کو تبدیل کرسکتا ہے، خواہشات کو بدل سکتا ہے اور اجتماعی تغیرات کو لاگو کرسکتا ہے؟ کیا جو افراد جدید ٹیکنالوجی کو ایجاد کرتے ہیں یا اس کا نظام چلاتے ہیں وہ اہم دینی افراد میں سے ہیں؟ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہر مظہر عینی اور طبعی خصوصیات سے زیادہ مسائل پیدا کرتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی یہ سوالات بھی پیدا کرتی ہے کہ اس ٹیکنالوجی کو کیسے استعمال کیا جائے اور اس پر کس طرح کی نگرانی رکھی جائے؟ نیز وضع شدہ قوانین کا اجرا کس کے ذمے ہو؟ ان اصولی سوالات کا جواب صرف غیرمذہبی عہدیدار نہیں دے سکتے کیونکہ منفعت اندیشی پر مبنی مباحث شماریاتی کمیتوں پر تمام ہوتے ہیں نہ کہ کیفیت کی ترجیحات پر۔

مسلمان اگر عالم مغرب کے افکار پر کافی حد تک تنقید نہ کریں اور مسائل کو قطعی تصور کرلیں تو انہیں بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان ملکوں میں اسلامی معیارات کی روشنی میں انتقادی اصولوں سے استفادے میں توسیع ہونی چاہیے۔ تنقید پذیری کی قابلیت میں اضافے کے بغیر مسلمان اس خطرے سے دوچار ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں: ''فکری و روحانی مسائل میں اسلام کا نقطہ نظر نسبی ہے اور کسی نہ کسی طریقے سے جدید الٰہیات کے ذریعے اس کی تکمیل کی جانا چاہیے۔ اس صورت میں وہ نظریہ جس کے مطابق اسلام آزاد ہے اور اس میں تمام علوم موجود ہیں معتبر نہیں رہتا اور لاشعوری طور پر جدید الٰہیات سے تکمیل پانے والے اسلام کے نظریے کا اصول قائم ہوجاتا ہے۔ جو شخص اصول اسلامی سے آشنائی رکھتا ہے اس امر کی طرف متوجہ ہے کہ اسلام کے بارے میں یوں سمجھنا تنزل یا ایسے نظام فکر سے اسلام کی وابستگی ہے جس کا گاہے اسلام سے تضاد بھی پیدا ہوتا ہے۔''(۲)

اصلی خطرہ اس وقت شدید ہوجائے گا جب مسلمان انتہا پسند اہل مذہب کے نقطۂ نظر کو دیگر نظریات پر ترجیح دیں گے اور ''تیسرے راستے'' کی بنیاد رکھنے پر اصرار کریں گے۔

Marfat.com

اگر مغرب کی ہر چیز کو ایک طرف کر دیا جائے تو اس صورت میں اسلامی روایات کی خالصیت اور تخلیقی و تعمیری صلاحیت ایک بار پھر ٹھہر جائے گی۔ کیا اسلام کی تجدید حیات سے ایک مرتبہ پھر غربت، بھوک، بیماری اور ناخواندگی کی طرف کافی توجہ کا چیلنج درپیش ہوگا؟ کیا اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے حامی اپنے ادعا سے صرف نظر کریں گے یا وہ اب بھی اس نظریے کے وفادار ہیں جبکہ تعلیم و تربیت، سائنس اور ٹیکنالوجی، سیاست و حکومت، ایڈمنسٹریشن اور اقتصاد کے بارے میں ان دعووں کی اسلام کے پسندیدہ احکام میں تاکید کی گئی ہے۔ اسلام پسندوں کا ذہن کسی حد تک علامات اور رسم و رواج کی طرف مائل ہے۔ کیا وہ قوانین وضوابط کے بارے میں مستقیم یا خالص نظریہ رکھتے ہیں؟ کیا معاشرے میں عورتوں کے کردار اور مسلمان معاشروں میں اقلیتوں کی حیثیت کے بارے میں انتہا پسندوں کے نظریات اور قرآن و سنت کے اصولوں کے مابین کوئی اختلاف ہے؟ کیا شدت پسندوں کی نظر میں زندگی کے تمام پہلوؤں میں اصلاحات قبول کرنے کے حوالے سے یہی ایک مشکل ہے کہ روحِ قرآن سے خیانت کی جا رہی ہے؟ کیا شدت پسندوں کی کوششوں اور اسلام کے بارے میں تنگ نظری پر مبنی اپنے فہم و اصرار کا نتیجہ امتِ مسلمہ میں فرقہ واریت کے پھیلاؤ کی صورت میں نکلتا ہے؟ کیا شدت پسندوں کے نظریات گروہ بندی اور امت میں تقسیم میں مدد نہیں کرتے؟(۳)

اصلی سوال مسئلے کے بطن میں موجود ہے۔ فضل الرحمٰن نے بالکل یہی رائے قبول کی ہے۔ پہلے مرحلے میں اسلام کی ضرورت ایسے قوی مفکرین ہیں جو عصر حاضر کے علوم اور ترقیات سے استفادہ کرتے ہوں اور قدیمی متون اور روایات پر پھر سے نظر ڈال سکیں۔(۴)

آیا وہ جدت پسند جو مغربی انداز زندگی اپنائے بغیر جدت اختیار کرنا چاہتے ہیں اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو عملی جامہ پہنانے کی امید رکھ سکتے ہیں؟ مغربی معاشروں کے موجودہ شواہد سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جدت نے اپنی ٹیکنالوجی کی تمام ترقیوں کے ساتھ روایتی احکام پر دباؤ ڈالنے اور جدید اخلاقی نظام کی بنیادیں قائم کرنے کے ذریعے اصولی طور پر روایتی قدروں کو متغیر کر دیا ہے۔

کنٹرول نہ ہوسکنے والی اقتصادی ترقی کے افسوسناک نتائج نکلے ہیں، مثلاً صارفیت، خودغرضی، ناجائز دولت، خواہشات میں اضافہ، جنسی تعلقات کی بے لگامی، خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ، اصولی طور پر آزاد بے راہ رو الیکٹرانک میڈیا، غیر ملکیوں اور بیرونی اقدار کی یورش، سائنسی مادیت، جدید ٹیکنالوجی اور وسیع پیمانے پر دین گریز رجحانات۔(۵)

کیا اسلام وسعت پذیر غیرمذہبی دنیا میں ایک جدید معاشرہ ایجاد کرسکتا ہے؟ مغرب

Marfat.com

کی لادینی سیاست کا انحصار اس نظریے پر ہے کہ حاکمیت ان افراد کے ہاتھ میں ہے جو ان کی حکومتوں کو جمہوریت کی توسیع اور آزاد انتخابات کے ذریعے تشکیل دیتے ہیں جبکہ اس کے مقابل اسلام کا نظریہ اپنے پہلے مفہوم میں یہ ہے کہ حکومت فقط اللہ کی ہے اور مشروع دنیاوی حکومت کا جواز فقط اس حد کے اندر تک ہے کہ وہ اللہ اور شریعتِ مقدس کی خواہش کو عملی شکل دیتی ہو۔

اس نظریے کے مدعیان کے دعوؤں کے علی الرغم حقیقت یہ ہے کہ حکومتوں کو چاہیے کہ وہ اخلاقی اصول و قوانین کے تحت اجتماعی رفاہ کو وسعت دیں جبکہ اگر اخلاقی ضوابط خود فرقہ وارانہ اختلافات کا موضوع ہوں تو مشکل دوچند ہو جاتی ہے: قرآن و سنت کی رائج اور غیر رائج تفہیمات کے مابین اختلاف۔ ہم پھر پوچھتے ہیں: اسلام کس کا ہے؟ اسلام کیا ہے؟ اسلام کہاں ہے اور کس زمانے سے مربوط ہے؟ جو چیز مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ جن ممالک میں اسلام سیاسی نظام میں ایک آئیڈیالوجی کے طور پر توجہ کا مرکز ہے (مثلاً سعودی عرب، سوڈان، پاکستان، ایران، افغانستان انہوں نے داخلی کشمکشوں یا اپنے (مسلمان یا غیر مسلم ہمسایوں) سے اختلافات میں بہت ہی کمی کی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان ممالک میں دولت یا بڑے اقتصادی وسائل کی عادلانہ تقسیم یا ایسی رفاہ عامہ کہ جس سے ملک کی ساری آبادی بہرہ مند ہوتی ہو کے شواہد کم ہی دکھائی دیتے ہیں اور اسلام جس رفاہ عامہ کا ذکر کرتا ہے اس نے عملی صورت اختیار نہیں کی۔ بعض مسلمان معاشرے جن میں لادینی سیاسی آئیڈیالوجی پر زور دیا جاتا ہے (جیسے ترکی اور مصر) رفاہ عامہ کچھ ہی بہتر ہے، اگرچہ وہاں عقیدہ و عمل کی آزادی زیادہ ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت حکومتوں کے زیر نظر نسبتاً لادینی آئیڈیالوجی کو قبول کیے ہوئے زندگی گذار رہے ہیں۔ ان ممالک نے نئی سیاست کے لیے مغربی ماڈل کے اجتماعی ادارے بنائے ہیں اور انہیں اسلامی ماہیت بھی دی ہے۔(۶) رہے باقی ماندہ مسائل جیسے اسلام کا نظریہ اخلاق کے تمام اصولوں اور عمومی نظام کے بارے میں کیا ہے؟ کس قسم کے اداروں کو بداخلاقیوں اور عوامی اخلاق کی تعریف، تمیز اور تنظیم کی ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے؟ جو مسلمان اس نظریے کے حامی ہیں کہ آج بھی اللہ کی طرف سے جامع اور قطعی راہ موجود ہے ان سے موافقت اور مخالفت کے لیے کن موضوعات کو پیش کیا جاسکتا ہے؟ البتہ ایسے موضوعات میں حقیقی مسلمانوں اور ایسے افراد میں فرق روا رکھنا چاہیے جو مذہبی علامات سے فقط اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لیے استفادہ کرتے ہیں۔

سیاسی اسلام اپنے اس پیغام اور بیان کے ساتھ چیلنج کا سامنا کرتے ہوئے تنقید کو

Marfat.com

قبول کرتا ہے، امور کو اسلامی معیارات پر منطبق کرتا ہے اور جن اصولوں کا حامی ہے اور دوسروں سے بھی جس کا تقاضا کرتا ہے، ان سے ہم آہنگی کو دیکھتا ہے نیز حکومتیں اور اسلام کا دعویٰ رکھنے والی تحریکیں جن انتہا پسندانہ کاموں کا ارتکاب کرتی ہیں ان سے اجتناب کرتا ہے اور مسلمان معاشروں کے انحطاط میں حصہ دار ہونے کی ذمہ داری کو قبول کرتا ہے نہ یہ کہ ساری مشکلات کا ذمہ دار صرف مغرب کو قرار دے دیتا ہے۔(۷) ایک بنیادی سوال یہ ہوگا:

اسلامی حکومتوں کا طرزِ عمل اپنی اقلیتوں سے کیا ہے اور دوسرے ملکوں میں مسلمان اقلیتوں کا طرز عمل کیسا ہے؟ دور حاضر میں اسلام کی سیاسی آئیڈیالوجی ایک کثیرالمذہبی معاشرے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی یکساں طور پر سرپرستی اور حفاظت نہیں کرسکتی۔(۸) صرف برداشت

کرنا کافی نہیں بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ شہری حقوق اور تمام مذاہب کے پیروکاروں کے مرد و زن کی تمیز کے بغیر غیر مشروط طور پر مساوی ہونے کی حقیقت کا ادراک کیا جائے۔ سیاسی مخالفت، تاجروں کی یونینوں اور ذرائع ابلاغ کے کردار اور تاثیر کا قانونی اور اجتماعی امور کے حوالے سے بار دیگر جائزہ لیا جائے اور فرد کی خواہشات اور معاشرہ جس میں مرد اور عورت زندگی گذارتے ہیں کے قانونی خواہشات میں نسبی توازن قائم کیا جانا چاہیے۔

اسی طرح مسلمان اقلیتوں کی بھی ضرورت ہے کہ اپنے ملکوں پر حکم فرما گروہوں کے ساتھ نئی ہم آہنگی پیدا کریں۔ ہندوستان کے مسلمان (جن کی آبادی تقریباً ۲۲۰ ملین ہے اور وہ کل آبادی کا ۲۲ فیصد ہیں) اور فلپائن کے مسلمان (جو تقریباً ۶ ملین، اور کل آبادی کا ۸ فیصد ہیں) مجبور ہیں کہ اپنی اقلیتی صفوں کے درمیان انتہا پسند عناصر کو کنٹرول کریں۔ پاکستان اور بنگلہ دیش واضح مثالیں ہیں کہ علیحدگی پسندی کوئی کارآمد حل نہیں۔ بوسنیا کے صرب جس قومی یکسانیت کے درپے ہیں وہ ایک متحد اور ہم آہنگ معاشرے کی تشکیل پر قادر نہیں۔ وسطی ایشیا میں ابھرنے والی نئی مسلمان حکومتوں اور افریقہ میں پھیلنے والی اسلامی دہشت گردی اور اسی پیمانے پر مغربی ممالک میں متفرق فتنہ انگیزیوں کو کچل دیا جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمان اقلیتوں کے جائز مطالبات بھی ان کی حکومتوں کو سرکاری طور پر قبول کرنے چاہئیں۔ چین کی عظیم آبادی میں ایک سو ملین مسلمان ہی سہی انہیں نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

بین الاقوامی اصطلاح میں اسلامی حکومتوں کی اقتصادی، مالی اور سیاسی اہمیت روز افزوں ہے۔ امت اسلامی کے مابین علاقائی مفادات اور قومی سیاستوں نے صرف اسلامی روایات پر منحصر میلانات کی شناخت کی نسبت زیادہ اہمیت حاصل کرلی ہے۔ مغرب سے متنفر اسلامی حکومتیں (لیبیا، ایران، یمن اور عراق) مغرب کی شدید طرفدار حکومتوں (سعودی عرب،

Marfat.com

پاکستان، سنگاپور، ملیشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، فلپائن اور برونائی) کے ساتھ توازن قائم کر رہی ہیں۔

ہم یہ نہیں کہنا چاہتے ہیں کہ جن حکومتوں کے مغرب سے مثبت تعلقات ہیں انہیں مغرب پر کوئی اعتراض نہیں۔ بعض دوسروں کے علاوہ ڈاکٹر مہاتیر، لی کوان یو اور گوچاک تانگ (وزیراعظم سنگاپور) ان رہنماؤں میں سے ہیں، جو کھلے بندوں بہت سے اعتراضات کرتے ہیں جو مغرب میں بہت سی مشکلات کے دل پر جا لگتے ہیں۔

دنیا میں مغرب کے نظریات کے موثر نفوذ کے باوجود مغرب کی موجودگی ہمہ گیر نہیں ہے۔ بلاشبہ بیسویں صدی نے ثابت کر دیا ہے کہ مغرب جن آئیڈیلز (Ideals) کی حمایت کرتا ہے وہ باقی دنیا میں نامعقول ریاکارانہ طرزِ عمل کی توجیہات کو روکتے ہیں اور نہ یورپی قوموں کے درمیان جنگ کو۔

مغرب کو چاہیے کہ وہ اسلام کو سمجھے، اس لیے نہیں کہ اسلام مستقبل کا عظیم خطرہ ہے بلکہ اس لیے کہ اسلام کے پاس بکثرت اخلاقی افکار و اقدار ہیں اور مغرب کو چاہیے کہ سیکولرزم کی طرف رینگتے حال میں ان سے استفادہ کرے۔ علاوہ ازیں مغرب کو چاہیے کہ دنیا میں مسلمانوں کے متنوع تجربات کو شناخت کرے۔ مسلمان معاشرے نہ فقط بعض ''اسلامی'' مسائل کے حل نہ ہوسکنے پر پریشان ہیں بلکہ طویل مدت سے ان ہی مسائل سے دوچار ہیں جن کا مغرب کو سالہا سال سے سامنا رہا ہے، مثلاً اجتماعی و اخلاقی ارتقا، اور ماحولیاتی، اقتصادی و سیاسی ترقی۔ اس طرح کے مظاہر کے ساتھ انسانی تجربات اور سودمند اقدامات بھی ہوتے ہیں۔ ٹیکنالوجی، میڈیسن اور تعلیم میں بھی منصفانہ تعاون ہونا چاہیے۔ اگر مغربی اقوام اپنے تعریف شدہ مفاہیم کی اہمیت پر اعتماد رکھتی ہیں مثلاً فردیت، انسانی آزادی، قانون پسندی، انسانی حقوق، مساوات، قانون کی بالادستی، آزاد منڈی اور کلیسا اور حکومت کی جدائی (۹) تو ایسے میں انہیں چاہیے کہ دوطرفہ مکالمے میں شریک ہوں نہ یہ کہ دوسروں پر دھونس جمائیں۔ ان عالمی افکار کو جو اچھی حکومتوں کی بری حکومتوں سے تمیز کرتے ہیں، کو ایک طرف رکھ دینا ہوگا۔ یہ نکتہ مغرب کی چین سے روابط میں کارآمد نہیں رہا ہے جبکہ حقوق انسانی کے بارے میں مغرب کے نظریات کی الجزائر اور بوسنیا کے حوالے سے موقف کی دوگانگی سے واضح طور پر مشہود ہے۔ مغربی اقوام افغان مجاہدین کی حمایت کرتی رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ فلسطینیوں کو دبانے کے لیے اسرائیل کی حمایت بھی کرتی ہیں۔ اسرائیل کا ہمیشہ موجود رہنا قابل انکار ہے لیکن مغربی اقوام نے فلسطینیوں کی پریشانی اور حساسیت کے حوالے سے جو روش اختیار کر رکھی ہے اس کے پیش

Marfat.com

نظر کہا جاسکتا ہے کہ ہمدردی کافی نہیں ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کی طرف سے جنگجویانہ طرزِ عمل نے بھی ان مسائل کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں کی ہے۔

مغربی تہذیب کو عالمی تہذیب کے طور پر پھیلانے کے لیے مغرب نے جو جدوجہد کی ہے وہ جدید استعماریت (ثقافتی استعماریت، حقوق بشر وغیرہ) کے مقابلے میں شدید عملوں کا باعث بنی ہے۔ نئے سرے سے مذہب کا رواج اور نوجوان نسلوں خاص طور پر ہندو اور اسلامی ثقافتوں میں نئے سرے سے روایتی اقدار پر اصرار زیادہ تر مغربی ثقافت کے اچانک حملوں کے اثرات کا ردعمل ہے۔

بالکل ویسے ہی جیسے کہ مغربی دنیا کو چاہیے کہ اپنی سوچ پر نظرثانی کرے اسلامی دنیا کو بھی چاہیے کہ وہ یہ جان لیں کہ ان کی روایات کی بھی دوبارہ تشریح ہونی چاہیے۔ یہ ایک کمزور نقطہ ہے کہ بعض افراد ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہتے ہیں کہ اسلام کسی تبدیلی کو قبول نہیں کرتا بلکہ اسلام ایک بلند مرتبہ روایت ہے۔ اس پہلو سے مغربی نظریات صرف تحقیر کنندہ نہیں ہیں بلکہ بعض صورتوں میں اسلام اور اسلامی دنیا کے ساتھ بے ربط ہیں اور اس پر منطبق نہیں ہوسکتے۔(۱۰)

آخر میں Ideals کا حصول ایک دینی جست سے وابستہ ہے: کیا آسمانی اقتدار تورات، انجیل یا قرآن پر منحصر ہے؟ جن لوگوں نے ان آسمانی کتابوں میں سے کسی ایک کی الوہی عظمت کو قبول کرلیا ہے انہیں دیگر دعووں کے انکار کے ساتھ ساتھ ایسے افراد کا جواب وہ بھی ہونا چاہیے کہ جو کسی وحی الٰہی کی مرجعیت کو قبول نہیں کرتے۔

جو لوگ قرآن کو قبول نہیں کرتے انہیں اس کی مرجعیت تجویز کرنا بے محل ہے۔ مکالمات کو کوئی اور رخ دینا چاہیے، عقلی و تجرباتی رخ۔ اس سلسلے میں جو Ideals گذشتہ صدیوں میں عملی زندگی کے حقائق کی وجہ سے متزلزل ہوگئے ہیں ان کے بارے میں تحقیق کی جاسکتی ہے۔ تاہم اس کا مطلب نصب العین اور امنگوں کا بے وقعت ہوجانا نہیں بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اصول اسلامی میں کسی غفلت پہ نظرثانی کا تجزیہ جرأت اور وضاحت طلبی کے طریقے سے ہونا چاہیے، نیز قرآنی نصب العین اور تاریخی ریکارڈ میں پائے جانے والے اختلافِ نظریات سے اس کی مطابقت کو جانچنا چاہیے۔ اسلام اور مغرب ایک دوسرے کے لیے بہت سے کارآمد امور پیش کرسکتے ہیں تاہم اگر بدگمانی، تعصب اور خوف پر مبنی نقطۂ نظر ہو تو کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

جب یورپ ''دورِ ظلمت'' میں جہالت اور بربریت سے گذر رہا تھا اسلام نے حفاظت علم میں بنیادی کردار ادا کیا۔ مغرب نے اس علم کی بازیافت اور اصلاح کی جس کے نتیجے میں

Marfat.com

اسے سائنس اور ٹیکنالوجی پر تسلط حاصل ہوگیا۔یورپ پر سے فاسد اور دنیا پرست مذہبی رہنماؤں کا تسلط ختم ہوگیا، جبکہ اسی زمانے میں اسلامی معاشروں میں اجتہاد کا خاتمہ ہوگیا اور عقلیت پسندی کی مخالفت ہونے لگی جو عالم اسلام کے زوال کا باعث بنی۔ اسی نے اہل یورپ کو اٹھارہویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے اواسط تک استکبار اور سامراجیت کا موقع فراہم کیا۔ اس زمانے میں مغربی معاشروں سے اسلامی معاشروں کی طرف علم کا جو دوستانہ انتقال ہوا ہے، اس کی وجہ سے ممکن ہے دوبارہ اسلام کا احیا ہوجائے اور اس سے مسلمان معاشروں کے لیے جدید دنیا میں زیادہ اہم اور تعمیری کردار ادا کرنا ممکن ہوجائے۔

نری مادی تبدیلیاں کافی نہیں۔ ان دونوں معاشروں کے اصولی افکار کے بارے میں پھر سے تحقیق کی جانا چاہیے۔ شاید یہ بات بدیہی دکھائی دے لیکن مذہبی پہلو سے تعصب کے پیش نظر اس نکتے پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ غیر مسلم اللہ کی طرف سے محمدؐ پر حقیقی وحی کے نزول کی قطعیت کا تعین کریں۔ اگر ہم اپنے انبیا کے کردار اور توحیدی سنن کو قبول کرسکتے ہیں تو پھر سچے نبیوں کے دعویٰ کو ہمیں جھوٹے نبیوں کے دعوؤں سے تمیز دینا ہوگی۔ ہم میزان معرفت اور زیادہ علم کے ساتھ انتقادی نظر سے روایات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ تاہم یہ تنقید نفرت کی بنیاد پر اور پوری طرح رد کردینے کی غرض سے نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام ان مغربی معاشروں کو بہت سے کار آمد امور پیش کرسکتا ہے جن میں دور حاضر میں افراتفری کا باعث بننے والے مختلف ازم پھیل گئے ہیں مثلاً فرد پرستی (Indiviualism)، مادہ پرستی (Materialism)، صارفیت (Consumerism) اور سیکولرزم (Secularism)۔

اسلام نے اخلاقی اقدار کی محوری حیثیت کی انسانی معاشرے کے تعریف شدہ کردار کے طور پر حفاظت کی ہے۔ فرانس لی ماند جو فرانس کی انجمن اسلام و مغرب کے سربراہ ہیں کا نظریہ ہے کہ اسلام مغرب میں تین بنیادی اقدار کے احیا میں مدد دے سکتا ہے۔ اجتماعی شعور دنیا کے اس حصے میں جہاں فرد پرستی (Indiviualism) میں اضافہ ہوگیا ہے، مذہبی شعور اور قانونی شعور۔(۱۱)

دوسری طرف مغرب کو چاہیے کہ اپنی تسلط اور اقتدار پسند طبیعت کو لگام دے اور باقی دنیا کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کا پھر سے جائزہ لے۔ یہاں تک کہ ''باقی دنیا'' ہونے کا تصور جس حوالے سے بھی ہو، ہم سب کو اسے تبدیل کرنا چاہیے۔

Marfat.com

منابع

1-Shabbir Akhtar, *A Faith for All Seasons: Islam and Western Modernity* (London: Bellew, 1990), p. 104.

2-Seyyed Hosseyn Nasr, *Islam and the Plight of Modern Man* (London: Longman, 1957), pp. 131-132

۳۔ اس موضوع کے ایک دلچسپ تجزیے کے لیے دیکھیے:

Chandra Muzaffar, "Dominant Western Perceptions of Islam and the Muslim," *The Thatched Patio,* Vol. 6, No.3 (1993), pp. 25-26: Shaykh Fadhalla Haeri, *The Elements of Islam* (Shaftesbury: Element Books, 1993), esp. pp. 129-35, 143.

4-Fazlur Rahman, *Islam and Modernity:Transformation of an Intellectual Tradition,* (Chicago: Univ. of Chicago Press, 1982), p.139

5-P.J. Vatikiotis, *Islam and the State* [1987], (rep. London: Routledge, 1991), p.67

6-J.L.Esposito, *The Islamic Threat: Myth or Reality?* (New York: Oxford, 1992), p.78

7-*Ibid*; pp. 206, 209

8-Vatikiotis, *Islam and the State,* p.97

9-S.P.Huntington, "The Clash of Civilizations?" *Foreign Affairs,* Vol. 72, No.3 (1993), p.40.

10-Vatikiotis, *Islam and the State,* p.16.

11-Cited in M.A. Yamani, " Islam is not an enemy of the West", reprinted in. *Australian Muslim News,* Vol 1, No. 5 (1994), p.9

☆☆☆

Marfat.com

استاد مطہریؒ کی نظر میں
نظریۂ فطرت کی کلامی حیثیت

حمید نگارش☆

دینی مفکرین میں سے معاصر فرزانہ متکلم استاد مطہریؒ وہ نمایاں ترین شخصیت تھے جنہوں نے علمِ کلام کے حقیقی مقام کو مشخص کرتے ہوئے اسلام کو ایسا جامع اور ہمہ گیر نظام ثابت کردکھایا جو انسان کی تمام ضروریات کو پورا کرسکتا ہے اور اس کے لیے دونوں جہانوں کی سعادت کا حامل ہے۔ استاد مطہریؒ کا تمام تر ہم وغم دین کا دفاع تھا؛ لہٰذا انہوں نے ایک عظیم نگہبان کی حیثیت سے گہری وسعتِ نظر کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی تشریح کرتے ہوئے اغیار کے شبہات اور اتہامات کا سامنا کیا اور اسلامی تعلیمات کے دفاع کو اپنا دستور کار بنالیا۔ حقوقِ نسواں کی وضاحت، مسئلہ حجاب، فلسفۂ اخلاق، دین کا دوام، دین کی ضرورت، سائنس اور دین وغیرہ جیسے موضوعات اپنے تنوع کے باوصف معرفت کی وسعت اور روش کے امتیاز سے تعلق کے حوالے سے استاد کی نظر میں کلامی موضوعات قرار پائے۔

دیگر حکما کی طرح استاد مطہریؒ کی نظر میں بھی علوم اپنے موضوعات کے امتیاز کی بنیاد پر الگ تھلگ قرار پاتے ہیں یہاں تک کہ وہ علم کلام کے مسائل کی وحدت کو اعتباری اور فرضی سمجھتے ہیں اور علم کلام کی طرف وہ اس کے موضوع کی نسبت اس کی روش اور غرض کے لحاظ سے زیادہ نظر کرتے ہیں۔ لہٰذا علمِ کلام ایسے مطالب کا مجموعہ ہے جنہیں دین کی حدود کا دفاع اور ان کا اثبات کرتے ہوئے اور مخالفین کے نقطۂ نظر کو رد کرتے ہوئے بیان کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں استاد مطہریؒ کی رائے میں علم اخلاق، علم قانون اور علم فقہ کا فریضہ فقط اخلاقی، قانونی اور فقہی نظریات بیان کرنا ہی نہیں بلکہ شبہات کے مقابل ان کا دفاع بھی علم

☆ عضو ہیات علمی پژوہشکدۂ تحقیقات اسلامی، مقالہ منقول از مشکوۃ، شمارہ ۸۶، بہار ۱۳۸۳ش، ص ۹۶-۸۵

Marfat.com

کلام کی ذمہ داری ہے۔ اس طرح سے کہ ایک متکلم عمرانیات اور قانون وغیرہ کے مسائل میں داخل ہوسکتا ہے اور صرف اس پہلو سے کہ جس سے ان کا تعلق دین سے بنتا ہے شبہے کا ازالہ کرسکتا ہے۔ اسلام میں عورت کے حقوق کا نظام، مسئلہ حجاب اور ایران واسلام کی ایک دوسرے کے لیے خدمات وغیرہ جیسی ان کی کتابیں اسی پہلو سے بامعنی ہیں۔

استاد نے جن اہم مسائل کے بارے میں بات کی ہے ان میں سے ایک فطرت ہے۔ اس مقالے میں کوشش کی گئی ہے کہ ان کی کتب میں اس نظریے کی کلامی اہمیت کے بارے میں جو کچھ آیا ہے اس کے بعض پہلو واضح کیے جائیں۔ درحقیقت پیش نظر تحقیق کا مفروضہ علم بشریات ومعرفت دین وغیرہ جیسے علوم کی حدود میں فطرت کے کلیدی کردار پر بات کرنا ہے اور اس میں کوشش کی گئی ہے کہ نظریۂ فطرت جہاں بہت سی کلامی پیچیدگیوں کو حل کرتا ہے وہاں یہ دینی طرزعمل اور تعلیمات کی تشریح کا ایک معیار بھی ہے۔

فطرت انسانی اسلام کے مثالی انسان کی ترجمان ہے

کیئر کگارڈ (Kierkegard) ، ہائیڈیگر(Heidegger) اور یاسپرس (Yaspers) جو فلسفۂ وجودیت (Existentialism) کی فکری تحریک کے پیش رو ہیں، کی تحریروں سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے اس کے مطابق انسان پیدائش کے وقت ایک استعداد کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور اس کے لیے کسی ماہیت کو فرض نہیں کیا جاسکتا،انسان آزاد ہے اور ہر قید وصفت جو انسان کو مقید کرے آزادی کی مخالف ہے۔(۱) ہیوم اور جان لاک جیسے تجربیت پسندوں کا بھی نظریہ ہے کہ انسان کے اندر کچھ ''معلوم'' نہیں ہوتا اور وہ ہر چیز باہر سے حاصل کرتا ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ ہر چیز سیکھی اور سکھائی گئی ہوتی ہے۔

استاد مطہریؒ مکتب وجودیت کے گروہوں کی فکر کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ لوگ چونکہ فطرت کو آزادی کا مخالف سمجھتے ہیں، وہ سرشت سے متعلق ہر امر کے مخالف ہیں اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ سرشت سے متعلق ہر امر آزادی کا مخالف ہے۔لہٰذا انسان بھی ہر طرح کی طبیعت اور ماہیت سے محروم ہے اور نتیجے کے طور پر فطرت سے عاری ہے گویا انسان موجود ہے لیکن کسی سرشت وفطرت کا حامل نہیں۔(۲)

اس مکتب کی نظر میں انسان کی حقیقی ''خود'' یہ ہے کہ وہ کسی ''خود'' کا حامل نہ ہو اور انسان کے لیے کسی ''خود'' کے فرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کے لیے ماہیت وسرشت کے قائل ہوگئے ہیں حالانکہ انسان ایک بے سرشت و بے ماہیت وجود ہے۔(۳) استاد مطہریؒ

Marfat.com

ایک اسلامی انسان کے نمونے کو تمام موجودات کا نچوڑ اور زمین پر خلیفۃ اللہ کے طور پر پیش کرتے ہیں، ایک ایسا موجود جو خلافتِ تکوینی کا نیز اختیار، قدرت اور آزادی کا حامل ہے اور کوئی امر اس کی آزادی کو مخدوش نہیں کرتا۔ ان کا نظریہ ہے کہ اسلامی انسان خدا کی طرف سے ایک برگزیدہ موجود ہے جو نصف ملکوتی ہے اور نصف مادی، خدا آشنا فطرت کا حامل، آزاد، صاحبِ استقلال، امین الٰہی اور اپنا بھی مسؤل ہے اور عالم کا بھی، نیز وہ عالم طبیعت اور زمین و آسمان پر تسلط رکھنے والا ہے، اسے خیر و شر کا الہام کیا گیا ہے اور وہ لامحدود علمی و عملی ظرفیت رکھتا ہے۔ انسان ذاتی طور پر شرف و بزرگواری کا حامل ہے اور اپنے اللہ کے حضور جواب دہ ہے۔(۴) استاد مطہریؒ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان ماحول کا ردعمل یا لوح نانوشتہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا چراغ ہے جس میں فطرت نام کی الٰہی روشنی ہے اور جس میں کوئی بھی شخص روغنِ شریعت الٰہی ڈال کر اسے فروزاں تر اور نورانی تر کرسکتا ہے۔ ان کی نظر میں یہ شعلہ ضمیر انسانی کے کاشانہ کو تپش عطا کرتا ہے اور یہ ہمارے اسلامی معارف کے مسلمات میں سے ہے اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو اس اسلامی بشریات کے نمونے کو وجودیت اور مارکسزم وغیرہ کی بشریت سے جدا کرتی ہے۔ استاد کی رائے میں یہ نمونہ معرفت الٰہی، معرفتِ بشر اور معرفت دین کے مابین ارتباط کو واضح کرتا ہے۔

نظریہ فطرت کے بیان میں استاد کی روش

نظریۂ فطرت میں استاد کی روش دین کے اندر سے پھوٹتی ہے جس تک وہ قرآنی تعلیمات اور روایات کے ذریعے پہنچے ہیں۔ استاد نے جو نقلی استنادات پیش کی ہیں، ان میں سے ایک یہ معروف حدیث نبوی ہے: کل مولود یولد علی الفطرۃ حتی ابواہ یھودانہ و ینصرانہ۔(۵) یہ حدیث اس امر کو بیان کرتی ہے کہ جو بھی مولود پیدا ہوتا ہے وہ شرک سے خالی ہوتا ہے اور الٰہی و اسلامی فطرت پر دنیا میں آتا ہے اور استاد کی تعبیر کے مطابق انحرافی رنگ دوسرے راستے سے اس پر القا کیے جاتے ہیں۔ استاد کی دینی فکر ان کے امام خمینی جیسے اساتذہ کی تاثیر سے خالی نہیں ہے۔ امام خمینی کی رائے تھی کہ فطرت ایک خاص ہیئت رکھتی ہے جو اللہ تعالیٰ ابتدائے خلقت پر مخلوقات کو عطا کرتا ہے اور انسان چونکہ مخلوقات میں سے ایک ہے اس لیے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انسانی فطرت ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کی دستیابی سے ہی انسان، انسان بنتا ہے اور دیگر مظاہر سے ممتاز ہوتا ہے اور یہ فطرت ایسی خصوصیات رکھتی ہے جو اسی سے مختص ہیں اور دیگر موجودات کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔(۶) بنابریں استاد

Marfat.com

دین کو وجود بشر سے پھوٹنے والی نیاز سمجھتے ہیں۔ ہستیِ انسان کا تار و پود اسی سے بنا ہے اور اس میں بیرونی عوامل کا کوئی کردار نہیں۔(۷)

استاد مطہریؒ آیات، روایات اور اپنی دینی فکر سے استفادہ کرتے ہیں اور نظریۂ فطرت کو ام المسائل قرار دیتے ہوئے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہماری کتابوں میں فطرت کے بارے میں مکمل بحث نہیں کی گئی چاہے یہ تفسیر سے متعلق کتب ہوں، حدیث سے متعلق یا کسی اور موضوع سے متعلق۔(۸) استاد کی نظر میں کلامی حوالے سے نظریۂ فطرت بہت کارآمد ہے، خاص طور پر معرفت خدا، معرفت انسان، دین شناسی اور اخلاق کے موضوعات میں۔

معرفت خدا

استاد مطہریؒ نے فطرت کے بارے میں جن اہم ترین مسائل کو اٹھایا ہے ان میں سے ایک معرفت الٰہی ہے۔ وہ اس بارے میں لکھتے ہیں کہ انسان کے اندر خدا کی جستجو، خدا خواہی اور خدا پرستی ایک جبلّت کے طور پر رکھ دی گئی ہے۔ خدا خواہی اور خدا کی جستجو ایک طرف مرکز دل اور انسانی احساسات اور دوسری طرف مرکز ہستی کے مابین ایک طرح کی روحانی کشش اور جاذبے کے طور پر موجود ہے۔(۹) نظریہ فطرت کا اثبات ہوجائے تو اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ انسان کے اندر ایک طرح کا باطنی شعور اور خاص میلان موجود ہے۔ درحقیقت نظریۂ فطرت بتاتا ہے کہ انسان کے اندر خدا کی طرف میلان کی کیا وجہ ہے۔ اہل دانش کے مابین ہمیشہ سے یہ سوال موجود رہا ہے کہ خدا کی طرف میلان کی کیا وجہ ہے۔ یہ ایک ایسا مظہر ہے جو ہر دور میں مختلف ثقافتوں میں رائج اور عام رہا ہے۔ استاد کی نظر میں نظریۂ فطرت ہمیں اس سوال کا جواب مہیا کرتا ہے۔ استاد کے اس طرز عمل نے دوسرے بہت سے سوالات کا جواب بھی دے دیا ہے۔ مثال کے طور پر جدید کلامی مسائل میں سے اس سوال کا جو حال ہی میں اٹھایا گیا ہے کہ اصولاً انسان کو دین کی ضرورت ہی کیا ہے اور اگر وہ کسی دین کو قبول نہ کرے تو اس کی زندگی میں کیا خلل اور کیا کمی پیدا ہوتی ہے۔

نظریۂ فطرت کو پیش نظر رکھا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ دین کی ضرورت اور ایک مبدأ بلند سے ارتباط کی ضرورت خود انسانی وجود کی گہرائی میں موجود ہے کہ جسے پورا کیے بغیر انسان ہمیشہ ایک کمی کا احساس کرتا ہے۔ خدا کی طرف میلان کے فطری ہونے کا بلاواسطہ نتیجہ استاد کی مفہوم سازی کی فکر کے مطابق یہ ہے کہ اس نظریے کی بنیاد پر انبیائے الٰہی نے کبھی لوگوں سے یہ نہیں کہا کہ ضرور عبادت کرو کیونکہ اس نظریے کے مطابق انسان عبادت کے بغیر

Marfat.com

زندگی بسر نہیں کرسکتا اور پرستش کرنا انسان کی ایک ذاتی جبلت اور فطرت ہے۔ انبیا کی تعلیم محض اتنی تھی کہ اے انسان! تو اپنے رب، اپنے پروردگار اور اپنے صاحبِ اختیار کی پرستش کر، وہ صاحب اختیار کہ تمام ہستی جس کے ارادے سے وابستہ ہے۔

۲۔معرفتِ انسان

کیا انسان اپنے اندر اللہ سے آگاہ ہوجاتا ہے یا یہ نظریہ باہر سے اس پر تحمیل کیا جاتا ہے؟ انسان کا دین سے تعلق کس قسم کا ہے؟ کیا سب انسانوں کو ایک ہی دین پیش کیا جاسکتا ہے؟ انسان کس بنیاد پر کمال حاصل کرتا ہے؟

بلاشبہ استاد مطہریؒ کے نظریۂ بشریت میں کلامی بنا اسلام کے مثالی انسان کے ساتھ مذکورہ اور اس طرح کے سوالات کا جواب دیتا ہے۔ جس ماڈل کا تصور استاد کے مفہوم سازی کے اصول پر کیا جائے گا وہ نظریۂ فطرت پر استوار ہوگا یعنی وہ اصالتِ انسان کو نظریۂ فطرت قبول کرنے پر منحصر جانتے ہیں اور ان کی رائے یہ ہے کہ اگر ہم فطرتِ انسانی کے قائل ہوں یعنی انسانی معیارات کو ایسے ثابت معیارات جانیں کہ جن کی بنیاد انسانی فطرت ہے تو نہ صرف انسانیت بلکہ انسانیت کا کمال بھی بامعنی و بامفہوم ہوجائے گا۔(۱۰)

استاد مطہریؒ کی نظر میں بشر شناسی کا اہم ترین رکن عِلوی خود اور سفلی خود کے مابین تمیز ہے۔ ان کی رائے میں عِلوی خود کی بازگشت اسی فطرت کی طرف ہے۔ وہ اس بارے میں کہتے ہیں کہ انسان اس عِلوی خود کو اپنے اندر پوری طرح احساس کرتا ہے۔ انسان کی فطرت اپنی سرشت کے مطابق ایک ایسی شکل کی حامل ہے کہ جو خود بلند مرتبہ میلانات کی حامل ہے اور جو اس کی خلقت ہی کے ساتھ اندر ہی سے وجود میں آئی ہے نہ یہ کہ باہر سے اس پر عارض ہوئی ہے اور درحقیقت اس کے بلند مرتبہ میلانات اس کے عِلوی خود کے ہی میلانات ہیں جو حیوان سے انسان کی امتیاز فصل کی راہ ہموار کرتے ہیں اور اس کے یہ میلانات انسان ہی سے مختص ہیں جبکہ وہ میلانات جو سب حیوانات سے مربوط ہیں اس کی پست خود کو تشکیل دیتے ہیں۔

فطرت اور انسان کی کمال پذیری

علم بشریات اور معرفت انسان کے دائرے میں جن موضوعات کو اٹھایا گیا ہے ان میں سے ایک سوال یہ ہے کہ انسانی کمال کی بنیاد کیا ہے؟ استاد کے نظریے کے مطابق فطرت اور ثابت انسانی اقدار کے وجود پر اعتقاد کے بغیر انسان کی کمال پذیری کی وادی میں قدم نہیں

Marfat.com

رکھا جاسکتا۔ مارکسزم اور وجودیت جیسے مکاتب ایک طرف کمال پذیری کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف بلند مرتبہ قدر کا انکار کرتے ہیں اور اس طرح وہ تناقض و تضاد میں پھنس جاتے ہیں۔ لہٰذا انسانی اقدار کو اصول ثابت اور انسانی وجود میں ریشہ دار جاننا چاہیے تاکہ کمال پذیری بامعنی ہوجائے اور یہ اقدار اور میلانات فطری امور ہیں اور کمال پذیری بھی اسی مفروضے پر استوار ہے۔

فطرت و تربیتِ انسانی

نظریۂ فطرت ثابت و مشترک اقدار کا تمام انسانوں میں اثبات کرتا ہے جو ایک مکتب کے اثبات کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اس امر کو پیشِ نظر رکھیں تو نظریۂ فطرت فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے اور اس سے فلسفۂ تعلیم و تربیت کا پیغام ملتا ہے۔ نظریۂ فطرت کی بنیاد پر انسان میں بالقوہ صورت میں انسانی صلاحیتیں بھی موجود ہیں جنہیں پروان چڑھانا چاہیے اور تربیت کا مطلب ہی ان صلاحیتوں کو پروان چڑھانا ہے اس طرح کہ وہ کھل اٹھیں اور انسانی وجود میں بلند مرتبہ اقدار جم جائیں۔ استاد کی رائے میں فطرت کا تربیت سے خاص تعلق ہے اور تربیت اسی فطرت کی بنیاد پر عملی شکل حاصل کرتی ہے کیونکہ رشد و تربیت دینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان کے اندر کچھ صلاحیتوں اور خصوصیتوں کو قبول کیا جائے۔(۱۱)

فطرت اور خود سے بیگانگی

''خود سے بیگانگی'' یورپی فلسفے کی ایک رائج اصطلاح ہے۔ اس نظریے کا بانی ہیگل ہے۔اس اصطلاح کے مغربی اور اسلامی مفہوم ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔اس اصطلاح میں مغربی افکار کی نمود ہمیں ہیگل کے شاگرد فریڑ باخ کی تحریروں میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا اور دین کا خیال انسان کا اپنا ہی بنایا ہوا ہے اور خدا انسان کے اپنے خدا کے مثالی تصور کے سوا کچھ نہیں اور انسان اس خود ساختہ خدا کو پوجتا ہے اور نتیجے کے طور پر خدا کے سامنے اپنے آپ سے بیگانہ ہوجاتا ہے۔

شہید مطہریؒ دینی فکر سے ہدایت لیتے ہوئے خود سے بیگانگی کی صحیح تفسیر کو فطرت اور انسان کے بلند مرتبہ میلانات کو قبول کرنے پر منحصر سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک نامربوط مسئلہ جو انہوں نے خود سے بیگانگی کے نام پر اٹھایا ہے، جب تک کوئی فطرت نہ ہو خود سے بیگانگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔آخر وہ خود ہے کیا کہ خود سے بیگانہ ہو؟ پہلے تو اپنے آپ کو پہچان، پہلے تو مجھے پہچوا کہ خود کیا ہے، بعد میں کہہ کہ اس کی فلاں چیز اس سے

Marfat.com

بیگانہ ہوگئی ہے۔ خود کو پہچانے بغیر یہ خود سے بیگانگی کی بات کرتے ہیں۔ جب تک ہم انسان کے لیے ایک واقعیت، ایک خودی، ایک ماہیت کے قائل نہ ہوں خود سے بیگانگی کے قائل نہیں ہوسکتے۔(۱۳) وہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خود سے بیگانگی یا با خود بیگانگی کی بحث معارف اسلامی میں ہزار سال پرانی ہے۔(۱۴)

مولوی نے اس روحانی حالت کو اپنے اشعار میں بیان کیا ہے:

در زمین دیگران خانہ مکن
کار خود کن کار بیگانہ مکن
کیست بیگانہ تنِ خاکیِ تو
کز برای اوست غمناکی تو
تا تو تن را چرب و شیرین می دہی
گوہر جان نیابی فربہی
گر میانِ مشک تن را جا شود
وقت مردن گند آن پیدا شود
مشک را بر تن مزن بر جان بمال
مشک چہ بود، نام پاک ذوالجلال(۱۵)

دوسروں کی زمین میں گھر نہ بنا، اپنا کام کر غیر کا نہ کر، غیر کون ہے؟ تیرا خاکی بدن کہ جس کے لیے تیرا سارا غم ہے۔ جب تک تو اپنے بدن کو چربی اور شیرینی دیتا رہے گا تیری جان و روح صحت مند نہ ہوگی۔ اگر بدن خوشبو میں بسا رہے گا تو موت کے وقت اس کی بدبو ظاہر ہوجائے گی۔ خوشبو کو بدن پر نہیں روح پر مل، اور یہ خوشبو کیا ہے، نامِ پاک ذوالجلال!

مذکورہ بالا وضاحتوں سے یہ امر روشن ہوجاتا ہے کہ خود سے بیگانگی کے اسلامی تصور میں اور ہیگل کے تصور میں بہت فرق ہے۔ ہیگل، فریر باخ، مارکس اور اینجلز کا نظریہ تھا کہ دین انسان کو خود سے باہر لے جاتا ہے اور انسان کی نجات اس میں ہے کہ دین کو اپنی زندگی سے نکال دے لیکن استاد کے نظریہ کے مطابق جو قرآن سے ماخوذ ہے، انسان جب تک اللہ کی طرف حرکت کرکے خود کو اور اپنی فطرت کو نہیں پالیتا وہ خود سے بیگانہ ہوتا ہے۔

۳۔ فطرت اور اخلاقی اقدار کی جاودانی

استاد کی رائے میں نظریہ فطرت اخلاقی اصولوں کے دائمی ہونے کی بنیاد ہے۔ شہید

Marfat.com

مطہریؒ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کلی اچھائی اور برائی کا ریشہ اور بنیاد کیا ہے اور کہتے ہیں: انسان میں دو خود ہیں، عِلوی خود اور سفلی خود، اس معنی میں کہ ہر فرد ایک ایسا وجود ہے جس کے دو درجے ہیں۔ ایک درجے میں وہ حیوان ہے، تمام دیگر حیوانوں کی طرح اور دوسری درجے میں وہ ایک عِلوی حقیقت کا حامل ہے۔ اپنی ملکوتی خود کے لحاظ سے انسان بے شمار کمالات رکھتا ہے، حقیقی کمالات، قراردادی و فرضی نہیں۔ وہ کام جو انسان کے معنوی و روحانی کمال سے مناسبت رکھتا ہو وہ عِلوی اور باقیمت ہے اور جس کام کا ہمارے عِلوی پہلو سے کوئی تعلق نہ ہو، وہ ایک عام کام ہوجاتا ہے۔ جس میں انسانوں کے نفس کا کمال ہے اس میں وہ مشابہ پیدا کیے گئے ہیں اور جب وہ ایک جیسے پیدا کیے گئے ہیں تو ان کی پسند بھی ہم رنگ ہوگی اور اس حوالے سے ان کا نقطۂ نظر بھی ایک ہوگا یعنی اس پہلو سے سب انسانوں کے لیے صعودی کمال اور روحانی کمال مشابہ صورت کا حامل ہوگا۔ اس طرح اُن کے کے لیے پسندیدہ امور، خوبیاں، بدیاں بھی یکساں، کلی اور دائمی ہوں گی اور تمام اخلاقی فضائل کی توجیہ بھی اس صورت میں کی جائے گی چاہے وہ اجتماعی ہوں یا غیر اجتماعی مثلاً صبر، استقامت وغیرہ۔(۱۶) استاد کی نظر میں یہ نظریہ تمام اخلاقی اصولوں کی توجیہ کرسکتا ہے۔

استاد مطہریؒ نے اپنی تحریروں میں بارہا عِلوی و سفلی خود پر زور دیا ہے اور وہ انہیں اخلاقی امور میں امتیاز کا معیار قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم اصولی طور پر اچھائی اور برائی کے وجود کو قبول کرتے ہیں لیکن کون سا خود کسے پسند کرتا ہے سفلی خود یا عِلوی خود، جسے انسان کا عِلوی خود پسند کرے وہ اخلاق ہے اور اسکی قیمت ہے اور یہ جو انسان اخلاق کے لیے ایک عِلوی خود کا وجود محسوس کرتا ہے اس کی بنیاد یہی ہے۔(۱۷)

انسانی فطرت، اخلاق کے نسبی ہونے کا جواب ہے

استاد کی نظر میں نظریۂ فطرت تمام انسانوں میں ثابت و مشترک اقدار کا اثبات کرتا ہے اور اس طرح ایک اخلاقی مکتب کی بنیاد بن سکتا ہے، ایسے اخلاقی مکتب کی جو ثبات، اطلاق اور جاوداں ہونے کو نظریۂ فطرت کا رہینِ منت جانتا ہے۔ اس نظریے سے اخلاق کے نسبی ہونے کا نظریہ اپنی حیثیت کھو دیتا ہے۔ اس بارے میں وہ مزید کہتے ہیں انسان فطری طور پر اخلاقی کاموں کو باشرف سمجھتا ہے۔(۱۸) ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان اس لحاظ سے کہ انسان ہے کچھ اخلاقیات کا حامل ہے اور یہ اخلاقیات انسان کے بدوی اور ابتدائی دور پر بھی اسی طرح صادق ہیں جس طرح اس کے صنعتی تہذیب کے دور پر۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ انسان اخلاق کا بھی

Marfat.com

قائل ہو اس کے ساتھ اخلاق کو متغیر اور نسبی بھی جانے۔(۱۹) شہید مطہریؒ کی رائے میں اخلاقی میلانات اور کام اجتماعی ضروریات وغیرہ سے پیدا نہیں ہوتے۔ گہری فکر کے ساتھ استاد اس نظریے کو رد کرتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ اس طرح کا فہم اخلاق کے نسبی ہونے کے نظریے پر منتج ہوتا ہے کیونکہ اجتماعی حالات اور عوامل کے بدل جانے سے اخلاقی حکم بھی بدل جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ لہٰذا سچائی اور صداقت کا اصول پائیدار اور اخلاقی اصولوں میں سے ہے جو زمان و مکان کے بدلنے سے نہیں بدلتا جو کچھ بدلتا ہے وہ اس کے مصادیق ہیں۔ یہ اثبات اصول فطرت کی بنیاد پر ہے کیونکہ انسان کی فطرت ثابت ہے اخلاقی اصول بھی جنہیں معیار فطرت پر پرکھا جاتا ہے جاوداں اور ثابت ہیں۔

انسان میں اخلاقی حس کا وجود

استاد مطہریؒ کا نظریہ یہ ہے کہ انسان میں اخلاقی بنیاد کو اس خاص میلان میں تلاش کیا جانا چاہیے جو اس کے وجود کی گہرائیوں میں مخفی ہے۔ انسان کے میلانات میں سے ایک اخلاقی حس کی طرف میلان ہے۔ بعض انسانی میلانات منفعت اور فائدے کے لیے ہوتے ہیں اور انسان جو امور انجام دیتا ہے وہ اس فائدے کے لیے ہوتا ہے جو ان میں نہاں ہوتے ہیں مثلاً وہ وسائل جو اس کی مادی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ انسان کا منفعت کی طرف میلان اس کی خودمحوری ہی ہے۔ ایسے امور انسانی زندگی کی حفاظت اور بلندی کے عامل ہوتے ہیں۔ البتہ ایسے امور بھی ہیں کہ انسان جن کی طرف میلان رکھتا ہے لیکن اس لیے نہیں کہ ان میں کوئی منفعت ہے بلکہ فضیلت اور عقلی خیر کی وجہ سے۔ منفعت حسی خیر ہے، جبکہ فضیلت عقلی خیر، مثلاً انسان کا سچائی، تقویٰ اور پاکیزگی کی طرف میلان اور ان کے مدمقابل امور سے تنفر اور دوری۔ استاد مطہریؒ کی رائے ہے کہ ایسی اقدار کی انسانی وجود کے اندر تلاش کرنی چاہیے اور اقدار کا وطن، اور مسکن انسانی نفس ہے۔ تمام اقدار کا ریشہ خود نفس انسان میں ہے۔ وجود کی یہ قابلیت اور خاص طرز بھی انسان کے گوہر مجرد و ملکوتی اور غیر مادی نفس سے مربوط ہے کہ جو اس کے نفس میں ودیعت کی گئی ہے اور روح انسان وجود کی وہ نحو اور طرز ہے جو قدر آفریں اور قیمت پانے والی ہے اور جسے اقدار کی ہدایت کی گئی ہے اور انسان حسب فطرت اخلاقی امور کو باشرف جانتا ہے۔(۲۰)

اعتقاد پر اخلاق کا اثر اور اس کے برعکس

شہید مطہریؒ اس یقین کا اظہار کرتے ہیں کہ اعتقاد اخلاق اور عمل پر اثرانداز ہوتا

Marfat.com

ہے اور اخلاق و عمل بھی اپنے مقام پر اعتقاد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اخلاقی و عملی روحانیت یا مادیت پوری طرح اعتقاد پر اثرانداز ہوتی ہے اور اس کے برعکس مادی یا غیر مادی اعتقاد بھی اخلاق و عمل پر تاثیر رکھتے ہیں۔ محکم اعتقاد کے لیے ہم آہنگ اخلاقی و عملی فضا فراہم کی جانا چاہیے اور الٰہی اعتقاد مناسبت رکھنے والی اخلاقی و دینی فضا ہی میں استحکام پاتا اور پائیدار رہتا ہے۔ دوسری صورت میں اخلاقی مادیت بتدریج اسے فرسودہ کردیتی ہے اور خود سے ہم آہنگ اعتقاد کو وجود میں لے آتی ہے اور روحانی اخلاق و عمل کے ختم ہوجانے کا سبب بنتی ہے۔(۲۱)

ایک نکتہ: استاد کی نظر میں فطری دین اخلاق کی بنیاد بن سکتا ہے اور اگر اخلاق کامل طور پر عملی شکل اختیار کرنا چاہے تو اسے دین جیسے محکم سہارے کی ضرورت ہے۔

۴۔ معرفت دین

دین شناسی میں بہت سے ایسے شبہات اور کلامی مسائل ہیں کہ استاد مطہریؒ نظریۂ فطرت کی بنیاد پر جن کا جواب دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

دین کا فطری ہونا

استاد مطہریؒ نے مختلف جگہوں پر یہ ثابت کیا ہے کہ انسان اپنی سرشت اولیہ کی وجہ سے اللہ کی طرف میلان رکھتا ہے، ایسا میلان جو اس کی خلقت کے اندر سے ظہور میں آیا ہے اور جس نے اس کی علوی خود سے ارتباط پیدا کیا ہے۔ استاد کا یہ نظریہ کہ جو نظریۂ فطرت کے پرتو میں پیدا ہوا ہے ان نظریات کو رد کردیتا ہے جو دین کو جہالت اور خوف وغیرہ کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور ثابت کرتا ہے کہ دین کا منبع انسان کے باہر نہیں ہے۔(۲۲)

فطرتِ ثابت، دینِ واحد

اگر انسان کی کوئی ثابت و مشترک فطرت ہو تو اس کے رشد اور نشوونما کے لیے ایک مستقل اور مشترک پروگرام کی ضرورت ہے۔ لہٰذا استاد کی نظر میں قرآن ادیان کا قائل نہیں بلکہ وہ ایک ہی دین کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: قرآن و حدیث میں دین کہیں بھی جمع کی صورت میں نہیں آیا کیونکہ دین فطرت ہے، راستہ ہے اور ایک ایسی حقیقت ہے جو انسان کی سرشت میں ہے۔ انسان کی تخلیق مختلف صورتوں میں نہیں ہوئی اور تمام انبیا کے احکامات کی بنیاد حسِ فطری کو بیدار کرنے پر استوار ہے اور حسِ فطری و فطرت انسانی کا تقاضا مختلف طرح کا نہیں ہے۔(۲۳) استاد کا یہ نظریہ دینی پلورلزم یا کثرت ادیان کے نظریے کو ردّ کردیتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ دین زمان و مکان کے بہت زیادہ اختلاف کے باوجود ایک

Marfat.com

ہے اور حقیقت واحد کا تقاضا بھی ایک ہی ہوتا ہے۔

فطرت جامعیت کا راز ہے

دین کے فطری ہونے سے آسمانی دین کی جامعیت اور دوام کا راز جانا جاسکتا ہے دین کو تمام اصلی اور فطری ضروریات کا کفیل ہونا چاہیے اور اصلی و فطری ضروریات چونکہ پائیدار ہیں آسمانی شریعت و دین کو بھی پائیدار ہونا چاہیے۔(۲۴)

فطرت کی شریعت سے ہم آہنگی

اگر فطرت شریعت کی جامعیت اور جاودانی کا راز ہے تو اس کا نتیجہ ان دونوں کے مابین ہم آہنگی کی صورت میں نکلنا چاہیے۔ دراصل انسانی تخلیق میں دو طرح کی ہدایت موجود ہے اور دونوں طرح کی ہدایت سے حکمت الٰہی کی تجلی ہوتی ہے۔ انسان کی ہدایتِ تکوینی جو فطرت انسانی کی صورت میں متشکل ہوتی ہے اور دوسری اللہ کی ہدایتِ تشریعی جس نے وحی و نبوت کی صورت میں عملی شکل اختیار کی ہے، یہ دونوں پوری طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔یوں کہا جاسکتا ہے کہ شریعت کا بیج فطرت کی قابلِ کاشت زمین میں بویا گیا ہے اور ان دونوں کی وجہ سے انسانی وجود کے درخت پر ثمرِ ہدایت پیدا ہوتا ہے۔ درحقیقت فطری و تکوینی ہدایت کا سرمایہ دو منظم سطحوں پر ہوتا ہے کہ جن میں سے ایک دوسرے کے لیے راہ ہموار کرتی ہے یعنی فطرت نبوت و شریعت کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ دراصل دو مسلم اصول موجود ہیں کہ جن کا قطعی نتیجہ نظام تشریع و تکوین کے مابین ہم آہنگی کا موجود ہونا ہے۔ یہ دو اصول یہ ہیں:

۱۔ نظام تکوین و تشریع کی ساخت اور اس کا انجینئرنگ ورک اللہ کی طرف سے کیا گیا ہے۔

۲۔اللہ تعالیٰ علم، قدرت، رحمت اور حکمت کے لحاظ سے کامل ترین اور برترین موجود ہے۔

۳۔مذکورہ اصول بطور فرض مان لیا جائے تو پھر نظام تشریع و تکوین میں ناہم آہنگی کا لازمی نتیجہ تناقض ہے جو محالاتِ ذاتی میں سے ہے۔

۴۔جو امر محالاتِ ذاتی میں سے ہے یا جس کا لازمی نتیجہ محالِ ذاتی ہے وہ ہرگز وجود پذیر نہ ہوگا۔

ان دونوں کی ہم آہنگی کی سب سے زیادہ روشن دلیل یہ آیتِ فطرت ہے: فاقم وجهك للدين حنيفا فطرت الله التى فطر النّاس عليها لا تبديل لخلق الله ذالك الدين القيم ولكن اكثر النّاس لا يعلمون (۲۵) یعنی اپنے رخ کو سیدھے دین کی طرف رکھیں، اللہ کی فطرت وہ ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی خلقت تبدیل نہیں ہوتی۔ یہ پائیدار دین

Marfat.com

ہے لیکن اکثر انسان نہیں جانتے۔ جملہ "فطرت اللّٰہ التی فطر النّاس علیھا" اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ دین کی جڑ فطرت میں ہے اور شریعت فطرت کی بنیاد پر استوار ہے۔(۲۶) اس وضاحت کے بعد ہم فطرت و شریعت کے مابین چند ہم آہنگیوں کو بیان کرتے ہیں۔

بعض ہم آہنگیاں

ا۔ دونوں یعنی دین (شریعت) و فطرت جہانِ خلقت کے مصادیق میں سے ہیں اور تحدی و مقابلے کی دعوت اسلام اور انسان کے بارے میں دی گئی ہے: قل لئن اجتمعت الانس و الجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ (۲۷) یعنی کہیے کہ اگر انسان اور جن اکٹھے ہوجائیں تو بھی وہ اس قرآن کا مثل نہیں لاسکیں گے۔

ان الذین تدعون من دون اللّٰہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ (۲۸) یعنی تم اللہ کے سوا جنہیں پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کرسکتے اگرچہ اس کے لیے سب اکٹھے ہوجائیں۔

۲۔شریعت بھی نور اور فطرت بھی نور، ظلمتِ بطلان کا ان دونوں میں سے کسی سے گذرنا ناممکن ہے:

لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ (۲۹) یعنی باطل اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔

۳۔شریعت بھی جاوداں اور ابدی ہے اور فطرت بھی، دوسرے لفظوں میں نہ دین ختم ہونے والا ہے اور نہ فطرت زوال پذیر ہے بلکہ دونوں اللہ کی بقا کے ساتھ باقی ہیں، کہ فرمایا: لا تبدیل لخلق اللّٰہ (۳۰) یعنی اللہ کی خلقت تبدیل نہیں ہوتی۔

۴۔شریعت بھی توحید کی داعی ہے اور فطرت بھی توحید کی طرف دعوت دیتی ہے اور دونوں کی دعوت ایک ہی ہے۔

۵۔شریعت و فطرت دونوں کلمات الٰہی میں سے ہیں۔ ایک تشریعی کلام ہے تو دوسرا تکوینی کلام۔

۶۔شریعت و فطرت دونوں حق ہیں۔ و انزلنا الیك الکتاب بالحق۔ (۳۱) یعنی اور ہم نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی نیز فرمایا خلق السموات و الارض بالحق (۳۲) (ترجمہ) اس کے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ جبکہ فطرت بھی، خلقت کے مصادیق میں سے ہے۔

۷۔فطرت بھی ہمہ گیر اور عالمی ہے اور شریعت بھی اور آخرکار فتح و ظفر شریعت اور فطرت

Marfat.com

دونوں کو نصیب ہوگی اور انسان کی حاکمیت اس کے ہاتھ میں ہوگی۔

۸۔انسان میں فطرت کا وجود مخالفِ آزادی ہے اور نزول شریعت بھی آزادی کے منافی نہیں ہے بلکہ دونوں انسان کے آزاد ہونے اور اس کی آزادی پر دلالت کرتے ہیں۔

۹۔راہ حقیقت پر فطرت کی طرف رجوع اور لوٹنا شریعت کی طرف رجوع اور لوٹنا ہی رہا ہے، جیسا کہ راہِ حقیقت شریعت کی طرف رجوع اور اس پر ایمان فطرت کی طرف رجوع اور ایمان ہے کیونکہ شریعت پر ایمان لانے والا اور اس کا عارف، فطرت پر ایمان لانے والا ہے اور فطرت پر ایمان لانے والا شریعت پر ایمان لانے والا ہے۔

۱۰۔دین بھی عمیق، گہرا اور بے انتہا ہے اور اس میں چھپے ہوئے معارف وسیع اور پھیلے ہوئے ہیں اسی طرح دل بھی وسیع اور جامع معالم و معارف پر حاوی ہے یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ''ظاھرہ انیق اور باطنہٗ عمیق'' (۳۳) شریعت و فطرت دونوں پر صادق ہے۔

۱۱۔جس طرح کوئی شریعت روحی کے افکار سے بہرہ مند ہوگا اسی طرح وہ فطرت کی آگاہیوں اور افکار سے فیض یاب ہوگا۔''ان ھذہ القلوب اوعیة فخیرھا اوعاھا'' (۳۴)

۱۲۔شریعت کا وجود بھی حیات انسانی کے ذخیرے میں ضروری ہے اور فطرت بھی انسان کے مرکز حیات میں واجب ہے اور انسان کی طرف سے شریعت و فطرت کی یہ ضرورت خود ذاتی اور حقیقی ہے۔

۱۳۔مشکلات، شبہات اور تحیرات کے موقع پر قرآن و دین کی طرف بھی رجوع کیا جاسکتا ہے اور دل کی طرف بھی: ''فعلیکم بالقرآن'' (۳۵) اور'' علیکم بانفسکم''(۳۶)

۱۴۔دین وفطرت میں ہم آہنگی کے آثار

انسان کو اپنی زندگی میں ایک دین کی ضرورت ہے اگرچہ وہ عقلی وعلمی بلوغ کی کتنی ہی بلندی پر موجود ہو کیونکہ وہی خدا جس نے عقل کو پیدا کیا اور جس نے اسے کمال پذیر قرار دیا اس نے فکری و روحانی سرمایوں کے حصول کمال اور عملی شکل اختیار کرنے کے لیے عامل بھی نازل کیا تاکہ انسان کی قلبی فطرت شریعت و دین کے زیر سایہ تکمیل تک پہنچ سکے۔ دوسری طرف دین کی ضرورت اور دین کی طرف میلان کو بھی اس نے انسان کے لیے فطری قرار دیا تاکہ دینی میلان اور دین کی قبولیت فطری ہو اور دل کا رخ دین کے رخ کی طرف ہو: فاقم وجھك للدین حنیفا ... یہی وجہ ہے کہ اللہ نے قرآن میں مذہبی ایمان کو نظام خلقت اور کتاب آفرینش سے ایک طرح سے ہم آہنگ جانا ہے: افغیر دین اللّٰہ یبغون وله اسلم من فی

Marfat.com

السموات والارض طوعا و کرھا و الیہ یرجعون۔ (۳۷) (ترجمہ) کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور کی تلاش میں ہیں جبکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خوشی یا ناگواری سے اس کے حضور سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے اور انہیں اسی کی طرف لوٹ جانا ہے؟

فطرت درحقیقت خود ایک فلسفہ زندگی اور جامع ثقافت ہے، یہ جاوداں اور خالص ہے اور انسانی زندگی کی بنیاد شمار ہوتی ہے کہ انسان اگر توحیدی راستے پر قدم اٹھائے تو وہ یقینی طور پر دین و شریعت کے راستے پر بھی ہوگا کیونکہ فطرت و دین کے مابین کوئی تباین اور غیریت نہیں ہے۔ پس چونکہ فطرت ہمیشہ کے لیے ہے اس لیے شریعت و دین بھی دائمی ہیں۔

ایک نکتہ: استاد کے نقطۂ نظر سے فقط نظریۂ فطرت ہی تمام زمانوں میں شریعت کے انسان کے ہمراہ ہونے کی تفسیر کرسکتا ہے۔

آخری بات

اس مقالے میں کوشش کی گئی ہے کہ متکلم فرزانہ استاد مطہریؒ کی نظر سے نظریۂ فطرت کی کلامی اہمیت کو واضح کیا جائے۔ فطرت کی بحث اس سے وسیع تر ہے کہ ایسے محدود مقالے میں اس کے تمام کلامی زاویوں پر بات کی جاسکے۔ ہم نے صرف چند کلی محوروں پر بات کی ہے کہ جن کی طرف اس رحیل عزیز نے توجہ کی ہے۔ اس مقالے میں جس دقیق اور گہری توجہ کی نشاندہی کی گئی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ اعتقادی محاذ کے نگہبان کی حیثیت سے استاد مطہریؒ نے نظریۂ فطرت کی طرف جو رخ کیا ہے اور اس کی جو راہ انہوں نے پائی ہے وہ نظام آفرین ہے اور اس کی بنیاد اور بنا موجود ہے اس طرح کہ وہ معرفتِ خدا، معرفت انسان، دین شناسی، اخلاقی بنیادوں وغیرہ جیسے بہت سے کلامی مسائل کو نظریۂ فطرت پر استوار قرار دیتے ہیں اور اس موضوع کے حوالے سے بعض پیدا ہونے والے ابہامات اور سوالات کا انہوں نے کامیابی سے جواب دیا ہے۔

امید ہے کہ استاد کی نظریے کے حوالے سے اٹھائے گئے سوالات کا واضح جواب اس مقالے میں دے دیا گیا ہے۔

(ترجمہ ثاقب اکبر)

حواشی

۱۔ ذبیح اللہ جوادی، الفبای فلسفہ جدید، تہران: ابن سینا، ص ۱۱۱
۲۔ مطہریؒ، مسئلہ شناخت، تہران: صدرا، ۱۳۶۸ ش، ص ۲۴۲
۳۔ مطہریؒ، فلسفۂ اخلاق، تہران: صدرا، ۱۳۶۶ش، ص ۱۸۷

Marfat.com

۴۔ مطہریؒ، مجموعۂ آثار، ج ۳، تہران: صدرا، ۱۳۷۲ش، ص ۱۶۸
۵۔ علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج ۳، تہران: دارالکتب الاسلامیہ، ص ۲۸۱
۶۔ امام خمینی، چھل حدیث، تہران: رجاء، ۱۳۶۸ش، ص ۱۸۰
۷۔ مطہریؒ، مجموعۂ آثار، ج ۳، ص ۲۳
۸۔ مطہریؒ، نقدی بر مارکسیسم، تہران: صدرا، ۱۳۶۳ش، ص ۲۴۹
۹۔ محمد حسین طباطبائی، اصول فلسفہ و روش رئالیسم، تہران: صدرا، س ن، ص ۶۸
۱۰۔ مطہریؒ، مجموعۂ آثار، ج ۳، ص ۴۵
۱۱۔ مطہریؒ، فطرت، تہران: صدرا، ۱۳۷۶ش، ص ۱۷
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۶۸
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۶۵
۱۴۔ ایضاً
۱۵۔ مولوی، مثنوی معنوی، تہران: خاور، س ن، دفتر دوم
۱۶۔ مطہریؒ، نقدی بر مارکسیسم، ص ۲۰۸
۱۷۔ ایضاً
۱۸۔ مطہریؒ، فلسفۂ اخلاق، ص ۱۲۶
۱۹۔ مطہریؒ، مجموعۂ آثار، ج ۳، ص ۲۹-۵۱۶
۲۰۔ مطہریؒ، فلسفۂ اخلاق، ص ۱۲۶
۲۱۔ مطہریؒ، علل گرایش بہ مادیگری، تہران: صدرا، ۱۳۵۷ش، ص ۲۲۵
۲۲۔ مطہریؒ، فطرت، ص ۱۶-۲۱۴
۲۳۔ ایضاً، ص ۲۶
۲۴۔ مطہریؒ، فلسفۂ اخلاق، ص ۱۴۳
۲۵۔ سورۂ روم: ۳۰
۲۶۔ علی ربانی، فطرت و دین، تہران: موسسۂ فرہنگ دانش و اندیشہ اسلامی، ۱۳۸۰ش، ص ۱۸۹
۲۷۔ سورۂ بنی اسرائیل: ۸۸
۲۸۔ سورۂ حج: ۴۳
۲۹۔ سورۂ فصلت: ۴۲
۳۰۔ سورۂ روم: ۳۰
۳۱۔ سورۂ مائدہ: ۴۸
۳۲۔ سورۂ تغابن: ۳
۳۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷
۳۴۔ ایضاً، حکمت: ۱۳۹
۳۵۔ کلینی، الکافی، ج ۴

Marfat.com

۳۶۔سورۂ مائدہ: ۱۰۵

۳۷۔سورۂ آل عمران: ۸۳

☆☆☆

Marfat.com

ایک خلیج، تین نام☆

ڈاکٹر رضا مصطفوی☆☆

سہ نگردد بریشم، ار او را
پرنیان خوانی و حریر و پرند(۱)

خلیج فارس کے بارے میں قدیم ترین مستند معلومات کے منابع کا تعلق چوتھی صدی قبل مسیح سے ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسکندر اعظم کے امیرالبحر نیارکوس(۲۶-۳۲۵ ق م)(۲) نے اس کے حکم سے دریائے سندھ سے فرات تک کے علاقے کو زیر و زبر کیا اور تاریخ میں پہلی بار انسان نے خلیج فارس کے ذریعے یورپ اور مشرق کی دور افتادہ سرزمین کے درمیان رابطے کی راہ کھولی۔(۳) اس کے بعد چھٹی صدی عیسوی میں انوشیروان ساسانی نے عرب اور اس کے جنوبی ساحل کو تسخیر کرنے کے لیے اپنی بحریہ کو دریائے فرات کے ڈیلٹا میں ابلہ کے مقام پر تیار کیا اور عمان سے گذرتا ہوا عدن تک جا پہنچا۔(۴)

اسلامی دور میں خلفا کی طاقت کے زائل ہوجانے کے بعد آل بویہ کے بادشاہوں نے ایک صدی تک بحرین اور عمان کو فارس میں ضم کیے رکھا جس کے بعد یہ علاقہ فارس کے اتابکوں اور کرمان کے سلجوقی بادشاہوں کے قبضے میں آگیا۔توران شاہ سلجوقی کے دور حکومت(۴۹۰-۴۷۷ھ) میں کیش نے بحری تجارتی مرکز کی صورت اختیار کرلی اور ۶۲۶ھ کے بعد ہرمز کی بندرگاہ اور جزیرہ بھی خلیج فارس کا ایک اہم بحری تجارتی مرکز بن گیا۔ ابوبکر بن سعد اتابک(۶۵۸-۶۲۳ھ) نے بھی کیش، ہرمز، قشم، ھندرابی،(۵) بحرین اور قطیف پر حکومت کی۔(۶)

اسلامی دور کے فارسی زبان و ادب کے متعدد متون سے حاصلہ شواہد سے، جن میں سے نمونے کے طور پر چند ایک کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے جنوب میں واقع عظیم خلیج کا نام اس نام سے مختلف ہے جو بعض عربی اخبارات و جرائد یا

☆ یہ مقالہ کنگرۂ خلیج فارس در فرہنگ و ادب فارسی جزیرۂ کیش منعقدہ ۲ خرداد ۱۳۷۵ شمسی میں پیش کیا گیا تھا۔

☆☆ استاد ادبیات فارسی، علامہ طباطبائی یونیورسٹی، تہران

Marfat.com

ایران مخالف کتابوں اور جغرافیائی اطلسوں میں دکھائی دیتا ہے۔(۷)

دور اسلامی کے ادبی اور تاریخی متون پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے جنوب میں واقع خلیج کے تین نام مشہور تھے: بحرِ فارس، خلیج فارس اور دریائے فارس البتہ یہ تینوں نام ادبی اور تاریخی متون میں کبھی کبھار معمولی تبدیلی کے ساتھ دریائے فارسی یا عربی الف لام کے اضافے سے بحر الفارسی یا خلیج الفارسی کی صورت میں بھی مستعمل رہے ہیں۔

فارسنامہ ابن بلخی میں، جو چھٹی صدی کے اوائل میں تالیف ہوئی اور قبل از اسلام کے فارس کے جغرافیہ کے معتبر متون میں شمار ہوتی ہے، یوں آیا ہے:

> یہ دریائے پارس ایک عظیم سمندر کا جسے بحرا خضر اور بحرِ محیط بھی کہتے ہیں بازو ہے، اور چین، سندھ، ہندوستان، عمان، عدن، زنجبار، بصرہ اور بعض دیگر شہر بھی اسی سمندر کے کنارے پر واقع ہیں۔ اس سمندر کا جو بھی بازو کسی علاقے کے اندر تک چلا گیا ہے، وہ اسی علاقے کی مناسبت سے مشہور ہوگیا ہے جیسے دریائے پارس اور دریائے بصرہ وغیرہ، اسی لیے اس بازو کو بحرِ فارس کہتے ہیں(۸)

ابوریحان البیرونی *التفہیم* کی فصل ''نہادِ معمورہ و آباد انیہا'' میں لکھتا ہے:

> پہلے بحرِ چین ہے اس کے بعد بحرِ ہند، جس سے آبادیوں کی طرف بڑی بڑی خلیجیں نکلتی ہیں جن میں سے ہر ایک خلیج فارس کی طرح خود ایک سمندر ہیں... اور وہاں سے دو عظیم خلیجیں نکلتی ہیں ایک تو قلزم کے نام سے معروف ہے اور سرزمینِ عرب کی جانب چلی جاتی ہے۔ اس کے اور خلیج فارس کے مابین بعض جزیرے موجود ہیں...(۹)

چوتھی صدی کی ایک مستند کتاب *حدود العالم من المشرق الی المغرب* کے مؤلف کا بیان ہے:

> چوتھی کو خلیج فارس کہتے ہیں، جو فارس کی حدود سے لے کر نسبتاً کم چوڑائی کے ساتھ حدود سندھ تک پھیلی ہوئی ہے اور اس عظیم سمندر کے ہر حصے کو اسی شہر اور علاقے کے نام کی مناسبت سے پکارا جاتا ہے جس سے وہ ملحق اور پیوستہ ہے، جیسا کہ بحر فارس اور بحر بصرہ اور بحر عمان کی حدود میں اور بحر زنگستان اور بحر ہند وعلی ھذا القیاس(۱۰)

آٹھویں صدی کے نامور مؤرخ ابن خلدون اندلسی نے بارہا ہمارے ملک کے جنوب میں واقع سمندر کو ایران اور فارس سے منسوب کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

> اس حصے کے شمالی علاقوں میں بحر فارس، عبادان اور ابلہ کے نزدیک ختم ہوجاتا ہے۔ دریائے دجلہ بہت سی شاخوں میں تقسیم ہوجانے کے بعد یہاں آتا ہے اور دریائے فرات کی کئی نہریں اس سے آملتی ہیں اور پھر وہ سارے (دریا اور نہریں) عبادان کے نزدیک باہم مل جاتے ہیں اور بحر فارس میں جاگرتے ہیں... اور اس کے مشرقی کنارے پر فارس کے جنوبی سواحل نظر آتے ہیں۔ اس حصے میں بحر فارس کے شمال میں کرمان کے قفص (۱۱) نامی پہاڑ واقع ہیں۔(۱۲)

Marfat.com

یہی مصنف ایک اور جگہ لکھتا ہے:''دریائے دجلہ کا منبع آرمینیا کے منطقہ ''خلاط'' میں واقع ایک چشمہ ہے... اور وہ آخر کار بحر فارس میں ضم ہوجاتا ہے۔''(۱۳) '' اور اس کے آغاز سے انتہا تک چار سو چالیس فرسخ کا فاصلہ ہے اور اسے ''دریائے فارس'' کہتے ہیں۔''(۱۴)

لغت نویسوں اور جغرافیہ دانوں نے بھی ایران کے جنوب میں واقع سمندر کو ایران سے منسوب کرنے میں کبھی شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ منتھی الارب کے مصنف لکھتے ہیں: ''جزیرہ عبادان دجلہ کی دو شاخوں کے درمیان واقع ہے اور وہ دونوں شاخیں بحر فارس میں گرتی ہیں۔(۱۵)

معاصر ایرانی مؤرخین نے بھی تمام جگہوں پر ایران کی جنوبی خلیج کو خلیج فارس ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔ مشہور مؤرخ عباس اقبال لکھتے ہیں''یہ واقعہ ۱۱۷۹ھ میں وقوع پذیر ہوا اور یہ ولندیزیوں کے خلیج فارس اور اس کے سواحل اور جزائر پر تسلط کے خاتمے کا زمانہ ہے۔''(۱۶)

اسی طرح معاصر مستشرقین نے بھی زیر بحث علاقے پر خلیج فارس کے نام کا اطلاق کیا ہے: سر آرنولڈ ولسن(۱۷) نے اپنی معروف کتاب کا نام ہی The Persian Gulf رکھا ہے۔

فارسی ادب کے متون میں بعض مرتبہ جز اور کل کے تعلق کی بنا پر خلیج فارس کو بحرِ محیط بھی کہا گیا ہے۔ پانچویں صدی کے مشہور شاعر ناصر خسرو لکھتے ہیں:

عبادان ایک جزیرے کی طرح سمندر کے کنارے واقع ہے جبکہ وہاں اس کا شط کچھ اس طرح سے دو شاخوں میں تقسیم ہوگیا ہے کہ کسی بھی جانب سے پانی کو عبور کیے بغیر عبادان نہیں پہنچا جاسکتا اور عبادان کے جنوب میں بحر محیط واقع ہے کہ جب وہ حالتِ مد میں ہو تو عبادان کی دیوار تک پانی آپہنچتا ہے اور جب جزر کی حالت میں ہوتا ہے تو پانی دو فرسخ سے کمتر دور ہوجاتا ہے۔(۱۸)

اسلامی دور کے دیگر مؤرخین اور جغرافیہ دانوں نے بھی جب کبھی کسی مناسبت سے خلیج فارس کا ذکر کیا تو اسے مندرجہ بالا صورتوں ہی میں سے کسی ایک صورت میں ثبت کیا ہے۔ بعض شواہد ملاحظہ ہوں:

○ دوسرا سمندر جو بحر حبشہ سے نکلتا ہے اس کا نام ''خلیج سبز'' ہے۔ یہ سمندر سندھ اور یمن کے احقاف (احقف یعنی اونچا ریگستان کی جمع) کے درمیان جدا ہوجاتا ہے اور شمال میں ذرا مغرب کی جانب متمائل ہوکر اقلیم دوم کے بخش ششم میں بصرہ کے ساحلوں میں واقع ابلہ سے ہوتے ہوئے گزرتا ہے جو اس سمندر کے نکتہ آغاز سے چار سو چالیس فرسخ کے فاصلے پر ہے اور اسے بحر فارس کہتے ہیں۔(۱۹)

(ابن خلدون تیونسی مورخ، آٹھویں صدی ہجری)

Marfat.com

○ سندھ سے لے کر عمان تک کے بحر فارس میں واقع جزائر کو، ملک فارس میں محسوب کیا گیا ہے۔(۲۰) (حمد اللہ مستوفی جغرافیہ دان آٹھویں صدی ہجری)

○ بحر فارس بحر ہند کی ایک شاخ ہے۔(۲۱) (یاقوتِ حموی رومی، جغرافیہ دان، پانچویں صدی ہجری)

○ اس سمندر سے خلیج فارس جدا ہوجاتی ہے جس کا نام بحر فارس ہے۔(۲۲) (علی بن حسین مسعودی، مورخ قرن چہارم)

○ دجلہ بھی ابلہ سے آبادان کا رخ اختیار کرلیتا ہے اور وہاں سے خلیج فارس میں جاگرتا ہے۔(۲۳) (طاہر بن مطہر مقدسی، جغرافیہ دان چوتھی صدی ہجری)

○ بحر فارس کے حیرت انگیز امور میں سے ایک یہ ہے کہ رات کے وقت جب سمندری امواج ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتی ہیں، تو لوگ انہیں دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔(۲۴) (بزرگ بن شہریار، جغرافیہ دان، چوتھی صدی ہجری)

○ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ بحر فارس اور بحر ہند کی آپس میں پیوستگی اور جڑاؤ اس طور سے ہے جو ان دونوں کو ایک سمندر کی شکل دے دیتا ہے۔(۲۵) (ابن الفقیہ ہمدانی، جغرافیہ دان، تیسری صدی ہجری)

○ کرمان کے شہروں میں بحر فارس اور اس خلیج سے جو اس سمندر سے نکلتی ہے بڑا کوئی سمندر موجود نہیں۔(۲۶) (اصطخری)

○ خوزستان میں کوئی سمندر نہیں مگر تھوڑا سا جو بحر فارس اور ماہی رویان سے لے کر آبادان کے قریب سلیمانان تک واقع ہے۔(۲۷) (اصطخری)

○ خلیج فارس کو بعض مرتبہ (مشرقی سمندر) کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے، مثلاً '' دجیلِ اھواز (دریائے کارون) کا سرچشمہ اصفہان کی سرزمین میں ہے اور وہ '' مشرقی سمندر'' میں جاگرتا ہے۔ (ابن خرداذبہ، تیسری صدی ہجری) (۲۸)

○ دریائے شوش کا سرچشمہ دینور میں ہے اور وہ بھی دجیل اھواز (دریائے کارون) میں گرتا ہے اور مشرقی سمندر جو کہ شاذروان شوشتر کے اوپر دجیل سے جدا ہوجاتا ہے، وہ مشرقی سمندر میں ضم ہوجاتا ہے۔(۲۹) (ابن خرداذبہ)

ترجمہ: جاوید اقبال قزلباش

منابع

۱۔ ملاحظہ ہو: دیوان ہاتف اصفہانی، بہ تصحیح وحید دستگردی، انتشارات فروغی
۲۔ Nearecus
۳۔ Arnold Talbot Wilson, *The Persian Gulf* ترجمہ فارسی از محمد سعیدی، انتشارات بنگاہ ترجمہ ونشر کتاب، ۱۳۴۸ ش، ص ۱۵۔۱۴
۴۔ ایضاً، ص ۱۵
۵۔ خلیج فارس میں واقع ایک جزیرہ، بندر لنگہ سے بیس میل دریائی کے فاصلہ پر

☆☆☆

Marfat.com

۶۔دائرۃ المعارف فارسی، بہ سرپرستی غلام حسین مصاحب، ج۱، ۱۳۴۵ش، ص ۹۱۳۔۹۱۲
۷۔افسوس ہے کہ کبھی تو المنجد جیسی کتابوں میں بھی، جو کہ ماخذ اور مرجع کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، اس طرح کی غلطیاں مشاہدہ میں آتی ہیں۔ رک: المنجد، باب معجم اعلام الشرق و الغرب، ج ۱۵، سال ۱۹۵۶ء، مطبع کاتولیکیہ بیروت، ص ۹۔۸ اور پھر اسی نقشے کی پچھلی طرف ایک نقشہ اور ص ۴۱ پر موجود ہے جس میں خلیج العربی درج کیا گیا ہے۔ صفحہ ۴۱ سے پہلے دوسرے دو نقشوں میں اوپر خلیج العربی اور اس کے بعد خلیج الفارس آیا ہے۔
۸۔فارسنامہ، ابن البلخی، ص ۱۵۳۔۱۵۲
۹۔التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم، تالیف ابو ریحان بیرونی، تصحیح استاد ہمائی، انتشارات انجمن آثار ملی، شمارہ ۱۰۹، ص ۱۶۷
۱۰۔رک: حدود العالم من المشرق الی المغرب، مجہول المولف، تالیف سال ۳۷۲ھ، بہ کوشش منوچہر ستودہ، انتشارات دانشگاہ تہران، ۱۳۴۰ش، ص ۱۲ نیز دیکھیے ایک اور مجہول المولف کتاب مجمل التواریخ و القصص، بہ تصحیح ملک الشعراء بہار، انتشارات موسسہ خاور، تہران، ۱۳۱۸ش، ص۴۷۸
۱۱۔ظاہراً یہ کنج کا معرب ہے۔
۱۲۔مقدمہ ابن خلدون ترجمہ محمد پروین گنابادی، تہران، انتشارات علمی و فرہنگی، پانچواں ایڈیشن، ج۱، ۱۳۶۶ش، ص ۱۱۵
۱۳۔ایضاً، ص ۸۷
۱۴۔ایضاً، ص ۸۶
۱۵۔منتہی الارب فی لغات العرب، مولوی عبدالرحیم بن عبدالکریم صفی پوری، ۱۲۸۹ش، ص ۷۸۸
۱۶۔بحرین و جزائر و سواحل خلیج فارس، عباس اقبال، ص ۱۰۹
۱۷۔ Sir Arnold Talbot. Wilson ، ملاحظہ ہو: فٹ نوٹ ۳، فوق
۱۸۔سفرنامہ، ناصر خسرو، بہ کوشش دکتر دبیر سیاقی، انتشارات انجمن آثار ملی، شمارہ ۱۲، ۱۳۵۴ش، ص ۱۶۱
۱۹۔مقدمہ ابن خلدون، ترجمہ محمد پروین گنابادی، ص ۸۶
۲۰۔نزہۃ القلوب، تصحیح دکتر دبیر سیاقی، ص۱۶۴
۲۱۔معجم البلدان، چاپ قاہرہ، ج ۲، ص ۶۸
۲۲۔مروج الذہب و معادن الجوہر، تالیف ابو الحسن بن حسین المسعودی، ص ۲۲۸
۲۳۔خلیج فارس، انتشارات رادیو، ۱۳۴۲ش، ج ۱، ص ۴۳
۲۴۔عجایب الہند برہ و بحرہ و جزایرہ، ص ۴۱
۲۵۔مختصر کتاب البلدان، ص ۸
۲۶۔ممالک و مسالک، ابو اسحق ابراہیم اصطخری، ترجمہ محمد بن اسعد بن عبداللہ تستری، بہ کوشش ایرج افشار، بنیاد موقوفات افشار، ۱۳۷۳ش، ص ۱۶۴
۲۷۔مسالک و ممالک (ترجمہ فارسی) ابو اسحق ابراہیم اصطخری، کوشش ایرج افشار، بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب، ۱۳۴۰ش، ص ۹۰
۲۸۔المسالک والممالک، ابن خردابہ، ترجمہ دکتر حسین قرہ چانلو، تہران، ۱۳۷۰ش، ص ۲۸
۲۹۔ ایضاً، ص ۱۵۲

☆☆☆

Marfat.com

رابعہ خضداری

فارسی زبان کی پہلی شاعرہ

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش ☆

ادب میں کچھ نام ایسے ہیں جن کے آثار و افکار کے حوالے سے معلومات و مواد کم ہونے کے باوجود، کوئی بھی تحقیقی عمل ان کے ذکر کے بغیر آگے نہیں بڑھتا۔ ایسا ہی ایک نام زین العرب رابعہ خضداری کا ہے، جنکے ذکر کے بغیر فارسی شاعری کی بات آگے بڑھانا ناممکن ہے، بالخصوص جب بات خواتین کی آتی ہے۔ اگرچہ اس شجاع و عالی دماغ خاتون کا ہمارے پاس سوائے ۵۲ اشعار کے اور کوئی اثر موجود نہیں لیکن فارسی ادب کے ابتدائی تذکرے **لباب الالباب عوفی** سے لے کر ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کے **تاریخ ادبیات ایران**، تک میں رابعہ کا ذکر ملتا ہے، مگر وہی چند جملے، چند شعر اور ایک آدھ واقعہ، جس کو افسانوی بھی کہا جاسکتا ہے۔

یہی تو کمال ہے رابعہ نے چند شعر کہہ کر خود کو زندہ جاوید کردیا، حالانکہ ہزاروں کی تعداد میں شعر کہنے والے ہزاروں ایسے شعرا ہیں جن کے نام تک بھی کسی کے حافظے میں محفوظ نہیں۔ اس کی ایک وجہ تو وہی فارسی کی پہلی خاتون شاعر ہونے کا اعزاز ہے لیکن میرے خیال میں اس کا کمال صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ اس نے بڑی معیاری، متفکرانہ، جوش و جذبہ اور غنایت سے بھرپور شاعری کی ہے۔ کاش ان کی ساری نہیں تو ایک چھوٹے دیوان کے برابر شاعری محفوظ رہ جاتی۔ ان کے مقابلے میں رودکی خوش قسمت ہے کہ اس کا دیوان ہمارے پاس ہے، اگرچہ ایک لاکھ اشعار میں سے صرف نوسو شعر باقی ہیں۔

رودکی کے دور میں دیگر شعرا بھی تھے جن میں سے ایک آدھ کے علاوہ سب دوسرے درجے کے شعرا شمار ہوتے تھے، جبکہ رابعہ کے شعری کمال کا اعتراف مختلف تذکرہ

☆ استاد شعبۂ فارسی، گورنمنٹ کالج، کوئٹہ

Marfat.com

نگاروں نے بھی کیا۔ محمد عوفی نے اسے اس شعر کی مناسبت سے کہ

خبر دھند کہ بارید برسر ایوب　　ز آسمان ملخان و سر ہمہ زرین
اگر ببارد زرین ملخ بر او از صبر　　سزد کہ بارد برمن یکی مگس روبین(۱)

''مگس روئین'' کے لقب سے یاد کیا ہے اور کہتا ہے کہ '' اگرچہ زن بود اما بہ فضل بر مردان جہان بخندیدی''(۲) جبکہ مصحف ابراھیم میں آیا ہے کہ ''رابعہ زنی بود کہ درمیدان قابلیت و استعداد گوی سبقت از مردان می ربود۔''(۳) رابعہ کی ایک سبقت رودکی یا دیگر ہم عصر شعرا کے حوالے سے یہ بھی ہے کہ یہ خاتون عرب تھی نہ کہ فارس، یعنی فارسی اس کی مادری زبان نہیں تھی۔ ممکن ہے اس خاتون نے عربی میں بھی شاعری کی ہو جس کی جھلک ان کے فارسی اشعار میں ملتی ہے بلکہ شمس قیس رازی نے تو المعجم میں اسے فارسی و تازی کی شاعرہ کہا ہے اور اس کی طرف سے فارسی اوزان میں اضافے کا اعتراف بھی کیا ہے۔ محققین رودکی اور رابعہ کا زمانہ ایک ہی بتاتے ہیں اور رودکی کی طرح اس کو بلخی بھی کہا جاتا ہے، پھر یہ کہ اس کا مقبرہ بھی اسی علاقے میں ہے نہ کہ خضدار میں۔ یہاں یہ بحث مقصود نہیں ہے کہ رابعہ خضداری تھی یا بلخی، کیونکہ محققین اس نکتے پر بھی تقریباً متفق ہیں کہ رابعہ کا تعلق ان دونوں علاقوں سے ہوسکتا ہے کیونکہ انکے والد کعب اس علاقے کے حاکم تھے اور ان کی فرمانروائی میں بلخ و خضدار دونوں آتے تھے۔ جہاں تک لفظ خضدار کا تعلق ہے تو تقریباً تمام تذکروں میں ''قزدار'' آیا ہے جو خضدار ہی کا قدیم نام ہے۔

اس زمانے میں خراسان ایک وسیع و عریض علاقہ تھا جس کے قلمرو میں نیشابور، مرو، ہرات، اور بلخ آتے تھے۔ یہ دارالخلافوں کے علاوہ علمی و ادبی اور عرفانی مراکز کے طور پر بھی پہچانے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر حمیرا زمردی کعب کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> حاکم یکی از چہار پایتخت خراسان کہ عبارت بود از نیشابور، مرو، ہرات وبلخ از سوی شاہان سامانی انتخاب می شد. ازین روسی توان گفت یکی از حکام بلخ در عہد امیر سامانی، شخصیتی بہ نام کعب بودہ و مناطق بلخ و قزدار محل استقرار او بود۔(۴)

یعنی ان چار مراکز میں حاکم امیر نصر سامانی کی جانب سے مقرر کیے جاتے تھے، جن میں سے کعب نامی شخصیت کی سکونت کے مقامات بلخ اور خضدار تھے۔ اس موضوع پر ابراہیم خلیل کے تذکرۂ صحف ابراھیم وغیرہ میں بھی مباحث ملتے ہیں۔ مجمع الفصحا کے مطابق کعب عرب تھا اور اس نے بلخ، قندھار و سیستان کے علاقوں میں فتوحات کیں۔

Marfat.com

عرب کے مختلف قبائل کو فتوحات کی غرض سے عرب خلفا مختلف علاقوں میں بھیجا کرتے تھے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی کعب کا قبیلہ بھی تھا۔ ابوبکر محمد ابن جعفر نرشخی کی تاریخ بخارا کے مطابق یہ قبائل قتیبہ بن مسلم کے دور میں بخارا آئے تھے۔ واضح رہے کہ ابومسلم اور قتیبہ بن مسلم دو مختلف شخصیتیں ہیں لیکن اس حوالے سے کچھ تذکروں میں قتیبہ بن مسلم کی بجائے ابومسلم بھی آیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ بہرحال رابعہ، خضداری بھی ہیں اور ہمیں فخر ہے کہ پہلی فارسی گو شاعرہ کا تعلق بلوچستان سے ہے۔

رابعہ کی شاعری میں جیسا کہ ذکر ہوا شعری آہنگ، تفکر اور پختگی موجود ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ رابعہ نے صرف یہی چند شعر نہیں کہے بلکہ باقاعدہ شاعری کی ہے۔ ایک اور اعزاز جو اس شاعرہ کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس کی پیروی میں بہت سے شعرا نے شعر کہے۔ جبکہ فن شاعری میں ان کے ہاں صنعت ملمع، ارسال المثل، التفات، جمع و تفریق، تضاد اور غزل میں پہلی بار نئی ردیفوں کا استعمال ملتا ہے۔ڈاکٹر زمردی کے بقول رابعہ کے ہاں سادگی کے علاوہ فکر و کلام کی روانی، فطرت کی عکاسی، عشق کا سوز بھی نظر آتا ہے، لیکن ان کا خیال ہے کہ حکمت اور عرفان خصوصیت کے ساتھ نہیں ملتے۔(۵)

قابل ذکر ہے کہ رابعہ کی شاعری کو عرفا نے اپنے مقصد کی شاعری سمجھا اور ایک باقاعدہ عارفہ سمجھتے ہوئے ان کی شاعری سے رقص و سماع کی محفلوں میں استفادہ بھی کیا، حتی کہ اس کے بکتاش کے ساتھ عشق کو بھی عشق حقیقی کے پہلے زینے کا نام دیا گیا۔ مولانا جامی اور شیخ عطار کے ہاں یہی حوالے بڑی شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کے مطابق، جامی نے اس کو زاہد اور صوفی شعرا میں شامل کیا ہے اور جامی نے ابوسعید ابوالخیر کے بقول کہا ہے کہ کعب کی بیٹی ایک غلام کی عاشق تھی لیکن اس کا عشق مجازی نہیں تھا، ہدایت نے *مجمع الفصحا* میں لکھا ہے، کہ وہ بکتاش نامی غلام کی طرف مائل ہوئی اور عشق حقیقی تک پہنچ گئی۔(٦)

عطار نے *الهی نامه* میں رابعہ اور بکتاش کے عشق کی داستان کو ۴۲۳ شعروں میں ''حکایت رابعہ دختر کعب'' کے عنوان سے بیان کیا ہے، جس میں بلخ میں کعب کی امارت، اس کی شخصیت اور رعب و دبدبہ کا ذکر، اس کے بیٹے حارث کی شخصیت، جوانمردی اور شجاعت کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے اور رابعہ کے حسن و جمال اور خرد کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

بنام آن سیمبر زین العرب بود
دل آشوبی و دلبندی عجب بود

Marfat.com

جمالش ملک خوبان در جهان داشت
به خوبی در جهان او بود که آن داشت
خرد در پیش او دیوانه بودی
به خوبی جهان افسانه بودی
کسی گر نام او بردی بجایی
شدی هر ذره ای یوسف نمایی
مه نو چون بدیدی ز آسمانش
زدی چون چنگ زانو هر زمانش (۷)

گیارہ توصیفی اشعار کے بعد کہتے ہیں:

جمالش را صفت کردن محال است
که از من آن صفت کردن خیال است
به لطف طبع او مردم نبودی
که هر چیزی که از مردم شنودی
همه در نظم آوردی به یکدم
بپیوستی چو مروارید درهم
چنان در شعر گفتن خوش زبان بود
که گویی از لبش طعمی در آن بود (۸)

اور پھر کعب کی موت اور رابعہ کے بارے میں حارث کو اس کی یہ وصیت کہ اس کا خیال رکھے اور اس کے لیے اس جیسا رشتہ ڈھونڈے، منظوم کرتے ہیں۔ اس طرح حارث کی رابعہ کے لیے احترام اور محبت کی کہانی کو منظوم کرنے کے بعد، عطار آتے ہیں حارث کے ترک نژاد غلام بکتاش کی جانب اور اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

غلامی بود حارث را یگانه
که او بودی نگهدار خزانه
بنام آن ماه وش بکتاش بودی
ندانم تا کسی همتاش بودی (۹)

اور پھر بکتاش کے حسن وشجاعت کی تعریف کے پل باندھتے ہوئے رابعہ کو اس کے عشق میں مبتلا بیان کرتے ہیں۔ رابعہ اپنی ہمراز دایہ کے توسط سے اس کو اشعار اور خط لکھ کر بھیجتی ہے

Marfat.com

اور اپنی تصویر بھی بنا ڈالتی ہے، یعنی عطار کے مطابق رابعہ فن مصوری کی بھی ماہر تھی۔ مختصر یہ کہ بکتاش بھی رابعہ کی زلف کا اسیر ہوجاتا ہے۔ پہلی ملاقات میں اس کا دامن پکڑتا ہے تو رابعہ اس کو دھتکارتے ہوئے کہتی ہے: کہ میرا عشق لاہوتی ہے اور تم ہوس کا شکار ہورہے ہو۔ یہاں آکر عطار اپنے مقصد کو بیان کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رابعہ غلام سے کہتی ہے۔

مرا در سینہ کاری اوفتادہ است
ولیکن از تو آن کارم گشادہ است
تو را این بس نباشد در زمانہ
کہ تو این کار را باشی بہانہ (۱۰)

یعنی بکتاش ایک بہانہ ہے، عشق تو کسی اور مقام کا متقاضی ہے۔

عطار کے مطابق بالآخر ایک روز رودکی کی رابعہ سے کہیں راستے میں ملاقات ہوتی ہے تو ان کے درمیان شعروں کا تبادلہ ہوتا ہے جس میں رابعہ، رودکی کے مصرعوں اور شعروں کے فی البدیہہ جواب دیتی ہے۔ رودکی جب بخارا لوٹتا ہے اور شاہ کے دربار میں جاتا ہے تو وہاں حارث بھی موجود ہوتا ہے۔ اس وقت ایک عظیم الشان جشن کے اہتمام میں، شاہ، رودکی سے شعر کی فرمائش کرتا ہے، تو رودکی رابعہ کے چند شعر سناتا ہے اور شاعرہ کا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ رابعہ نامی شاعرہ ہے جو کعب کی بیٹی ہے اور اپنے بھائی کے غلام کے عشق میں اس طرح کی شاعری کرتی ہے۔ یہ ساری باتیں حارث سن لیتا ہے واپسی پر ثبوت کی تلاش میں بکتاش کے ایک دوست کے ذریعے ان خطوط اور اشعار تک رسائی حاصل کرلیتا ہے جو رابعہ نے بکتاش کو لکھے تھے اور اس اساس پر بکتاش کو کنویں میں بند کرکے رابعہ کو ایک حمام میں اس کی کلائیوں کی رگیں کاٹ کر قید کردیتا ہے جہاں رابعہ اپنے خون سے حمام کی دیواروں پر اشعار لکھ لیتی ہے۔ عطار نے ان اشعار کو اپنے اس منظومے میں نقل کیا ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ یہ عطار کی اپنی طبع کا کمال ہے یا رابعہ ہی کے اشعار ہیں۔ مختصر یہ کہ رابعہ وہیں جان دے دیتی ہے اور بکتاش بھی کسی طرح کنویں سے نکل کر حارث کو قتل کرکے رابعہ کی قبر پر جا کر اپنے سینے میں خنجر گھونپ لیتا ہے۔

عطار چونکہ عارف تھا تصوف کی دنیا کا آدمی تھا لہٰذا اس نے رابعہ کو بھی ایک عاشق حقیقی کے طور پر متعارف کیا ہے۔ اب یہ کہانی افسانہ ہو یا حقیقت، لیکن رودکی اور رابعہ کی ملاقات یقین نہ کرنے والی بات ہے، کیونکہ رابعہ کی تعریف اور کعب و حارث کے گھر کے ماحول کا جس طرح عطار نے نقشہ کھینچا ہے اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ رابعہ ایک شاہی

Marfat.com

خاندان کی عورت ہوتے ہوئے گھر سے نکل کر سر راہ کبھی نہیں بیٹھ سکتی اور پھر یہ بھی کہ رابعہ نے رودکی سے صرف شعروں کا تبادلہ کیا تھا نہ کہ اسے بکتاش اور اپنے عاشق کی کہانی سنائی تھی اور ممکن بھی نہیں تھا کہ اجنبی کو رابعہ اس طرح اپنے دل کا حال سناتی۔

رابعہ کی تاریخ پیدائش، وفات اور باقی حالات سے ہم بے خبر ہیں۔ تذکرے بھی اس سلسلے میں ہماری مدد نہیں کرتے۔ بس اتنا ہی آیا ہے کہ وہ رودکی کی ہم عصر تھی جیسا کہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ ''رابعہ قزداری بلخی جو رودکی کی ہم عصر تھی اس کا باپ کعب اعراب میں سے تھا لیکن رابعہ عجم میں پیدا ہوئی اور اس وجہ سے عربی فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھی۔''(۱۱) لیکن ڈاکٹر کلثوم فاطمہ سید نے استاد سعید نفیسی کے حوالے سے اس امر کو بھی رد کیا ہے، وہ لکھتی ہے کہ فریدالدین عطار نے *الھی نامہ* میں رابعہ کو رودکی کا ہم عصر لکھا ہے جبکہ تذکرہ نگاروں نے اسے رودکی کا معاصر نہیں مانا ہے۔(۱۲) ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کے مطابق رابعہ ہجری چوتھی صدی کی شاعرہ ہیں وہ لکھتے ہیں ''رابعہ بنت کعب قزداری بلخی از شاعران قرن چہارم ہجریست''۔(۱۳)یعنی ان کی زندگی کے بارے میں ان کے چند شعر اور یہ واقعہ ہی سب کچھ ہے، بلکہ عطار اسے اسی حکایت میں ایک جنگجو خاتون کے طور پر پیش کرتے ہیں جو اپنے بھائی کے فوج کی شکست کو فتح میں بدلتے ہوئے بکتاش کی جان بھی بچاتی ہے۔

بعض بڑے شعرا نے رابعہ کی پیروی بھی کی ہے۔ یہاں چند ایک نمونے ملاحظہ ہوں، رابعہ کی غزل کا مطلع ہے کہ

الا ای باد شبیگری پیام من به دلبر بر
بگو آن ماه خوبان را که جان بادل، برابر بر

اس سے شیخ عطار اس طرح استفادہ کرتے ہیں:

الا ای باد شبیگری گذر کن
ز من آن ترک یغمار اخبر کن

اور رابعہ کے ان اشعار سے مولانا جلال الدین رومی نے بھی استفادہ کیا ہے:

دعوت من بر تو آن کایزدت عاشق کناد
بر یکی سنگین دل نامهربان چون خویشتن

تا بدانی درد عشق و داغ مهر و غم خوری
تا به هجر اندر بپیچی و بدانی قدر من

Marfat.com

رومی کہتے ہیں:

ای خداوند یکی یار جفا کارش ده
دلبری عشق دهی سرکش و عیارش ده
تا بداند که شب ما به چسان می گذرد
غم عشقش ده و عشقش ده بسیارش ده (۱۴)

فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں کے شعرا نے بھی رابعہ سے اثر لیا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر ہم پشتو کے عظیم شاعر خوشحال خان خٹک کے اس شعر کو پیش کرتے ہیں۔

ما بے کچه تو سنی کڑه منجیدلم
عاقبت ئی پسه کمند وحکیژلم (۱۵)

اب رابعہ کا شعر دیکھئے:

تو سنی کردم ندانستم، همی
کز کشیدن تنگ تر گردد کمند (۱۶)

آخر میں رابعہ کی یہی خوبصورت غزل ملاحظہ ہو۔

عشق او باز اندر آوردم به بند
کوشش بسیار نامد سودمند
عشق دریایی کرانه ناپدید
کی توان کردن شنا ای هوشمند
عشق را خواهی که تا پایان بری
بس که نپسندید باید ناپسند
زشت باید دید و انگارید خوب
زهر باید خورد و انگارید قند
تو سنی کردم و دانستم همی
کز کشیدن تنگتر گردد کمند (۱۷)

Marfat.com

مآخذ

۱۔ذبیح اللہ صفا، تاریخ ادبیات ایران، ج ۱، تہران ، انتشارات فردوس، بارہواں ایڈیشن، ۱۳۷۱ ش، ج ۱، ص ۴۴۹
۲۔انعام الحق کوثر، بلوچستان میں فارسی شاعری، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، ۱۹۶۸ء
۳۔حمیرا زمردی، ''تحلیل و بررسی رابعہ و بکتاش در الہی نامۂ عطار و زندگی در اشعار'' فصلنامہ دانش، شمارہ ۶۱۔۶۰
۴۔دانش، شمارہ ۶۱۔۶۰
۵۔ ایضاً، ص ۱۹۷
۶۔تاریخ ادبیات ایران، ج ۱، ص ۴۵۰
۷۔منطق الطیر، الہی نامہ ، ص ۴۵۲، بہ نقل از کلثوم فاطمہ سید، تحقیق در الہی نامہ ، اسلام آباد ، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۲۰۰۲ء
۸۔الہی نامہ، ص ۴۵۳
۹۔ایضاً، ص ۴۵۴
۱۰۔منطق الطیر، الہی نامہ، ص ۴۵۹
۱۱۔شبلی نعمانی؛ شعر العجم، حصہ اول، لاہور: الفیصل ، ۱۹۹۹ء، ص ۲۴
۱۲۔تحقیق در الہی نامہ، ص ۱۰۵
۱۳۔تاریخ ادبیات ایران، ج ۱، ص ۴۴۹
۱۴۔دانش، شمارہ ۶۱۔۶۰
۱۵۔ارمغان خوشحال، پشاور: یونیورسٹی بک ایجنسی، ۲۰۰۱ء
۱۶۔تاریخ ادبیات ایران، ج ۱، ص ۴۵۱
۱۷۔ایضاً، ج ۱، ص ۵۱۔۴۵۰

☆☆☆

Marfat.com

مولانا روم کی روحانی درخشندگی

یوم رومی کے موقع پر پیغام

حجۃ الاسلام محمود محمدی عراقی ☆

خدائے یکتا کا شکر ہے کہ جس نے ہمیں یہ افتخار عطا کیا کہ اسلامی ایران کے نام و نشان پر نازاں ہوں اور اس قدیم خطے کی نامور ثقافتی شخصیات کی یاد منا کر ایران کے پرشکوہ ادوار کے ذکر سے اس سرزمین کے شاندار ماضی کو اجاگر کریں۔

۸ مہرماہ کا دن ایران کی تقویم میں مولانا روم کے روشن ذہن اور ضمیر سے جگمگاتا ہوا ایک عجیب معنوی جلوہ پیش کرتا ہے۔ مولانا جلال الدین محمد نے انسانی تاریخ پر کچھ ایسا اثر مرتب کیا ہے کہ زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کے عشاق کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے اور بے شمار لوگ ان کی روحانی تعلیمات کو دل میں بسا کر ان کی طبع جنوں خیز سے ہماہنگی اختیار کرلیتے ہیں۔

ممتاز ترین شخصیات نے ہمیشہ تاریخ انسانی کے پرآشوب ترین ادوار ہی کے اندر ظہور کیا۔ مولانا روم کی تلاطم خیز زندگی اسی دور سے جب وہ اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ حجاز تشریف لے گئے ایک ایسی راہ پر چل نکلی جو انہیں مسلسل حق و حقیقت کے علائم پر تأمل پر اکساتی رہی۔ آپ ہر شے کا گہری نگاہ سے مشاہدہ کرتے، اپنے وجود پر غور کرتے اور جب تجلی مشاہدہ کا وجدان کے دل و جان پر طاری ہوجاتا تو وہ پاکوبی و رقص و ہیجان کے عالم میں اپنی دریافت کردہ روحانی حقیقتوں کو محرمان خلوت انس کے سامنے دہراتے اور وحدت و فنا اور عالم ربانی سے اتحاد و اتصال کے ذریعے دریافت شدہ شہد سے دیگر عشاق کے کام و دہاں کو بھی شیریں کردیتے۔

صدیوں کی طولانی مسافتوں کے بعد آج بھی مولانا کے فکر و اندیشہ کی گرمی و تابش

☆ رئیس سازمان فرہنگ و ارتباطات اسلامی تہران، ایران

Marfat.com

عقلیت پرست انسان کی پھیلائی ہوئی عالمی سردی اور انجماد کی برفانی چادر کو مسلسل پگھلا رہی ہے۔ عالم معنویت سے رابطہ قائم کرنے کے لیے سرگردان انسان، آج بھی مولانا روم کے عرفانی و معنوی آثار سے دلبستگی پیدا کر کے تفرقے اور انتشار کی اُن بلاؤں سے جنھوں نے اس کی پرسکون اور قدرتی زندگی کو خطرہ میں ڈالا ہوا ہے رہائی پالیتا ہے۔

معاصر انسان کے لیے مولانا کا پیغام گویا ایک ایسی دنیا کے حصول کی جستجو اور جدوجہد کا پیغام ہے جس میں انسانی ہاتھوں کی تعمیر کردہ مصنوعی سرحدیں اور دیواریں موجود نہیں ہیں۔ مولانا کا کلام گویا زمانے کی قیل و قال سے رہائی اور جان عالم سے پیوند و تعلق کا ایک ذریعہ ہے اُسی جان جہان سے تعلق کا جس کی معرفت کے لیے عشق و محبت ضروری ہے؛ جو جنگ ہفتاد و دو ملت کا مذاق اڑاتی ہوئی عالم اور اہل عالم کو امن و صلح کی نوید سناتی ہے۔ مولانا روم کی غزلیں ایک ایسے شاعر کی یاد دلاتی ہیں جو یہ چاہتا ہے کہ سارے عالم کے لیے سراسر محبتوں کا سفیر بن جائے نہ یہ کہ استدلالی راہوں سے پند و نصائح پیش کرے۔ ان کی مثنوی تعلیم کی کتاب ہے اور اسرار قرآنی کی مفسر۔

یہ ایک ایسا کلام ہے جو انسانی طبیعت کو کمال کی طرف مائل اور اداس پریشان اور خوابیدہ فطرتوں کو خلقت کے اعجاب انگیز عناصر کے دوبارہ مشاہدے کی دعوت دیتا ہے اور ''سرِ دلبراں'' کو حدیث دیگراں میں تلاش کرتا ہے۔

مکتوباتِ مولانا ایک ایسی شخصیت کے جوش و جذبے کی نشاندہی کرتے ہیں جس کی معاشرے کے مستور اور پنہاں پرتوں اور تہوں کے اندر تک نظر ہو اور جو سماجی خرابیوں اور کجیوں میں مبتلا انسان کی اصلاح کے لیے کوشاں ہو۔ یہی وجہ ہے تاریخ کے کسی بھی مرحلے میں مولانا کا کلام تکرار، کہنگی اور بوسیدگی کا شکار نہیں ہوتا۔ گویا وہ ہر جگہ موجود اور ہر شے کو دیکھ رہے ہوں، ہمیں حقایق کے انکشاف کے لیے متواتر دعوت دے رہے ہوں اور ہم میں سے ہر ایک کے کان میں ضمیر کی آواز کی رسائی کے لیے داستانِ عشق کی سرگوشی کر رہے ہوں۔

عقل گوید شش جہت حدست و بیرون راہ نیست
عشق گوید راہ ھست و رفتہ ام من بارھا

امید ہے کہ ایرانی دانشوروں اور مشاہیر و ممتاز شخصیتوں کی کوششوں سے مولانا روم کے جاودانی پیغام کی صدائے بازگشت اپنے بلند شان و مقام کے مطابق اہل عالم تک پہنچ جائے گی۔ حضرت مولانا کے آثار کی طرف مغرب کا بے نظیر لگاؤ مغربی معاشروں کی روحانی تشنگی کا غماز ہے جو مغرب کو عصیان کی تلخیوں کا ذائقہ چکھ کر مولانا اور حافظ جیسی سیرتوں کی جانب

Marfat.com

راغب کرتا ہے۔

ایرانی دانشوروں، مفکروں اور فنکاروں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عظیم ایرانی مشاہیر و مفاخر کے آثار اور ان کے حالاتِ زندگی کی دلچسپ انداز سے تشریح کریں۔اب جب کہ مغرب کے بہت سے ادیب اور محقق مولانا جیسے عارف شعرا کے آثار کے تراجم کرنے لگے ہیں تو ہماری یہ ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان بزرگوں کے آثار اور ان کے عرفانی سرمائے کو مکمل امانت کے ساتھ اہل عالم کے سامنے پیش کریں۔ قطعی اور یقینی امر ہے کہ مولانا کی غزلیات، مثنوی اور مکتوبات کے مغرب کے ادیبوں کے ذریعے کیے گئے تراجم مولانا کے افکار و آرا کی کماحقہ ترجمانی نہیں کرتے۔ چہ بسا کہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ بے روح تراجم دنیا کی دوسری زندہ و پویا زبانوں میں بھی انجام پاجائیں اور آخر میں مولانا کا جو کلام قاری تک پہنچ جائے اس کی مولانا کے اصل کلام سے کوئی مشابہت نہ ہو۔

دنیامیں ایرانی تہذیب و ثقافت کے مظاہر کی حفاظت اور ترویج کے لیے ایسی سعیِ صادق کی ضرورت ہے جو ایرانی خواتین و حضرات ہی کے ید درایت اور جذبے کی بدولت وجود میں آسکتی ہے۔

میں پوری دنیا میں مولانا رومی کے عشاق کو یوم مولانا پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُن تمام طالب علموں، اساتذہ اور فارسی زبان و ادب کے شائقین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو اس عظیم شاعر و عارف کے روحانی پیغام کے ابلاغ کے سلسلے میں کمرہمت باندھے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

یومِ حافظ کی مناسبت سے

رئیس سازمان فرہنگ و ارتباطات اسلامی ایران

حجۃ الاسلام جناب محمود محمدی عراقی کا پیغام

جونہی خواجۂ شیراز حافظ زبانِ غیب کی ترجمانی کے تخت پر بیٹھے اور انہوں نے اپنے اثر آفریں کلام سے معنی کے جواہر نثار کرنے شروع کیے صبحِ وفا کے پیغام رساں نے ہر زمانے میں ان کے فنکارانہ کلام کو دنیا کے گوشہ و کنار میں پہنچا دیا تاکہ شیراز کے اس شوریدہ سر عاشق کی غزلیں بے شمار خواہشمندوں کو کیمیائے مراد کے حصول کی منزل تک لے جاسکیں۔

حافظ کی زندگی سے اب تک طویل زمانے گذرے ہیں لیکن امتداد زمانہ سے ان کی غزلوں پر دوران کے قدموں کی کوئی گرد نہیں پڑی۔ ہم مشرق نشینوں کے لیے اب بھی رمز آشنا حافظ کی الہامی فکر اور فصیح زبان ذوق سلیم کا معیار ہے۔ کل اگر دل فارسی سے نکلی ہوئی اُس کی شہرت دریائے جیحوں کے اس پار اور ہندوستان و روم و عراق کی جانب پھیلی تھی تو آج بھی عالم کے گوشے گوشے میں حافظ کے تروتازہ اور دل انگیز اشعار لوگوں کو وجد میں لے آتے اور انہیں سکون بخشتے ہیں۔ اس لیے ہم اس کے آستاں سے ایک ایسی دنیا کا رخ کرتے ہیں جو جھوٹ اور مکرو فریب سے پاک ہے، ایک ایسی سرزمین جو اپنے باسیوں کے لیے یکرنگی اور ریا سے اجتناب کی پیامبر ہے اور ایوانِ حافظ میں صدیوں سے یہ خوبصورت سمفونیک موسیقی، جو اپنے سامعین کو مسحور اور مجذوب کر دیتی ہے، جاری ہے۔

کلامِ حافظ کا قرآن کریم سے تعلق اس بات کا موجب بنا کہ اس میں زندگی کا ولولہ موجزن ہو اور اس کے سینے میں جو قرآن موجود تھا اُس نے اس کے فن کے تناور درخت کو سیراب کیا یہی وجہ ہے کہ گنبد آسمان سے اس کے کلام کی بازگشت آج بھی مسلسل سنائی دیتی ہے۔

حافظ کے تخیل اور کلام کے بعض پہلو، جن میں حسن کی تجلی کا دیکھنا، انسانی فطرت

Marfat.com

میں عشق کا وجود، بدن کے تیرہ و تار زندان سے روح کی آزادی اور تزکیہ اور بلندی کی جانب پرواز شامل ہیں، ایسے ہیں جو ایرانی و اسلامی عرفان کی حکمت ذوقی سے اس کی روح کی اثر پذیری اور سرشاری کی غمازی کرتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ سب ایرانی اور غیرایرانی صاحبان علم و دانش کو عظیم حافظ کے کلام اور افکار سے دیرینہ انس اور محبت ہے۔ ہم یوم حافظ کے بہار قرآن یعنی ماہ رمضان مبارک کے اندر آجانے پر اس کی تجلیل کرتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی نظر کرم اور آپ خواتین و حضرات کے عزم و ہمت سے جو دنیا بھر میں ایران کے ثقافتی نمائندے ہیں، فارسی زبان کا شایان شان طور پر اس کے متوالوں اور دوستوں سے تعارف ہوگا۔

مغرب کے بہت سے مستشرقین اب قید حیات میں نہیں یا وہ بڑھاپے اور اضمحلال کے دور سے گذر رہے ہیں۔ متقدمین میں سے گذشتگان کے آثار کی قدریابی کے سلسلے میں ہمیں یہ یقین ہے کہ ہم جوان نسل کو دیوان حافظ جیسے زبان فارسی کے فصیح و بدیع نمونوں سے آشنا کریں گے۔ افسوس ہے کہ یہ نمونے جو ایران کے مفاخر میں سے ہیں ان کی شناسائی یا تو ناکافی اور کم ہوئی یا مغرض افراد نے ان کو اپنے بنائے ہوئے نیلے شیشوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔

آخر میں میں حافظ کا وہ قطعہ جو باطنی طور پر ہم سب ایرانی ثقافت کے نگہبانوں کے اندیشوں اور تشویشوں کی ایک شرح ہے اس گفتگو کی تزئین کے لیے پیش کرتا ہوں:

سرِ ارادتِ ما و آستانِ حضرت دوست
کہ ہر چہ بر سر ما می رود ارادتِ اوست
نظیر دوست ندیدم اگرچہ از مہ و مہر
نہادم آینہ ھا در مقابلِ رخِ دوست

☆☆☆

قمر العلوم قمر سیالوی روڈ گجرات

Marfat.com

سراج الدین علی خان آرزو
اور ان کا تذکرۂ مجمع النفائس

(چند معروضات)

ڈاکٹر عارف نوشاہی☆

سہ ماہی پیغام آشنا، اسلام آباد، شمارہ ۲۲، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۵، صفحات ۱۰۳۔۱۲۶ میں ڈاکٹر محمد باقر (۱۹۱۰۔۱۹۹۳ء)، سابق صدر شعبۂ فارسی، پنجاب یونیورسٹی اور اینٹل کالج، لاہور، کا مضمون ''سراج الدین علی خان آرزو اور ان کا تذکرۂ مجمع النفائس'' شائع ہوا ہے۔ مضمون بہت عمدہ ہے اور اسے اس شمارے کی آبرو اور جان کہنا چاہیے۔ ڈاکٹر محمد باقر مرحوم کو تذکروں سے خاص دلچسپی تھی اور ان کے اعتنا سے کئی اہم تذکرے شائع ہوئے ہیں، جیسے *زبدۃ المعاصرین* اور *مخزن الغرایب* وغیرہ۔ فارسی ادب، لغات اور تاریخ کی کچھ اور کتابیں بھی انہوں نے مرتب کر کے چھاپیں۔ یہاں ان کی جملہ خدمات کے احصا کا مقام نہیں ہے، مختصر یہ کہ بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں پیر حسام الدین راشدی (م ۱۹۸۱ء) کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے پاکستانی محقق تھے جن کی تحقیقات کا ایران میں چرچا رہتا تھا اور ان کا ایرانی دانشوروں کے ساتھ مسلسل ربط و ضبط تھا۔ خود مرحوم کہا کرتے تھے کہ جتنے سفر انہوں نے ایران کے کیے ہیں موجودہ دور میں کسی اور نے نہیں کیے۔ حکومت ایران انہیں فارسی سے متعلق تمام علمی کانفرنسوں میں مدعو کرتی تھی اور وطن عزیز میں بھی وہ فارسی کے حوالے سے علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کا محور تھے۔ اس ضمن میں ان کی خدمات تا دیر یاد رکھی جائیں گی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے محولہ بالا مضمون کی تیاری میں بہت محنت کی ہے اور خود بھی تمہید میں اس کا اظہار فرمایا ہے تاکہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ اس مہم کو سرانجام دینے میں انہیں

☆ ادارۂ معارف نوشاہیہ، ۶۹ ماڈل ٹاؤن ہمک، اسلام آباد

Marfat.com

کون کون سے مرحلے پیش آئے (ص۱۰۴)۔ مضمون کی ایک عبارت سے واضح ہے کہ یہ مضمون انہوں نے دراصل خان آرزو کے *تذکرہ مجمع النفائس* کے مقدمہ کے طور پر لکھا تھا (ص۱۲۲)۔ *پیغام آشنا* نے اپنی طرف سے مضمون کے ساتھ ایسا کوئی وضاحتی نوٹ شائع نہیں کیا جس سے معلوم ہوسکے کہ اس مضمون کا مأخذ یا ذریعہ حصول کیا ہے۔ یہ سوال اس لیے پیش آیا ہے کہ *مجمع النفائس* تاحال ڈاکٹر محمد باقر کے اہتمام سے شائع نہیں ہوا جس کا یہ مقدمہ ہے۔ یہاں اس مضمون کے حوالے سے چند مزید معلومات پیش کی جاتی ہیں تاکہ ساری صورت حال کو بہتر پس منظر میں دیکھا جاسکے۔

ڈاکٹر محمد باقر مرحوم نے *مجمع النفائس* دانشگاہ پنجاب، لاہور کے ایک قلمی نسخے کی مدد سے اشاعت کے لیے تیار کیا تھا۔ بعد میں قومی عجائب گھر پاکستان، کراچی کے ایک قلمی نسخے کا عکس بھی مقابلے کے لیے حاصل کرلیا، لیکن اس سے تقابل کی غالبا نوبت نہ آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اشاعت کے لیے اپنا تیار کردہ متن (نسخۂ لاہور کی بنیاد پر) اور نسخۂ کراچی کا عکس اپنی وفات سے پہلے مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد کی تحویل میں دے دیا تھا تاکہ اس کی اشاعت کا انتظام ہوسکے، لیکن بوجوہ ایسا نہ ہوسکا۔ تا آنکہ ۲۰۰۴ء میں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد نے *مجمع النفائس* کی اشاعت کا ڈول ڈالا اور اس کی پہلی جلد جولائی ۲۰۰۴ میں شائع کردی، لیکن یہ ڈاکٹر محمد باقر مرحوم کی مرتبہ نہیں بلکہ ڈاکٹر زیب النساء علی خان کی تدوین کردہ تھی جو دراصل تہران یونیورسٹی میں ان کا ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ تھا ہے۔ یہ جلد حرف الف سے حرف زاء تک کے تخلصوں پر مبنی ہے۔ اس کی بقیہ جلدیں، جو ڈاکٹر محمد باقر مرحوم کے مرتب کردہ متن پر مبنی ہیں، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد نے فارسی کے دو فاضل اساتذہ ڈاکٹر مہر نور محمد خان اور ڈاکٹر محمد سرفراز ظفر کے سپرد کی ہیں تاکہ وہ اس کا نسخۂ کراچی اور کچھ اور قلمی نسخوں کے ساتھ تقابل کرکے ایک محقق ایڈیشن تیار کرسکیں۔ یہ جلدیں عنقریب شائع ہونا شروع ہو جائیں گی اور ڈاکٹر محمد باقر کی سعی بارآور ہوگی۔ *پیغام آشنا* میں جو مضمون شائع ہوا ہے وہ غالبا ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے اسی کام کے لیے تیار کیا تھا، لیکن یہ بے حد مجمل ہے۔ مثال کے طور پر اس میں تذکرے کی خصوصیات اور اہمیت پر محض انیس بیس سطور ہیں جو کسی طرح بھی اس تذکرے کے شایان شان نہیں۔ ممکن ہے یہ مضمون ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تسوید ہو اور اگر تذکرہ ان کے حین حیات چھپنا شروع ہوجاتا تو وہ اس کی تکمیل فرما لیتے۔ ان سطور کے ذریعے ہماری مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد اور اس تذکرے کے جدید مرتبین سے درخواست ہے کہ جب *مجمع النفائس* کی دوسری

Marfat.com

جلد ڈاکٹر محمد باقر کے نام کے ساتھ شائع ہو تو ان کے مقدمے کو شامل کیا جائے، تاکہ ڈاکٹر صاحب کا مدعا پورا ہو سکے اور ان کی ایک فاضلانہ تحریر جس کتاب سے متعلق ہے اس کے ساتھ پیوست رہے۔

یہاں جسارت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے مطبوعہ مضمون کے حوالے ہی سے چند ایک گزارشات کروں گا تاکہ طبع شدہ مضمون میں درج معلومات کی تکمیل ہو سکے۔ ہمارا مقصد خان آرزو کے دیگر حالات سے تعرض کرنا نہیں ہے۔

☆ ڈاکٹر صاحب نے خان آرزو کے والد حسام الدین حسامی کے بارے میں لکھا ہے کہ شعر گوئی کو انہوں نے اپنا مستقل پیشہ نہیں بنایا تھا (ص ۱۰۷)؛ یہ بات کسی حد تک صحیح ہے، اس کے باوجود وہ علاوہ متفرق غزلیات کے، ایک نامکمل فارسی مثنوی کے مصنف بھی ہیں جس کا ذکر خود *مجمع النفائس* میں موجود ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب کی توجہ اس طرف نہیں گئی۔ خان آرزو نے اپنے والد کے حالات میں لکھا ہے: ''قصۂ کام روپ و کام لتا کہ از افسانہ ہای مشہور ہند است، موزون فرمودہ، اما فرصت اتمام نیافتہ، ہر قدر گفتہ، خیلی متین و پرزور است۔'' مجھے اس قصے کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے کتب خانے میں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا جو اچھا خاصا ضخیم ہے (دیکھیے *فہرست نسخہ ہای خطی فارسی انجمن ترقی اردو*، کراچی تالیف عارف نوشاہی، اسلام آباد، ص ۱۵۱)۔

ڈاکٹر صاحب نے خان آرزو کی ۲۵ تصانیف کی ایک فہرست دی ہے جو زیادہ تر *مجمع النفائس* میں مصنف کے خودنوشت حالات سے ماخوذ ہے۔ خان آرزو نے وہاں اپنی ۱۴ تصانیف کا یکجا ذکر کیا ہے۔ پھر جا بجا دیگر شعرا کے حالات میں موقع اور مناسبت سے اپنی تصانیف کا ذکر دہرایا ہے یا کچھ اور تصانیف کا ذکر کیا ہے، مثلاً عیسیٰ شاملو کے حالات میں آرزو نے اپنی مثنوی *محمود و ایاز* مسمی بہ *سوز عشق* کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا نام *حسن و عشق* لکھا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، اس لیے بھی کہ آرزو کے والد کی مثنوی *کام روپ و کام لتا* کا نام *حسن و عشق* ہے اور آرزو جیسا جدت پسند اس نام کی تکرار نہیں کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جن ۲۵ ناموں کی فہرست دی ہے وہ اصلاح طلب بھی ہے اور تکمیل طلب بھی۔ مثال کے طور پر:

- شمارہ ۱ کے تحت آرزو کے دو دواوین کا ذکر ہوا ہے ایک بہ طرز فغانی اور دوسرا بہ طرز کمال خجندی (ص ۱۱۹)۔ آرزو نے اپنے ایک دیوان بہ طرز شفیعائے اثر کا بھی ذکر کیا ہے: ''فقیر مدتی است کہ تتبع دیوان غزل بلاغت بیانش در پیش دارد۔ بہ سبب قلت فرصت گاہ گاہی می گوید و

Marfat.com

الّا دیوان شفیعای اثر در چند ماہ جواب گفتہ بود'' (بذیل ترجمۂ محمد قلی سلیم تہرانی)۔

- شمارہ ۶ کے تحت شرح سکندرنامہ کا ذکر ہے۔ اس شرح کا نام شگوفۂ زار ہے۔

- شمارہ ۱۰ کے تحت مثمر کی پاورقی میں مدیر اعزازی نے جو وضاحت کی ہے اس پر مزید اضافہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ مثمر کا بنیادی موضوع سنسکرت اور فارسی کے باہمی لسانی روابط ہیں۔اسی پاورقی میں مدیر نے ڈاکٹر ریحانہ خاتون کے مقدمہ کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے مثمر پر لکھا ہے اور اس میں خان آرزو کے حالات زندگی پر حتی الوسع تفصیل سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔یہاں ڈاکٹر ریحانہ خاتون کی کتاب احوال و آثار سراج الدین علی خان آرزو کے ذکر کا محل بھی ہے جو شعبۂ فارسی ،دہلی یونی ورسٹی نے ۱۹۸۷ء میں شائع کی ہے۔یہ خان آرزو پر لکھی جانے والی پہلی جامع اردو کتاب ہے۔

- شمارہ ۱۱ کے تحت نوادر الالفاظ کا تعارف فاضل مضمون نگار نے یوں لکھا ہے''ان ہندی لغات کی کتاب جن کی عربی اور فارسی غیر مشہور ہے'' یہ دراصل مجمع النفائس کے اس جملے کا ناقص ترجمہ ہے''در بیان لغات ہندیہ کہ فارسی و عربی آن غیر مشہور بود در ہند''۔یہ وضاحت کافی نہیں ہے۔نوادر الالفاظ بنیادی طور پر عبد الواسع ہانسوی کی کتاب غرائب اللغات کی تصحیح اورمحاکمہ ہے ۔غرائب اللغات اردو سے فارسی کی قدیم ترین لغت ہے،ہانسوی نے اس میں اردو الفاظ کے جو مفاہیم دیے تھے خان آرزو نے ان سے اختلاف کیا ہے۔یہ کتاب بہ اہتمام ڈاکٹر سید عبداللہ شائع ہوچکی ہے۔راقم السطور نے قومی عجائب گھر پاکستان کراچی میں غرائب اللغات کا ایک ایسا قلمی نسخہ بھی دیکھا ہے جس پر خان آرزو کے حواشی نقل ہوئے ہیں ۔یہی حواشی بعد میں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ نوادر الالفاظ کا لوازمہ بنے۔

- شمارہ ۱۲ کے تحت ایک کتاب کا یوں اندراج ہوا ہے :''شرح قصیدہ ابوالبرکات نیر[کذا] کہ بر اعتراضات شیدا بر قصیدۂ قدسی نمودہ[کذا]''۔ ان سطور میں طباعت کی غلطیوں سے قطع نظر،امر واقع یہ ہے کہ یہ خان آرزو کی دادِ سخن کا تذکرہ ہورہا ہے جس کا ڈاکٹر صاحب نے الگ سے کوئی ذکر نہیں کیا۔خان آرزو نے اپنے حالات میں اس کا ذکر اس طرح کیا ہے: ''نسخۂ دادِ سخن ،شرح محاکمۂ منیر کہ برای اعتراضات شیدا بر قصیدۂ قدسی نمودہ''۔یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کے حین حیات ،ان کے ایک رفیق کار ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ اکرام نے عمدہ طریقے سے مرتب کرکے مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ،راولپنڈی کی طرف سے شائع کردی تھی۔

- شمارہ ۱۳ کے تحت سراج نیر[کذا: سراج منیر] کے تعارف میں لکھا ہے کہ عرفی اور تین

Marfat.com

دوسرے شاعروں پر نیز[کذا:منیر] کے اعتراضات کا جواب۔وہ تین شاعر طالب ،زلالی خوانساری اور ظہوری ترشیزی ہیں۔یہ کتاب بھی بہ اہتمام ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ اکرام چھپ چکی ہے۔

- شمارہ ۱۷ کے تحت ''ایک مثنوی غیر متعارف بحر میں'' اور شمارہ ۱۹ کے تحت ''ایک مثنوی حدیقۂ سنائی کی بحر میں'' کا اندراج ہوا ہے۔ڈاکٹر ریحانہ خاتون نے اپنی متذکرۃ الصدر کتاب میں ان مثنویوں کے نام علی الترتیب مہرو ماہ اور عبرت فسانہ [کذا] لکھے ہیں۔

ڈاکٹر ریحانہ نے خان آرزو کی کچھ اور کتابوں کا ذکر بھی کیا ہے۔وہاں سے یہ فہرست مکمل کی جاسکتی ہے۔

☆ڈاکٹر محمد باقر مرحوم کے مجمع النفائس کے بارے میں ملاحظات چونکا دینے والے ہیں۔وہ شرح صدر کے ساتھ اسے باقاعدہ تذکرہ نہیں مانتے ، بلکہ اسے بیاض سے فراتر اور تذکرے سے فروتر کی درمیانی شکل قرار دیتے ہیں ، اس لیے کہ مصنف نے اس میں نہ ترتیب زمانی ملحوظ رکھی نہ سنین کا اہتمام کیا (ص۱۲۳)۔احقر کے خیال میں یہ ملاحظات قرین صواب نہیں ہیں۔اگر ہم تذکرہ نویسی کی عمومی روایت پر نظر ڈالیں تو اکثر و بیشتر تذکرے اسی اسلوب میں لکھے گئے ہیں جو مجمع النفائس میں موجود ہے۔ترتیب زمانی کو ملحوظ رکھ کر بہت کم تذکرے لکھے گئے ہیں۔تذکرہ نویس تخلص کو بنیاد بناتے تھے اور حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ تذکرہ لکھتے تھے ۔یہی روش خان آرزو کی ہے۔عام قاری تخلص سے آشنا ہوتا ہے اور اسی کے تحت تذکروں سے حالات کی جستجو کرتا ہے ۔ایسا نہیں ہے کہ آرزو نے حالات جمع کرنے کا بالکل اہتمام نہ کیا ہو۔تذکرہ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خان آرزو نے دیگر لغوی اور ادبی ظرائف و نکات لکھ کر اس کوتاہی کی تلافی کی ہے۔ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ خان آرزو کا مزاج مورخانہ نہیں بلکہ شاعرانہ اور نقادانہ ہے۔ وہ مجلس آرا اور ادبی منظر پر ہنگامہ برپا رکھنے والے آدمی تھے۔شعری ذوق اور مطالعہ زبردست تھا،الفاظ اور اصطلاحات کے جملہ معانی اور اصل سے خوب واقف تھے اور اپنی اسی قوت کا اظہار وہ جا بجا مجمع النفائس میں کرتے ہیں۔

-ڈاکٹر صاحب نے مجمع النفائس میں تراجم شعرا کی تعداد چودہ اور پندرہ سو کے درمیان بتائی ہے(ص۱۲۳)۔ڈاکٹر ریحانہ خاتون نے یہ تعداد ۱۷۳۶ گنوائی ہے۔اب مجمع النفائس چھپ کر سامنے آئے گا تو اس میں شامل تراجم شعرا کی تعداد کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

☆☆☆

Marfat.com

کلہوڑا دور کا گم شدہ فارسی ادبی خزینہ

ڈاکٹر غلام محمد لاکھو☆

سندھ کی تاریخ میں کلہوڑا دور حکومت کو علمی اور ادبی لحاظ سے، سنہری دور کہا جاتا ہے۔ سندھی زبان کے عظیم شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اسی دور میں جنم لیا۔ پہلی مرتبہ سندھی زبان میں بڑے پیمانے پر کتابیں لکھی گئیں، جو اکثر نظم میں ہیں۔ کلہوڑا دور فارسی علم و ادب کی ترقی کے حوالے سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں تاریخ، تذکرہ، انشاپردازی اور سوانح نویسی کے باب میں، عمدہ تصانیف وجود میں آئیں۔ فارسی زبان میں لکھی گئی جو کتب شائع ہوچکی ہیں، وہ علمی دنیا میں شہرت پاچکی ہیں۔

اس مضمون میں کلہوڑا دور میں لکھی گئی کچھ ایسی تصانیف کا سرسری ذکر کیا جائے گا، جن کو یا تو بالکل بھلا دیا گیا ہے یا پھر غیر اہم سمجھ کر نظرانداز کردیا گیا ہے۔ اس طرح کی اکثر تصانیف اب گم ہوچکی ہیں، اور ہمیں صرف کتابوں اور تذکروں میں ان کے حوالہ جات ملتے ہیں۔ تاہم کچھ کتابیں اب بھی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں جن کا برا حال ہوچکا ہے۔ نیچے جدا جدا اصناف پر لکھی گئی کچھ کتب کا ذکر کیا جائے گا۔

ادب اور اخلاقیات

کلہوڑا دور میں سندھ میں فارسی ادب کے شہ پاروں کا مطالعہ بھی ہوا تو کچھ نئی کتب بھی لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ نصیحت اور اخلاقیات جیسے عنوانات پر بھی قلم اٹھایا گیا۔ فارسی ادب میں سید ضیاء الدین نخشبی بدایونی (م ۷۵۰ھ) کی تصنیف طوطی نامہ کی بہت تعریف ہوئی ہے۔ میر نجم الدین عزلت (م ۱۱۶۰ھ) نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی اور ضیاء الدین کی تحریر سے بھی عمدہ کتاب طوطی نامہ ہی کے عنوان سے تحریر کی۔ عزلت کا تعلق ٹھٹہ سے تھا۔(۱) ملا ابوالبقا ٹھٹوی (م ۱۱۷۴ھ) نے شیخ سعدیؒ کی مشہور کتاب گلستان سعدی کو شاہ نامہ کے بحر وزن میں منظوم کرکے ادبی دنیا کے سامنے پیش کیا۔(۲) میر محمد شفیع ھمت

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف جنرل ہسٹری، سندھ یونیورسٹی، جامشورو (سندھ)

Marfat.com

رضوی اپنے وقت کے معروف انسان تھے۔ وہ ٹھٹھ کے حاکم (۲۷۔۱۱۲۵ھ) بھی رہے۔ میر صاحب نے ۱۱۴۴ھ میں وفات پائی۔انہوں نے اپنی اولاد کی نصیحت اور تفریح کے لیے طلسم سعادت کے نام سے کتاب لکھی۔کتاب کا نامکمل نسخہ سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے۔(۳) اخلاقیات کے عنوان سے میر علی شیر قانع کی دو کتابیں زینت الاخلاق اور سرفرازنامہ بھی اسی دور میں لکھی گئیں۔(۴)

علم جغرافیہ اور قاموس

فارسی زبان کے علما اور ادبا نے کلہوڑا دور میں علم جغرافیہ اور قاموس (انسائیکلوپیڈیا) جیسے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی، مثلاً میر امین الدین خان امیر خانی (م. ۱۱۲۷ھ) ٹھٹھ کے باشندے تھے۔ کچھ وقت مغل حکمرانوں کی طرف سے ٹھٹھ کے گورنر بھی رہے۔ میر صاحب نے ایک کتاب معلومات الآفاق کے عنوان سے لکھی۔ کچھ لوگ اس کتاب کو علم جغرافیہ اور کچھ اس کو قاموس میں شمار کرتے ہیں۔ یہ کتاب مطبع نولکشور لکھنؤ کی طرف سے ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۳ء میں دوبار شائع ہوچکی ہے۔(۵) نولکشور نے یہ کتاب ۱۹۸ صفحات پر باتصویر شائع کی تھی۔ علم جغرافیہ پر شیخ محمد اعظم نے ایک کتاب ہیئت العالم کے نام سے لکھی۔ آٹھ ابواب پر مشتمل یہ کتاب دنیا کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس کا ایک نسخہ سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے۔(۶) مذکورہ بالا میر امین الدین خان نے ۱۱۲۳ ہجری میں رشحات الفنون نامی کتاب بھی لکھی، جس میں سولہ علوم کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ البتہ مختلف کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخہ موجود ہیں۔(۷) مشہور مؤرخ اور تذکرہ نویس میر علی شیر قانع کی کتاب نصاب البلغاء از حد دلچسپ تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب قاموس کے موضوع سے متعلق شمار کی جاتی ہے، کسی زمانے میں اس کا ایک نسخہ گڑھی یاسین میں مولانا محمد ابراہیم کے ذخیرہ کتب میں موجود تھا۔(۸)

گرامر اور زبان

کلہوڑا حکمرانوں کے دور میں فارسی زبان و گرامر پر بھی طبع آزمائی ہوئی اور خاص طور پر ایسی کتب احاطۂ تحریر میں آئیں، جو فارسی زبان کے درس و تدریس سے متعلق تھیں۔ دربیلو سندھ کا ایک تاریخی شہر ہے۔اس شہر کے میاں نظام الدین نے ۱۱۲۲ ہجری میں انیس انجمن نامی ایک کتاب لکھی۔ انہوں نے بیس سال بعد کتاب کا اختصار شمع انجمن کے نام سے کیا۔یہ تصنیف فارسی صرف سے متعلق ہے، جو سندھی الفاظ کو سمجھنے کے لیے کارآمد

Marfat.com

ہے۔(۹) میر قانع کی کتاب *میزان فارسی* بھی صرف و نحو سے متعلق ہے(۱۰) لیکن اس ضمن میں سب سے اہم نام مخدوم ابوالحسن ڈاھری (م ۱۱۸۶ھ) کا ہے، جن کا تعلق وسطی سندھ سے تھا اور وہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور صوفی تھے۔ گرامر کے حوالے سے ابوالحسن نے تین مختصر کتابیں لکھیں۔ *تبیان ابنیۂ فارسی* ۔ یہ کتاب گم ہوچکی ہے۔ *نبراسِ میزانِ فارسی* تاریخی مدرسہ چوٹیاریوں میں اس کا نسخہ موجود تھا۔ آپ نے تیسرا مختصر رسالہ *نبراس تصاریفِ فارسیہ* کے نام سے لکھا۔ یہ آخری کتاب ڈاکٹر غلام محمد ڈاھری کے تعارف اور ترتیب سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوچکی ہے۔(۱۱) کلہوڑا دور کے اواخر میں مخدوم محمد ہاشم کے پوتے مخدوم ابراہیم نے *مفتاح الکلام* نامی ایک کتاب لکھی، اس کا تعلق بھی فارسی زبان کے قواعد سے ہے۔(۱۲)

طب، موسیقی اور رمل

کلہوڑا حکمرانوں کی طب سے دلچسپی کی وجہ سے کچھ نامور، حکما اور اطبا نے اس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اور معیاری کتب تحریر کیں۔ ان میں سے اکثر نامور اطبا کو حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل رہی۔ حکیم شیخ محمد بکھری (م ۱۱۷۴ھ) لاثانی حکیم تھے۔انہوں نے آنکھ کی بیماریوں سے متعلق ایک کتاب لکھنی شروع کی۔ افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی اور یہ کتاب مکمل نہ ہوسکی۔(۱۳) بکھر کے حکیم عبدالکریم رضوی، حاکم وقت میاں نور محمد سے وابستہ تھے۔انہوں نے فن طب میں ایک کتاب *جامع المنافع* لکھی۔ کسی زمانے میں اس کتاب کا نسخہ پیر جھنڈو کے کتب خانہ میں موجود تھا۔(۱۴) قدیم شہر بکھر کے رہائشی میر اسد اللہ شاہ ساقی نے جو ۱۱۸۱ھ کے بعد فوت ہوئے، طب کی مشہور کتاب *ذخیرۂ خوارزم شاہی* کا ایک اختصار تیار کیا تھا۔(۱۵)

علم طب کے حوالے سے ایک اور اہم نام شہزاد میاں محمد داؤد کا ہے۔ میاں صاحب اہل علم، حکیم اور طبیب تھے۔ علا اور اطبا کے بے حد قدردان تھے۔ بہت سے طبیب و حکیم ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ محمد داؤد نے باز (پرندہ) اور بازداری اور ان کی بیماریوں اور دواؤں کو مقامی نام دیتے ہوئے، ان کے متعلق ایک کتاب *صید المراد فی قوانین الصیاد* کے نام سے لکھی تھی جسے ایک انگریز عملدار ڈی۔سی۔ فلٹ (D.C. Phillot) نے ۱۹۰۸ء میں کلکتہ سے شائع کروایا۔ غلام رسول مہر نے اس کتاب پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔(۱۶) سید حسام الدین راشدی نے میاں داؤد کی لکھی ہوئی ایک اور کتاب *طب داؤدی* سے متعلق معلومات دی ہیں، جس کا قلمی نسخہ پیر صاحب پگارا کے کتب خانہ میں موجود تھا۔(۱۷) ایک ہندو طبیب بھی محمد داؤد سے وابستہ تھے۔

Marfat.com

میاں داؤد کے نام کی نسبت سے وہ اپنے آپ کو داؤدی کہلاتے تھے۔ انہوں نے بھی حکمت کے موضوع پر ایک کتاب لکھی، جو چالیس سال پہلے مشہور سندھی افسر قاضی سچیڈنو کی تحویل میں تھی۔(۱۸) زیرِ جائزہ دور میں حکیم عبدالرؤف بکھری کو میاں یار محمد کلہوڑو کی سرپرستی حاصل تھی۔ موسیقی پر عبدالرؤف نے ایک مکمل کتاب *ابوالنغم* کے نام سے لکھی تھی۔(۱۹)

مولوی محمد جعفر شیرازی کلہوڑا دور میں سندھ میں وارد ہوئے تھے۔ تذکروں میں ان کی شخصیت اور علمیت کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ انہیں حاکمِ وقت میاں نور محمد کی قربت حاصل تھی۔ انہوں نے میاں صاحب کے لیے *جفر جامع* نامی کتاب لکھنا شروع کی تھی کہ قضائے الٰہی سے میاں صاحب اور مرزا محمد جعفر یکے بعد دیگرے ۱۱۶۷ ہجری میں وفات پاگئے۔ اس وجہ سے یہ کتاب مکمل نہ ہوسکی۔(۲۰)

تصوف

اس زمانے میں جہاں صوفیہ کے تذکرے، ملفوظات اور نسب نامے کافی تعداد میں لکھے گئے وہاں فارسی میں خاص طور پر تصوف اور اس کی باریک بینیوں سے متعلق بھی اکثر کتب تالیف ہوئیں۔ یہاں ہم کچھ کتابوں کا تذکرہ کریں گے۔ مشہور مؤرخ اور تذکرہ نویس میر علی شیر قانع کی تین کتابوں *مثنوی ختم السلوک*، *غوثیہ* اور *میزان الافکار* کو مطالعۂ تصوف کے میدان میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ تینوں کتب منظوم ہیں۔ ان کتب کے علاوہ میر صاحب کی ان دو کتابوں کو بھی خاص اہمیت حاصل ہوئی *شجرۂ اہلِ بیت*، یہ کتاب ناپید ہے اور *طومارِ سلاسلِ گزیدہ* جس میں صوفیہ کی طریقت کے سلسلے بیان کیے گئے ہیں۔(۲۱)

مخدوم محمد معین اس زمانے کے نامور عالم اور صوفی تھے۔ سلسلہ اویسیہ پر لکھی ہوئی ان کی کتاب *رسالۂ اویسیہ* بہت مشہور ہے۔ اس کتاب کا متن اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہوچکا ہے۔(۲۲) میاں فقیر اللہ علوی شکارپوری (م ۱۱۹۵ھ) اس زمانے کے نامور اہلِ قلم تھے۔ ان کے *مکتوبات* کی کتاب ایک صدی پہلے شائع ہوئی تھی۔ کچھ خطوط میں انہوں نے تصوف کے بارے میں علمی گفتگو فرمائی ہے۔ تصوف پر ان کی فارسی کتاب *طریق الارشاد* خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے نیشنل میوزیم افغانستان میں موجود نسخہ کا عکسی ایڈیشن مایل ہروی نے تیار کیا تھا جو افغان وزارتِ کلچر اور اطلاعات کی طرف سے بڑی تقطیع میں ۱۹۸۱ء میں کابل سے شائع ہوا۔ ان سب تصانیف اور کتب کے مقابلہ میں مخدوم ابوالحسن ڈاھری (م ۱۱۸۱ھ) کی قلمی کاوش خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے۔ مخدوم ابوالحسن ڈاھری کی

Marfat.com

اولین اور نمایاں کاوش *ینابیع الحیاۃ* کے نام سے منظرعام پر آئی۔ یہ کتاب سلسلۂ نقشبندیہ کے متعلق ہے، جو ۱۱۵۶ھ میں تیار ہوئی۔ یہ نادر تصنیف ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ پروفیسر ابوالفتح محمد صغیرالدین نے *ینابیع* کے ابتدائی حصہ کو ایڈٹ کرکے، ۱۹۷۱ء میں سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ابوالحسن ڈاھری نے ۱۱۷۶ھ میں *کچکول نامہ* کے نام سے ایک مختصر سی منظوم کتاب بھی تیار کی جسے سندھ کے معروف عالم مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے ایڈٹ کیا۔اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی طرف سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب علم عقائد اور کلام سے متعلق ہے۔ شیخ عبدالرحیم گرھوڑی کلہوڑا دور کے نامور عالم، مصنف اور صوفی تھے۔ان کی دو عدد تصانیف فارسی زبان میں ہیں۔*رسالۂ گل نما* (مثنوی)، اور *مکتوبات*۔(۲۳) دونوں کتب کا تعلق تصوف سے ہے۔شیخ عبدالرحیم نے *مکتوبات* میں حضرت مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی (م ۱۰۳۴ھ) کے مکتوبات کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ فقیر عبدالرحیم ۱۱۹۲ھ میں ایک معرکہ میں شہید ہوئے۔

مذھبیات

کلہوڑا دور میں سندھ کے علما نے مذہبی علوم پر بھی قلم اٹھایا اور فارسی زبان میں بہت ساری کتب تالیف کیں۔ اس ضمن میں سیرت، اسلامی تاریخ،نماز اور فقہ جیسے موضوعات خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔ علامہ ابوالحسن ڈاھری نے بھی متعدد کتب لکھیں۔ ان کی ایک مختصر کتاب *رسالۂ نور* فارسی نثر میں ہے جس کا فارسی متن، سندھی ترجمہ کے ساتھ، ۱۹۹۷ء میں مولانا محمد ادریس ڈاھری نے شائع کیا تھا۔ نماز کے موضوع پر *سراج المصلی* کے نام سے ایک منظوم کتاب بھی، ابوالحسن ڈاھری نے لکھی۔ اس کتاب میں حنفی فقہ کے مطابق نماز کے مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۱۶۳ھ میں مکمل ہوئی۔ حافظ غلام محمد ڈاھری نے *سراج المصلی* کو ایڈٹ کرکے جامعہ سندھ سے ۱۹۹۳ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مخدوم ابوالحسن نے فقہ حنفیہ کے مطابق ناپ تول کے موضوع پر *البدعۃ المرعیۃ للوزن الشرعیہ* نامی ایک کتاب لکھی۔کتاب تو گم ہوچکی ہے البتہ علمی دنیا میں اس کے حوالہ جات ملتے ہیں۔(۲۴) مخدوم محمد معین ٹھٹوی نے جدا جدا عنوانات پر اکثر کتب عربی زبان میں لکھیں لیکن کچھ کتب فارسی زبان میں بھی تھیں۔ اس ضمن میں ان کی مشہور کتاب *رسالہ در بیان اثبات رفع الیدین* مانی جاتی ہے۔(۲۵) انہوں نے یہ کتاب عربی زبان میں بھی لکھی۔

مخدوم محمد ہاشم کلہوڑا دور کے بہت بڑے عالم اور مصنف تھے۔ مخدوم صاحب نے

Marfat.com

زیادہ تر عربی زبان میں کتب لکھیں، لیکن عربی کے علاوہ آپ نے بیس کے قریب کتب فارسی زبان میں بھی لکھیں۔ مخدوم صاحب کی فارسی میں لکھی ہوئی کتب کی بھی علمی دنیا میں بہت اچھی ساکھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نامور عالم کی فارسی کتب کی اشاعت کے ساتھ، ان تصانیف کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کا کام بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس ضمن میں خاص طور پر اردو اور سندھی زبانوں کا ذکر اہم ہے۔ مخدوم صاحب نے بہت سے موضوعات پر لکھا ہے۔ انہوں نے نماز، روزہ، سیرت، اسلامی تاریخ اور مختلف مسائل کی فقہ حنفیہ کے مطابق تشریح کی۔ علاوہ ازیں ہمعصر علما کے ساتھ بھی ان کے تحریری معرکے جاری رہتے تھے۔ یہاں پر ہم ان کی کچھ کتب کے نام دیتے ہیں: **ذریعۃ الوصول الی جناب الرسول ، رشف الزلال فی تحقیق ماء الزلال ، حیات الصائمین، حیات القلوب فی زیارت المحبوب، الباقیات الصالحات فی ذکر الازواج الطاہرات، وسیلۃ الغریب الی جناب الحبیب** اور **اصلاح مقدمۃ الصلوٰۃ** اور **حدیقہ الصفاء فی اسماء المصطفی**۔(۲۶)

کلہوڑا ادوار کے آخر میں ٹھٹھہ شہر میں مخدوم عثمان (م ۱۲۱۹ھ) نامی ایک بہت بڑے عالم گذرے ہیں۔ مخدوم محمد ہاشم کے پوتے مخدوم ابراہیم اور مخدوم عثمان کے بیچ کچھ مسائل پر قلمی معرکے بھی ہوئے۔ مخدوم عثمان نے کافی کتب لکھیں۔ موجودہ دور میں ان کی ایک فارسی کتاب **منتخب مشکوٰۃ المصابیح** کا پتہ چلا ہے۔(۲۷)

حوالہ جات اور حواشی

۱۔ میر علی شیر قانع، *مقالات الشعراء*، ترتیب سید حسام الدین راشدی، سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۵۷ء، ص ۴۳۸
۲۔ ایضاً، ص ۷۸
۳۔ میر علی شیر قانع، *مکلی نامہ*، حواشی از سید حسام الدین راشدی، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد، ۱۹۶۷ء، ص ۶۳۴
۴۔ سید حسام الدین راشدی، ''میر علی شیر قانع ٹھٹوی''، رسالۂ مہران، سال ۱۹۵۶ء، شمارہ ۲
۵۔ میر علی شیر قانع، *تحفۃ الکرام*، ترتیب سید حسام الدین راشدی، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد، ۱۹۷۱ء، ص ۳۴۶ (حاشیہ)
☆ ٹھٹھ کے محمد صالح کی کتابت کی ہوئی *معلومات الآفاق* کا ایک باتصویر نسخہ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ یہ نسخہ ۱۱۲۷ھ میں نقل کیا گیا۔
۶۔ شیخ محمد اعظم نے ٹھٹھ کے اولیاء پر ایک کتاب *تحفۃ الطاہرین* لکھی۔ یہ کتاب آغا بدر عالم کی سعی سے سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۵۶ء میں شائع کی۔ محمد اعظم کی کتاب *ہیئت العالم* ۱۲۰۷ ہجری میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب میں مذکور سندھ سے متعلق معلومات *تحفۃ الطاہرین* کے سندھی ادبی بورڈ ایڈیشن کے آخر میں، ضمیمہ کے طور پر شامل کردی گئی ہے۔

Marfat.com

۷۔عارف نوشاہی، ''سکھر کی ایک تاریخی مسجد کے بانی میر امین الدین ہروی ٹھٹوی کی فارسی خدمات''،فکر و نظر جولائی۔ستمبر، اسلام آباد ۲۰۰۱ء

۸۔سید حسام الدین راشدی کا مقالہ،مہران ،۱۹۵۶ء، شمارہ ۲

۹۔یہ معلومات ڈاکٹر محمد ادریس سندھی (کنڈیارو) نے مہیا کیں۔ ان کے کتبخانے میں دونوں کتب موجود ہیں۔

۱۰۔ملاحظہ ہو: مذکورہ بالا فٹ نوٹ ۸

۱۱۔غلام محمد ڈاھری، ابوالحسن ڈاھری، مہران، سال ۱۹۹۷ء، شمارہ ۱۔۲

۱۲۔سید حسام الدین راشدی کا مضمون، مہران، سال ۱۹۸۰ء شمارہ ۳۔۴

۱۳۔راشدی صاحب کا مضمون، مہران، سال ۱۹۸۰ء، شمارہ ۱۔۲

۱۴۔راشدی صاحب کا مضمون، ''سندھ میں یونانی طب''، ڈیلی مھران، سالگرہ نمبر، ۱۲ نومبر ۱۹۵۷ء

۱۵۔مولانا دین محمد وفائی، تذکرۂ مشاہیر سندھ، سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد، ۱۹۸۵ء، جلد اول، ص ۱۱۸

☆ذخیرۂ خوارزم شاہی، بارہ جلدوں میں سید اسماعیل جرجانی نے سن ۵۰۴ھ میں تیار کی اور اس کو قطب الدین محمد خوارزم شاہ کے نام سے منسوب کیا۔

۱۶۔غلام رسول مہر، تاریخ سندھ عہد کلھوڑا، (اردو)، محکمۂ ثقافت و سیاحت، حکومتِ سندھ، کراچی، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۹۶ء، جلد دوم، ص ۱۰۲۰۔۱۰۱۱

۱۷۔ملاحظہ ہو فٹ نوٹ ۱۴، بالا

۱۸۔ایضاً

۱۹۔میر علی شیر قانع، تحفۃ الکرام، اردو مترجم اختر رضوی، سندھی ادبی بورڈ، کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۴۰۱

۲۰۔مقالات الشعراء، ص ۱۵۱۔۱۵۰

۲۱۔طومار سلاسل گزیدہ، کی فوٹو کاپی راقم کے پاس موجود ہے۔

۲۲۔رسالہ اویسیہ کا اردو ترجمہ فارسی متن اور حواشی کے ساتھ، ڈاکٹر محمد عبدالمقیت شاکر علیمی نے، زیب ادبی مرکز حیدر آباد کی وساطت سے ۲۰۰۲ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کا سندھی ترجمہ نیاز ھمایونی نے کیا، جو بھٹ شاہ ثقافتی مرکز کی طرف سے ۲۰۰۵ء شائع ہوا۔ آخر میں اس کتاب کا محمد عارف کا نقل کیا ہوا فارسی متن بھی عکسی صورت میں شامل کیا گیا ہے۔ محمد عارف نے ۱۲۳۰ھ میں یہ کتاب نقل کی۔

۲۳۔ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ، شیخ عبدالرحیم گرھوڑی کا کلام، سندھی ساہت گھر، حیدر آباد، ۲۰۰۴ء، مقدمہ ص ۵۲۔۵۱

۲۴۔غلام محمد ڈاھری کا مقالہ، مہران، ۱۹۷۹ء، شمارہ ۳۔۴

۲۵۔راشدی صاحب کا مضمون، مہران، ۱۹۸۰ء، شمارہ ۱۔۲

۲۶۔ڈاکٹر محمد ادریس سندھی کا مقالہ، مطبوعہ مہران، سال ۲۰۰۳ء، شمارہ ۲۔۳

اس مقالہ میں مخدوم محمد ہاشم کی شائع شدہ کتب، ان کے مختلف ایڈیشنز اور ان میں سے جدا جدا زبانوں میں ترجمہ شدہ کتب کی تفصیل دی گئی ہے۔

۲۷۔تذکرہ مشاہیر سندھ، جلد اول، ص ۲۰۱

☆☆☆

Marfat.com

پنج آہنگ کا اردو ترجمہ از پرتو روہیلہ

ڈاکٹر صابر آفاقی☆

۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کا چراغ بجھ گیا۔ یہ ایک قیامت خیز حادثہ تھا جس کی وحشتیں اور دہشتیں اسلامیان ہند کی رگوں میں ۱۹۴۷ء تک رواں رہیں۔ اس کے تیرہ سال بعد ۱۸۶۹ء میں مرزا اسد اللہ خاں غالب ایسے روشن خیال شاعر کی وفات سے فارسی زبان و تہذیب کی قدیم روایت دم توڑ گئی۔ یہ تاریخ کا دوسرا واقعہ تھا جس کے اثرات مدت تک محسوس کیے گئے۔ غالب کے بعد فارسی زبان و ادب کی محفل کو آباد رکھنے والا سیالکوٹ کا کشمیری نژاد اقبال منظر پر آیا مگر افسوس کہ ۱۹۳۸ء میں یہ شمع بھی خاموش ہوگئی اور ایسی خاموش ہوئی کہ پھر ساری محفلیں اجڑ گئیں۔ اقبال غالب کے چراغ کشتہ کا دھواں ثابت ہوا۔ جنوبی ایشیا میں غالب کو فارسی کا آخری بڑا شاعر و نثر نگار اور اقبال کو اس زبان شیریں کا آخری بڑا شاعر کہنا چاہیے۔ اقبال کے بعد جنوبی ایشیا کے لالہ زاروں میں نہ کسی غالب نے جنم لیا اور نہ کوئی اقبال اٹھا۔ اب نرگس کو ہزاروں سال تک اپنی بے نوری پر رونا ہوگا۔

یہ واقعہ نہایت تاسف آور ہے کہ برصغیر کی مسلم قوم نے انگریزی کی چمک دمک سے مرعوب ہوکر پہلے اردو کو خیرباد کہا اور پھر عربستان کے درہم و دینار کی چکاچوند سے مبہوت ہوکر فارسی کو بھی الوداع کہہ دیا۔ جب فارسی ادبیات کو مدرسہ و خانقاہ سے دیس نکالا مل گیا تو ہماری محفلوں میں نہ وہ رونقیں رہیں اور نہ ہی زبان و بیان کی وہ لطافتیں۔ یہ دیکھ کر ہر محب تہذیب کا دل سی پارہ نہیں ہزار پارہ ہوجاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اہل علم ملت کے سچے محسن ہیں جو فارسی شعر و ادب کو اردو میں منتقل کر کے نسل جدید کا تعلق اپنی قدیم ثقافتی و علمی روایات سے جوڑ رہے ہیں۔ وہ گویا ٹوٹے ہوئے پل کو دوبارہ جوڑ کر تہذیبی ارتقا میں تسلسل پیدا کررہے ہیں۔

اب صورتحال یہ ہے کہ ہماری موجودہ نسل کا خط ہی غلط نہیں ہوا املا اور تلفظ بھی

☆ معرفت جناب مختار علی خان پرتو روہیلہ، مکان نمبر ۸، اسٹریٹ نمبر ۴۲، ایف۔۸/۱، اسلام آباد

Marfat.com

غلط ہوگیا ہے۔ مرزا اسد اللہ غالب ہماری لبرل تہذیب کا نمائندہ، ہمارے گوناگوں دکھوں کا ترجمان، اور ہمارے زوال کا نوحہ خواں تھا۔وہ ایک اعتدال پسند اور روشن خیال شاعر تھا جس کے حلقہ احباب میں مسلم، ہندو، مسیحی، دیسی بدیسی، نواب اور درویش سبھی شامل تھے۔

غالب بیسویں صدی کے اندر اپنے آئینہ خیال میں اکیسویں صدی کی ایک جھلک دیکھ کر گویا ہوا تھا:

میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

راقم نے اپنے ایک مقالے میں غالب کو تیسرے ہزارہ کا شاعر اسی لیے لکھا ہے کہ اس نے تعصبات و تشدد سے پاک جس معاشرے کا خواب بیسویں صدی میں دیکھا تھا وہ خواب آج اکیسویں صدی میں شرمندہ تعبیر ہونے والا ہے۔اردو غالب کی مادری اور فارسی اکتسابی زبان تھی۔اس شاعر رنگیں نوا نے اردو اور فارسی میں اپنے خیالات اور نظریات کا اظہار کرکے اپنے فکر و خیال کو دوآتشہ کردیا۔مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ خود غالب اپنے اردو کلام کو ''مجموعہ بے رنگ'' اور فارسی کلام کو''نقش ہائے رنگ رنگ'' قرار دیا۔

فارسی بین تا ببینی نقش ہاے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بی رنگ من است

لیکن زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ غالب کی شخصیت کو اس ''بے رنگ'' مجموعہ نے ہی رنگین بنا کر پیش کیا اور زمانے کی ناقدری نے اس نقش ہاے رنگ رنگ کا رنگ ایسا پھیکا کردیا کہ اس پر بہت کم اصحاب ذوق کی نظر پڑی۔غنیمت ہے کہ غالب کی فارسی غزل پر پھر بھی تھوڑا بہت کام ہوا۔مگر سوال یہ ہے کہ غالب کا فارسی قصیدہ کتنوں نے پڑھا اور کتنوں نے سمجھا؟غالب کی قد آدم تصویر تو قصیدے کے آئینے میں ہی نظر آتی ہے۔آپ یہ سن کر مسرور ہونگے کہ راقم نے قصائد غالب کا اردو میں نثری ترجمہ کرکے تلافی مافات کی ایک صورت نکالی ہے اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ غالب اپنے فارسی مکتوب اور فارسی قصیدے میں ہی کھلتا اور چمکتا ہے۔ غالب نے کہا تھا!

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری کے ساتھ ساتھ غالب کی فارسی نثر کو بھی اس کی وفات کے بعد ہی شہرت نصیب ہوئی۔غالب ذولسانین شاعر اور نثر نگار تھا۔ غالب نے شاعری جہاں اردو اور فارسی میں کی وہاں خطوط اس نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی تحریر کیے۔ یوں غالب کی شخصیت چار آئینوں میں منقسم ہوگئی اور وہ مولانا رومی کی حکایت میں بیان کیے گئے اندھوں

Marfat.com

کے درمیان ہاتھی بن کر رہ گیا۔ کوئی بھی درون غالب کے اسرار سے واقف نہ ہوسکا۔ غالب کے دل کشا اور خود نما خطوط فارسی میں ایک مجموعہ پنج آہنگ بھی ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا غالب کے فارسی مکاتیب پر ناقدین ادب نے بہت توجہ دی ہے جسکی ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ آج وہ علمی اور ثقافتی ماحول نہیں رہا جس میں غالب سانس لے رہا تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ غالب کی فارسی اس قدر مغلق، پیچیدہ اور ادق ہے کہ فارسی کا عام قاری تو کجا علمائے فارسی بھی ان میں دلچسپی کا کوئی سامان تلاش نہ کر سکے۔ اردو میں پنج آہنگ کے دو ترجمے ہوئے ہیں ایک ترجمہ محمد مہاجر کا کیا ہوا ہے اور دوسرا ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا۔ اب تیسرا ترجمہ مختار علی خان پرتو روہیلہ نے کیا ہے۔ آپ کے لیے یہ ایک حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ پرتو روہیلہ کو یہ دونوں تراجم بے عیب نہیں لگے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے محمد عمر مہاجر کے نارسا فارسی ترجمہ کی متعدد مثالیں پیش کر کے اپنے ترجمہ کا جواز ڈھونڈ نکالا ہے۔ بلاشبہ پرتو روہیلہ دلیر و جرات مند نقاد ہے۔ وہ مقلد نہیں بلکہ ایک بے ریا محقق ہے۔ بقول خود وہ نہ کسی کے نام کے لاحقوں سے مرعوب ہوئے اور نہ کسی بڑی انجمن کے نام سے خوف زدہ۔

پرتو روہیلہ نے آہنگ پنجم کو اردو کا لباس فاخرہ پہنایا ہے۔ لباس کیا پہنایا اصل عروس معنی کو سجایا ہے۔ یہ کام کس قدر مشکل اور محنت طلب تھا اس کا اندازہ آپ کو راقم کے نام پرتو روہیلہ کے خط محررہ ۱۴ جون ۲۰۰۴ء کے اس اقتباس سے ہوجائے گا جس میں وہ لکھتے ہیں: ''غالب کے فارسی خطوط کی کوئی ایسی کتاب نہیں جسے میں نے اردو میں ترجمہ نہ کر دیا ہو اور واضح رہے کہ یہ ترجمہ انگلیوں کو خون جگر میں ڈبو کر کیا گیا ہے۔'' خون جگر کے بغیر سارے نقش، نقش ناتمام ہی رہتے ہیں۔ یہ نقش اسی لیے نقش تمام بن گیا کہ اس میں خون جگر شامل ہوا ہے۔ پرتو روہیلہ اپنی فگار انگلیاں اور خون فشاں خامہ دکھا دکھا کر تماشائے اہل ذوق دیکھتا ہے۔ یہ روہیلہ اقبال کا غلام قادر روہیلہ نہیں جو نوک نشتر سے چشم خون خوار نکالتا تھا۔ یہ حال کا مختار علی خاں روہیلہ ہے جو نوک قلم سے گوہر ہائے آبدار اچھالتا ہے۔ پرتو روہیلہ اردو کا نامور شاعر ہے۔ اردو میں اب تک اس کے سات شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں جو دھنک کے سات رنگوں کی طرح فضائے ادب کو رنگین بنائے ہوئے ہیں۔ اصناف سخن پر نگاہ ڈالیے تو وہ بیک وقت غزل سرا، نظم گو اور دوہا نگار ہے۔ پرتو روہیلہ شاعر، نقاد، محقق اور مترجم ہے۔ ان خصوصیات اربعہ نے اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس کے دل میں کئی دل دھڑکتے ہیں اور اس کے دماغ میں کئی دماغ مچلتے ہیں۔ وہ ایک روایتی انداز کا مترجم نہیں بلکہ

Marfat.com

ایک منفرد نوعیت کا محقق غالب بھی ہے۔ میرے اس دعوئی پر گواہ صادق پچاسی صفحات پر مشتمل اس کا مقدمہ ہے جو غالب کی فارسی خطوط نگاری پر بذات خود ایک منفرد تحقیقی مقالہ ہے جو پرتوروہیلہ نے ترجمہ آھنگ پنجم کے آغاز میں ''پیش گفتار'' کے عنوان سے شامل کیا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ پرتوروہیلہ فارسی زبان میں پوری پوری مہارت رکھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسد اللہ غالب کو چھیڑنا شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اپنے تئیں لہولہان کرنا ہے۔ پرتوروہیلہ نے اس شیر کے منہ میں ہاتھ کیوں ڈالا اور کس طرح ڈالا؟ اس کی تفصیل مترجم ہی سے سن لیجیے۔ لکھتے ہیں: ''میں نے محسوس کیا کہ مترجم نہ صرف دیانتداری سے ترجمہ نہیں کررہا بلکہ اپنی طرف سے کئی الفاظ اور فقرے ایسے بھی شامل کرتا جارہاہے جو متن میں موجود نہیں۔۔۔ یہ بھی یقین ہوگیا کہ یہ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہرگز نہیں۔ اس ترجمہ کو آزاد ترجمہ بھی کہا جاسکتا ہے اور خلاصہ بھی۔''

آگے چل کر مترجم نے سات مثالیں دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ محمد عمر مہاجر کا ترجمہ ناقص اور غیرمعیاری ہے۔ مترجم نے ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے ترجمہ کے بارے بھی دس مثالیں دے کر یہ ثابت کردیا کہ یہ ترجمہ بھی انتہائی غیرمعیاری ہے۔ حقیقت تو یہ ہے ان مثالوں سے تو ایسا لگتا ہے (اور یہ الفاظ پرتوروہیلہ کے نہیں میرے ہیں) کہ فاضل مترجم نے غالب کے فارسی متن کو کبھی سنجیدگی سے پڑھا ہی نہیں۔ غرض مترجم نے اپنے ترجمہ کا جواز ڈھونڈ نکالا۔ مندرجہ بالا اقتباس میں اچھے ترجمے کی یہ خوبیاں بتائی گئی ہیں کہ ترجمہ دیانتداری سے کیا جائے، متن میں اپنا کوئی لفظ شامل نہ ہو اور یہ کہ ترجمہ خلاصہ یا آزاد ترجمہ نہ ہو بلکہ لفظ بہ لفظ ہو۔

حقیقت یہ ہے ماہرین نے لفظ بہ لفظ ترجمہ کو کبھی معیاری ترجمہ قرار نہیں دیا۔ بہرحال آھنگ پنجم کا فاضل مترجم مکاتیب غالب کے لفظ بہ لفظ ترجمہ کی ضرورت وخصوصیت کے حوالے سے ایک ایسی دلیل ضرور پیش کرتا ہے جسے سن کر ہمیں مترجم کے موقف کو برحق ماننا پڑتا ہے۔ پرتوروہیلہ لکھتا ہے: ''غالب جیسے باکمال شاعر اور انشاپرداز کی نثر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ قاری اس لطیف اور پرپیچ طرز اظہار سے بھی آشنا ہوجسکی ہرترکیب میں کوئی بانکپن اور ہرفقرے میں کوئی اچھوتا خیال نظر آتا ہے۔''

لیجیے ترکیب کے بانکپن اور ندرت خیال کی تفہیم وترسیل کے لیے پرتوروہیلہ نے لفظ بہ لفظ ترجمہ کا جواز تلاش کرلیا۔ اب آیئے یہ دیکھیں کہ معیاری ترجمہ کی شرائط کون کون سی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ایک مشکل فن ہے۔ آل احمد سرور نے ترجمہ کو ''تخلیق'' قرار دیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ترجمہ Translation نہیں Trans-creation کا نام

Marfat.com

ہے۔ ترجمہ کا بین الاقوامی معیار یہ ہے کہ وہ صحیح، واضح اور فطری ہو، نیز ماخذ و ماخوذ زبان کی تاریخ، ثقافت اور سماجی اقدار کے مطابق ہو۔ گویا مترجم ایک لفظ کا ترجمہ دوسرے لفظ میں نہیں کرتا پوری ثقافت تہذیب کو منتقل کردیتا ہے۔ لہٰذا ترجمہ میں اسی کیفیت اور تاثر کا اظہار ہونا ضروری ہے جو کیفیت و تاثر اصل زبان میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں مترجم ایک دربان کی حیثیت رکھتا ہے جو اجنبی شخص کو نئے ایوان علم میں داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ ترجمہ کے لیے وسیع مطالعہ، انتھک محنت اور بے انتہا ذہانت و قابلیت کی ضرورت ہے۔ ضروری ہے کہ مترجم ماخذ و ماخوذ دونوں زبانوں پر کامل دسترس رکھتا ہو۔ وہ فصاحت و بلاغت کے اصول جانتا ہو اور لغت شناس ہو، مترادفات کا عالم ہو، اسے موضوع سے دلچسپی ہو، فنی نزاکتیں جانتا ہو اسے محاورات اور روزمرہ کا پورا پورا علم ہو۔ اس تعریف سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ترجمہ کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ اب جہاں تک آہنگ پنجم کے اردو ترجمہ کا تعلق ہے، میں نے یہ ترجمہ بڑے شوق اور انہماک کے ساتھ پڑھا ہے اور کئی دن لگا کر پڑھا ہے۔ چیدہ چیدہ خطوط کا ترجمہ اصل متن سے ملا کر بھی دیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پرتوروہیلہ کا یہ خوبصورت ترجمہ مذکورہ بالا تعریفات پر پورا اترتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو مترجم کی مادری زبان ہے اور وہ فارسی زبان کا جید عالم ہے۔ موضوع سے اس کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ اس نے غالب کے تمام مکاتیب کو اردو میں منتقل کردیا ہے۔ گویا اس موضوع میں اسے تخصص کا درجہ حاصل ہے۔ مترجم ایک ایسا غالب شناس ہے جو سفر و حضر میں غالب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نظر آتا ہے۔ جناب مشفق خواجہ نے سچ ہی تو کہا ہے:

> پرتوروہیلہ نے فارسی خطوط غالب کے کئی مجموعوں کو پے در پے اردو میں منتقل کر کے غالب اور پرستاران غالب کے درمیان اجنبیت کی فضا کم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں تازہ ترین کڑی پنج آہنگ میں شامل خطوط کا زیرنظر ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ کے ذریعے اردو والوں کو پہلی مرتبہ اس فضا میں سانس لینے کا موقع ملے گا جو غالب نے ان خطوط کو فارسی میں لکھتے وقت تخلیق کی تھی۔''

پرتو روہیلہ اس بساط عشق پر تازہ وارد نہیں ہیں۔ وہ **مآثر غالب**، **متفرقات غالب**، **باغ دودر**، **نامہ ہای فارسی غالب** اور **غالب کے پراگندہ فارسی خطوط**، کا ترجمہ پہلے ہی کر چکے ہیں۔ انہوں نے آہنگ پنجم کا سلیس اور رواں اردو میں ترجمہ کر کے غالب شناسوں کے سامنے نئے جہانوں کے آفاق روشن کردیے ہیں۔ غالب کی زندگی، شخصیت اور افکار کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بڑی مددگار ثابت ہوگی۔ جناب پرتو روہیلہ کا یہ احسان کیا کم ہے کہ انہوں نے ہمیں غالب کے اردو دیوان کی تنگنا سے نکال کر اوقیانوس مکاتیب کے خوشگوار و تابناک سفر پر روانہ کردیا۔

Marfat.com

اب میں اس گفتگو کو ختم کرتے ہوئے جناب سبط حسن کی وہ رائے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جو انہوں نے محمد عمر مہاجر کے ترجمے کے بارے میں دی تھی۔ سبط حسن نے لکھا تھا: ''پنج آہنگ' کے ترجمہ کو اردو معلی کے خطوں میں شامل کردیا جائے تو اصل اور ترجمہ میں تمیز کرنا مشکل ہوجائے گا'' جناب مختار علی خاں پرتو روہیلہ نے سبط حسن کی اس رائے کو مبالغہ آمیز قرار دیتے ہوئے لکھا اور بجا لکھا کہ ''یہ دعویٰ بہت بڑا ہے۔'' لیکن میں اس ضمن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پرتو روہیلہ کے ترجمہ کے حوالے سے یہ دعویٰ ہرگز بڑا نہیں بلکہ نہایت منصفانہ، جائز اور بجا ہے کہ اس نے غالب کے آہنگ پنجم کے فارسی خطوط کو اردو کا لباس پہنا کر اردوئے معلی کی نقل مطابق اصل پیش کردی ہے اور ایسا تاریخ ساز کارنامہ کردکھانا اس پر اللہ کا انعام خاص ہے۔ چنانچہ مشفق خواجہ نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے درست کہا ہے کہ ''پرتو روہیلہ فارسی زبان پر ماہرانہ دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ غالب کے مزاج دان بھی ہیں۔ اسی لیے انہوں نے انشائے غالب کو منشائے غالب کے مطابق اس طرح اردو میں منتقل کیا ہے کہ ترجمے پر تخلیق کا گماں ہوتا ہے۔''

☆☆☆

Marfat.com

حمد کاکوی اور ان کا فارسی و اردو کلام

ڈاکٹر محمود الرحمن☆

ساتویں صدی ہجری میں کاشغر کے فرمانروا قاضی سید شہاب الدین المعروف بہ پیر جگجوت گذرے ہیں۔ آپ حسینی سادات میں سے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادقؒ کے واسطے سے سید الشہداء حضرت امام حسینؑ اور حضرت مولا علیؑ تک پہنچتا ہے۔ آپ کو بیعت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے تھی۔

آپ نے اپنے والد سلطان شاہ محمد تاج کے انتقال کے بعد سلطنت کا بار سنبھالا، مگر جذبۂ عشق الٰہی نے کچھ ایسا رنگ دکھایا کہ حکومت و امارت شاہی کو خیرباد کہہ کر تبلیغ دین کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اپنی اہلیہ اور چار لڑکیوں کو ساتھ لے کر پہلے کاشغر سے ایران آئے اور وہاں کچھ عرصہ گذار کر لاہور تشریف لے آئے۔ بعد ازاں، ہندوستان کے مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے صوبہ بہار آگئے۔ یہاں پٹنہ (عظیم آباد) سے متصل اور دریائے گنگا کے کنارے ایک مقام عالم پور میں قیام فرمایا۔ عرف عام میں یہ جگہ جٹھلی کے نام سے موسوم تھی۔

قاضی شہاب الدین بلند مرتبت بزرگ تھے۔ آپ کی ذات بابرکات سے علم و عرفان کا چرچا عام ہوا۔ تبلیغ دین میں تنہا آپ ہی نہ تھے بلکہ پورا گھرانا خاص طور پر آپ کی تیسری صاحبزادی حضرت بی بی کمالؒ شریک تھیں جن کی شادی حضرت امام تاج محمد فقیہ متوطن بیت المقدس کے پوتے سلیمان لنگر زمین سے ہوئی تھی۔ آپ اپنے وقت کی ولیہ کاملہ تھیں۔ کشف و کرامات کا مسلسل ظہور ہوتا تھا۔

حضرت بی بی کمالؒ کے حقیقی بھانجے مخدوم الملک شیخ شرف الدین منیریؒ تھے جو اپنے فارسی مکتوبات المعروف بہ مکتوباتِ صدی، مکتوبات دو صدی اور مکتوبات بیست و هشت کی بدولت عالم اسلام میں خاصے مشہور و معروف ہیں۔ آپ کا قیام اسی صوبے کے ایک مقام بہار شریف میں تھا۔ چنانچہ ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں حضرت بی بی کمالؒ حضرت

☆ مکان نمبر ۶۲۳، گلی نمبر ۳۳، سیکٹر جی۔۱/۱۰، اسلام آباد

Marfat.com

شرف الدین منیریؒ سے ملاقات کے لیے روانہ ہوئیں۔ آپ میانے میں سوار تھیں۔ آپ کے چھوٹے سے لشکر میں چار مسلمان کہار، آپ کے استاد شاہ محمد فرید، ایک مؤذن اور کئی خادم اور آپ کی خادمہ تھیں۔ ابھی یہ قافلہ بہار شریف پہنچا بھی نہ تھا کہ راستے میں شام ہوگئی۔ آپ نے ایک ویران علاقے میں اپنے مختصر سے کارواں کو ٹھہرنے کا حکم دیا۔ خیمے نصب ہوگئے۔ پھر، مغرب کی نماز کا وقت ہوتے ہی حضرت بی بی کمالؒ نے مؤذن کو اذان دینے کے لیے کہا۔ پوری فضاؤں میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام کی بازگشت سنائی دینے لگی: اللہ اکبر اللہ اکبر! جہاں ان نوواردوں کا پڑاؤ تھا، وہاں سے نصف فرسنگ پر ایک آبادی واقع تھی جس کا نام کاکو تھا۔ وہاں ایک ہندو رانی کی حکومت تھی۔ جس کا نام کیکئی تھا۔ جب اس کے کان میں اللہ جل جلالہٗ کے نام کی آواز آئی تو وہ متعجب ہوکر کہنے لگی کہ ''ہماری راجدھانی میں یہ مُسلے کہاں سے آگئے''؟ اور پھر اپنے سیناپتی سے مخاطب ہوکر بولی کہ ''آپ جائیں اور دیکھیں یہ کون لوگ ہیں جو ہماری اجازت کے بغیر یہاں ٹھہرے ہیں اور اپنے دھرم کی بات کر رہے ہیں؟''

سیناپتی کورنش بجا لایا اور فوراً محل سے باہر نکل کر بستی کے مغربی رخ کی جانب روانہ ہوا جدھر سے اذان کی آواز آرہی تھی۔ یہ ہندو سیناپتی اس وقت کے ہندوستان کی شاہی زبان فارسی سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے خادموں سے رانی کیکئی کی راجدھانی میں بلا اجازت قیام کرنے اور اذان دینے پر سخت لہجے میں باز پرس کی۔ سیناپتی کی کج ادائی کو دیکھ کر وہ فوراً حضرت بی بی کمال صاحبہؒ کے پاس آئے اور ساری روداد بیان کی۔ آپ مغرب کی نماز سے فارغ ہوکر جانماز پر بیٹھی اوراد و وظائف میں مصروف تھیں۔ آپ نے نووارد کی فارسی میں تلخ گفتگو سن لی تھی، چنانچہ ارشاد فرمایا: ''اس شخص سے کہو کہ ہم لوگ مسافر ہیں۔ رات آگئی تھی، اس لیے یہاں ٹھہر گئے۔ صبح ہوتے ہی اس علاقے سے روانہ ہوجائیں گے۔''

سیناپتی واپس محل میں آیا اور رانی کیکئی سے ساری حقیقت بیان کی۔ اس نے ''کچھ'' سوچا اور سیناپتی سے کہا: ''آپ فوراً نوواردوں کے پاس جائیں اور کہیں کہ ہمارے دھرم میں مسافروں کی آؤ بھگت ضروری ہے۔ آپ سب ہمارے مہمان ہیں۔ رات کا کھانا ہماری طرف سے ہوگا۔''

یہ پیغام سیناپتی حضرت بی بی کمالؒ کے خادموں تک پہنچا آیا، جنہوں نے مالکہ کے پاس آکر رانی کیکئی کی دعوت پہنچا دی۔ آپ نے اسلامی اصول کے تحت رانی کی یہ پیشکش قبول فرمالی، اور پھر عبادت الٰہی میں مصروف ہوگئیں۔

جب عشا کی اذان ہوگئی اور حضرت بی بی کمالؒ نماز سے فارغ ہوچکیں تو آپ اوراد

Marfat.com

و وظائف میں مشغول ہوگئیں۔ اسی دوران خادمہ جن کا نام بیگو تھا رانی کی طرف سے بھیجے ہوئے کھانے کے طشت لے کر آپ کے خیمے میں آئیں اور انہیں فرش پر رکھ کر دیا۔ حضرت بی بی کمال صاحبہؒ نے اوراد و وظائف سے فارغ ہوکر طشت پر رکھے ہوئے مخملی خوان پوش کو الٹا اور نہایت جلال کے عالم میں فرمایا: ''کیوں ری بلی، کیوں رے چوہے، کیوں رے کتے، کیا پیالے ہی میں رہو گے؟''

آپ کا یہ کہنا تھا کہ بڑے سے طشت میں رکھے ہوئے پیالے سے میاؤں میاؤں، چُوں چُوں اور بُھوں بُھوں کرتے ہوئے یہ سارے جانور اچھلتے کودتے باہر آگئے اور اسی عالم جلال میں حضرت پیر جگجوت جن کے گھر میں بہ یک وقت چودہ قطب موجود تھے اور ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے، کی صاحبزادی بی بی کمالؒ نے پیالے کو زمین پر دے مارا۔ آن واحد میں رانی کیکئی کی راجدھانی زمین بوس ہوگئی۔ تب آپ نے حکم الٰہی سے یہیں مستقل سکونت اختیار فرمالی۔ پھر، مسلمانوں کا قافلہ یہاں آ آکر بستا گیا اور موضع کاکو پورے صوبۂ بہار کا سب سے بڑا قصبہ بن گیا۔ آپ کے بھانجے اور فارسی کے نامور مصنف مخدوم شرف الدین منیریؒ آپ سے ملنے یہیں آیا کرتے تھے۔ حضرت بی بیؒ کے شوہر حضرت سلیمان لنگر زمین بھی بالآخر یہیں آکر فروکش ہوگئے۔

اس قدیم بستی میں جہاں ایران، افغانستان اور صحرائے عرب سے مسلمانوں کا قافلہ آکر آباد ہوا، وہیں دیار حرمین شریفین سے ہجرت کر کے آنے والا ایک کنبہ ایسا بھی تھا جس کے مورث اعلیٰ سید شاہ تاج الدین رضوی تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت امام علی رضاؑ سے جاملتا ہے۔ ہمارے ممدوح حضرت حمد کاکوی مرحوم اسی رضوی سید خاندان کے رکن تھے۔

آپ کا اسم گرامی سید شاہ محمد غفور الرحمٰن تھا اور حمد تخلص۔ سن پیدائش ۵ شوال روز یکشنبہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۲۹ مارچ ۱۸۶۳ء۔ سیادت کے شرف کے باعث نام کا جزو سید بھی تھا اور شاہ بھی!

حمد کاکوی صوبۂ بہار کے مشہور اور ممتاز خاندان کے ایک فرد تھے۔ آپ کے والد گرامی کا نام حاجی سید محمد مبین تھا۔ جب آپ چار برس کے ہوئے تو رسم بسم اللہ ہوئی۔ قرآن ناظرہ فارسی اور اردو پڑھانے کے لیے مولوی صاحبان مقرر کیے گئے۔ سکندر نامہ اور بہار دانش سبقاً سبقاً پڑھی۔ قرآن پاک کے کئی پارے بھی حفظ کئے تھے۔

آپ کے والد حاجی مبین مرحوم خود بھی ان کی تعلیم میں دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ فارسی کی نصابی کتابوں کو سبقاً سبقاً پڑھانے کے ساتھ ساتھ ''قرأت مکتوب'' کے ذریعے بھی حمد مرحوم

Marfat.com

کو تعلیم دیتے رہے۔ طریقہ یہ تھا کہ حاجی صاحب مرحوم کے تمام اعزہ و احباب اس زمانے کے دستور کے مطابق فارسی میں انہیں خطوط لکھتے۔ ان مکاتیب کو ڈوری میں پُرو کر رکھا جاتا۔ ہوتے ہوتے ایسے کئی مجموعے تیار ہوگئے تھے۔

روزانہ صبح کو حاجی مبین صاحب اپنے نوجوان بیٹے کو لے کر بیٹھتے اور فارسی خطوط پڑھواتے، ان کے معنی اور مطلب بتاتے، پھر آئے ہوئے فارسی مکاتیب کا جواب بھی فارسی ہی میں حمد کاکوی سے لکھواتے، اور جو خطوط اردو زبان میں ہوتے ان کے جوابات بھی اردو میں بیٹے سے لکھواتے۔ اس طرح ان میں فارسی اور اردو کی لیاقت پیدا ہوئی۔ نیز ہر روز اردو اور فارسی خطوط کے جوابات لکھنے کی بدولت حمد مرحوم کی خوشخطی قابل رشک بن گئی۔ اس کے علاوہ، کلام پاک کے پورے متن کی کتابت بھی ان کی یادگار ہے۔

شاہ غفور الرحمٰن کی طبیعت موزوں واقع ہوئی تھی اس لیے ابتدائی تعلیم ہی کے زمانے میں شعر موزوں کرنے لگے۔ ان کی کم عمری کا ایک شعر یہ تھا:

ہوا سے تیز ہے اشہب چلن میں
اڑے گا جا کے پہنچے گا عدن میں

سید ہونے کے باعث روحانیت سے انہیں قلبی لگاؤ تھا۔ قادریہ ابوالعلائیہ سلسلے میں بیعت تھی۔ بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، خصوصاً ولیۂ زماں حضرت بی بی کمالؒ سے اس درجہ نیاز مندی تھی کہ بعد نماز عصر پیدل چل کر آپ کے روضۂ مبارک تک جاتے اور فاتحہ پڑھ کر واپس آتے۔ ضیفی کے سبب جب چلنا مشکل ہوگیا تو صحن میں کھڑے ہوکر اور مغرب کی جانب رخ کر کے جدھر حضرت بی بی کمالؒ کا روضہ ہے فاتحہ پڑھتے۔ اس عقیدت و نیازمندی کے نتیجے میں آپ نے حضرت بی بی کمالؒ کے متعلق فارسی زبان میں بیشمار اشعار بھی کہے جن کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔

حضرت حمد کاکوی کو شاعری میں تلمذ اکبر داناپوری سے تھا۔ بعد میں لِسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی سے بھی مشورۂ سخن کیا۔ خود اکبر کے استاد حضرت وحید الہ آبادی بھی جو صوفی منش تھے اور اشعار سننے والوں کو وجد میں لے آئے تھے، دو مرتبہ کاکو آئے تھے۔ ان کا یہ شعر تو ضرب المثل بن چکا ہے:

ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

حمد کاکوی نے حضرت وحید سے بھی اصلاح لی۔

Marfat.com

ایک مرتبہ وحید الہ آبادی حمد کاکوی کے خالہ زاد بھائی اور اپنے شاگرد خان بہادر شاہ محمد کمال کے یہاں مقیم تھے۔ ان دنوں حمد کاکوی بھی شاہ کمال سے ملنے پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر وحید الہ آبادی نے ان سے تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی۔ موصوف نے اپنی ایک نعتیہ غزل سنائی جس پر ایک اکبر داناپوری اصلاح دے چکے تھے۔ جب انہوں نے یہ شعر پڑھا:

ولادت کا دن اور معراج کی شب
یہ دونوں ہیں لیل و نہارِ مدینہ

حضرت وحید الہ آبادی نے یہ شعر سن کر اعتراض کیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ولادت اور معراج کا تعلق مکّہ سے ہے۔ مدینے سے نہیں! یہ اعتراض سن کر حمد صاحب سخت مخمصے میں پڑ گئے اور سوچنے لگے کہ اگر یہ شعر قابلِ اعتراض تھا تو استاد نے اس پر اصلاح کیوں نہ دی۔ بہرکیف، کچھ ہی دیر بعد حضرت وحید الہ آبادی نے خود فرمایا کہ: ''یہ شعر بہت ہی معنی خیز اور اعلیٰ درجے کا ہے۔'' اور پھر اس کی یوں تشریح کی: ''فضیلت میں ولادت کا دن اور معراج کی شب ہر دن اور ہر رات سے بلند و بالا ہے۔ مگر حضرت رسول مقبولؐ کی جائے قیام مدینہ کا ہر دن اور ہر رات ان دونوں سے فضیلت میں کم نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں بڑی نکتہ آفرینی ہے۔ یہ اکبر میاں (اکبر داناپوری) کی ترکیب ہے۔''

اکبر الہ آبادی نے ایک دفعہ اپنے ایک خط میں حمد کاکوی کو لکھا تھا کہ: ''آپ کی طبیعت اُجلی معلوم ہوتی ہے۔'' اس اجلی طبیعت کے حامل شاہ غفور الرحمٰن حمد کاکوی نے ایک ضخیم کلیات، نثر کی کتاب آثارِ کاکو اور ایک طویل اردو نظم ''چائے نامہ'' یادگار چھوڑی ہیں۔ دیوان میں فارسی اور اردو کی غزلیات، رباعیات، قطعات، قومی نظمیں اور قطعات تاریخ شامل ہیں۔ حضرت حمد کو مادۂ تاریخ نکالنے میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ آپ کے کل اشعار کی تعداد تیس ہزار ہے۔

آپ ۹ر جمادی الاول، ۱۳۵۷ھ مطابق ۸ جولائی ۱۹۳۸ء کو اس دارفانی سے رخصت ہوئے۔ تدفین کے فوراً بعد آپ کا دایاں ہاتھ شہید کردیا گیا۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ تجہیز و تدفین آپ کے آبائی قبرستان ''دینی باغ'' میں بعد نماز عصر ہوئی تھی۔ اس کے بعد لوگ گاؤں واپس آگئے۔ صبح ہی صبح قبرستان کا مسلمان پہرہ دار آیا اور بتایا کہ نصف شب کو چند ہندو جوگی آئے، زبردستی قبر کھولی، تختے ہٹائے اور حمد کاکوی مرحوم کا دایاں ہاتھ آری سے شہید کرکے لے گئے اور آپس میں کہتے جاتے تھے: ''اب اس سید کے ہاتھ پر ہمارا جادو خوب چلے گا۔''

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا، آپ کے خاندان میں فارسی زبان و ادب کا بڑا چرچا

Marfat.com

تھا۔ آپ کی تعلیم بھی اس حوالے سے بے حد اعلیٰ اور محکم تھی۔ آپ نے اپنے صاحبزادوں کو فارسی ادب میں اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی نے تو مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی پر معرکتہ آلارا کتاب حیـــرت زار لکھی تھی جسے ایران کے علمی و ادبی حلقوں میں بھی بے حد پسند کیا گیا۔ عطا صاحب کو حکومت ہند نے فارسی ادب میں امتیاز حاصل کرنے کے سبب بہت بڑا ایوارڈ بھی دیا تھا۔ پٹنہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ فارسی کی حیثیت سے وہ اس زبان کا درس مدتوں دیتے رہے۔

راقم نے اس مضمون کا آغاز جس دلیہ کے ذکر سے کیا ہے، ان کی اپنی زبان فارسی تھی۔ پھر ان کے حقیقی بھانجے حضرت مخدوم شرف الدین منیریؒ فارسی ادب میں امتیازی مقام کے حامل تھے اور حضرت حمد کاکوی کو چونکہ حضرت بی بی کمال سے بے حد عقیدت تھی لہٰذا موصوف نے اس حوالے سے جو کچھ لکھا، وہ فارسی زبان ہی میں تھا۔

آیئے، اب ہم حمد کاکوی مرحوم کے فارسی اور اردو کلام کا مطالعہ کرلیں۔

فارسی کلام

اے کہ تو ہر لحظہ بنمائی مرا شانے دگر
چوں نباشد در دلِ ما شوق و ارمانے دگر
اے دوست اگر آئی در کلبۂ احزانم
قربان بتو سازم جان و دل و ایمانم

سرنگوں شد در چمن سرو از قد رعنائے تو
شد خجل ماہ درخشان از رخ زیبائے تو
ایکہ ''واللّیل'' است وصف زلف عنبر سائے تو
آئینۂ ''مازاغ'' مدحِ نرگس شہلائے تو

توئی سرتاجِ ما و سرپناہے
بکن بر حال زار ما نگاہے

در تحیّر نرگس است از نرگس شہلائے تو
ہر گل اندر باغ خندان از رخ زیبائے تو

Marfat.com

باز آمد در حریم سینہ پیکانے دگر
میزبانی کن دلا از بہر مہمانے دگر

بعد سعدی خواجۂ شیراز حافظ گفت شعر
کس ندیدہ بعد ازاں ہرگز غزل خوانی دگر

کرد سیراب حمد ز آب چشم
نخل امید ماندہ بے ثمرے

فیروز شاہ تغلق اپنے دورِ سلطنت میں دہلی سے بہار جا رہا تھا اور حضرت بی بی کمالؒ کے مدفن کے قریب سے گذرا۔ وہ کسی بیماری میں مبتلا تھا اور اس کے ساتھ جو واقعہ ہوا اس کو حمد کاکوی نے ''قطعہ تاریخ'' کی صورت میں تاریخ کا حصہ بنا دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

شاہ فیروز تغلق عادل　　بود فرمان روائے ہندستان
لیک می داشت شاہ ہرج جذام　　ماندے بر حال خویش گریہ کنان
بود از زیست شاہ آزردہ　　سلطنت را نمی شدے پرسان
گشت تقدیر شاہ چوں رہبر　　در دلش شد ہدایت پنہان
بست رخت سفر بزود تمام　　بر ہمہ کس نمود عزم عیان
از مکان شد بروں بہ قصد بہار　　کاکو ہم بود منزل سلطان
خیمہ زد نزد مرقدِ اقدس　　یعنی بی بی کمال قطب زمان
مرقدش بود کہنہ و معدوم　　ہم زمین شد بگرد آن ویران
شاہ دل خستہ بد ز رنج سفر　　ہم پریشان حال و تشنہ دہان
گفت خدام را کہ آب بیار　　خشک از تشنگی شدہ است زبان
خندقی کہنہ نزد خیمہ بود　　آب آن بد نہ لائق شاہان
خادمے آب چند آوردہ　　پیش شہ کرد با دل ترسان
چون کہ بد تشنگی بر او غالب　　آب نوشید آن شہ ذیشان
راحتے یافت در طبیعت خود　　شد مزاجش بحال و ہم شادان
آب خوردہ اثر بدید آن شاہ　　شبش چون نیافت شد حیران
از مزار ولیۂ کامل　　خادم آن دیار کرد بیان

Marfat.com

این خبر چون شنید بی تعویق　　شاہ شد بر مزار فاتحہ خوان
حکم تعمیر روضہ جاری کرد　　ہم بنا کرد عیدگاہ و مکان
چاہ را ہم بنائے محکم کرد　　"چاہ صحت" نہاد اسم آن
ہفت صد بود و شصت از ہجری　　سال تعمیر بار اول آن

(۷۶۰ھ)

چونکہ ولیہ کامل حضرت بی بی کمالؒ کا روضہ جسے شاہ فیروز تغلق نے بنوایا تھا، امتداد زمانہ سے کہنہ ہوگیا تھا اور کئی دیواریں منہدم ہو چکی تھیں، لہٰذا شاہ غفور الرحمٰن حمد کاکوی اور دیگر رؤسائے کاکو نے دوبارہ اس کی تعمیر مکمل کروائی۔ اس موقع پر ہمارے ممدوح نے مندرجہ ذیل قطعہ لکھا تھا:

ز امتداد زمانہ کہنہ شود　　ہر عمارت بہ گردش دوران
بعد مدت قریب شش صد سال　　بہر تعمیر شد سروسامان
نظم تعمیر بار دیگر ماند　　بہ من ناتوان و ہیچ مدان
حمد مضمون را تمام بکن　　سال تعمیر پرس از رضوان
گفت سال بنائے بار دگر　　"روضۂ اقدس ولی زمان"

۱۳۲۰ھ

حضرت بی بی کمالؒ کے روضہ مبارک کے پاس وہ "صحت کنواں" بھی منہدم ہوگیا تھا جس کے پانی سے فیروز شاہ تغلق کو صحت حاصل ہوئی تھی۔ اہل کاکو کے باہمی اشتراک سے "چاہِ صحت" کی دوبارہ تعمیر ۵۶۲ سال بعد ہوئی تھی۔ اس حوالے سے حمد کاکوی نے ایک طویل قطعہ بہ عنوان "قطعۂ تاریخ تعمیر بار دیگر چاہ صحت درگاہ شریف" لکھا، جس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

چاہ صحت بستہ فیروز شاہ　　در جوارِ روضۂ بی بی کمال
آب آن شیرین و ہم سرد و سبک　　صاف چون آب روان گوہر مثال
ہست تاثیر شفا در آب آن　　از دعائے حضرتِ بی بی کمال
منہدم گردید چون از کہنگی　　ماند تشنہ لب خلایق چند سال
ہمتی فرمود بر تعمیر چاہ　　تا بماند یادگارش بے مثال
نظم تعمیرش بدست من مداد　　شد تمام از فضل رب ذوالجلال
بہر تاریخ بنائے چاہ حمد　　از جناب خضر چون کردہ سوال

Marfat.com

گفت او: دوبار کش از چاہ آب　　سال گردد "چشمۂ فیضِ کمال"
(۱۳۲۲ھ)

شاہ غفورالرحمٰن حمد کاکوی نے ۱۳۲۰ھ میں آثار کاکو کے عنوان سے اس قدیم بستی کی تاریخ لکھنی شروع کی تھی۔ اس میں مسلسل اضافہ بھی کرتے رہے۔ بالآخر ۱۳۵۴ھ میں اس نثری کتاب کو مکمل طور پر کاتب سے لکھوا کر حسب ذیل قطعہ تاریخ لکھا:

فکر ایزد چون نہ سازم روز و شب　　سالہا از فکر و کوشش بے شمار
در ہزار و سہ صد و ہم بست سال　　کردم آغازش نوشتم چند بار
عاقبت گشتہ مرتب این کتاب　　تا بماند بہر کاکو یادگار
سال اتمامش رقم زد خامہ ام　　یک ہزار و سہ صد و پنجاہ و چار
۱۳۵۴ھ

اردو کلام

حمد

فلک تیرا، زمیں تیری، چمن تیرا، شجر تیرا
یہ گل تیرا، یہ بُو تیری، تری رنگت، ثمر تیرا
تو ہی خالق، تو ہی رازق، تو ہی مالک، تو ہی سب کچھ
کبھی ہم چھوڑ سکتے ہیں کسی حالت میں در تیرا
ترے خوانِ کرم سے نعمتیں ملتی ہیں ہر اک کو
کوئی بھی بھول سکتا ہے یہ احساں عمر بھر تیرا
ترا دریا، ترا پانی، تری موجیں، تری لہریں
ترا ہی قطرۂ نیساں، صدف تیری، گہر تیرا
یہ دن تیرا، یہ شب تیری، یہ ہیں شام و سحر تیرے
سفیدی و سیاہی تیری ہے شمس و قمر تیرا
کسی کا کچھ نہیں، سب کچھ ترا ہی ہے دو عالم میں
یہاں تیرا، وہاں تیرا، اِدھر تیرا، اُدھر تیرا

Marfat.com

نعت

ہوا ختم سارے کمال کا، "بلغ العلیٰ بکمالہ"
ہے جہاں میں نور جمال کا، "کشف الدّجیٰ بجمالہ"
ہوا کون ایسے خصال کا، "حسنت جمیع خصالہ"
میں غلام دل سے ہوں آل کا، صلوا علیہ و آلہ"

غزلیات

پڑی جس پہ بس کارگر ہوگئی　　بلا کی تمہاری نظر ہوگئی
شب وصل دم میں بسر ہوگئی　　پلک بھی نہ جھپکی سحر ہوگئی

جان و دل سے جو فدائے در جاناں ہوں گے
لذت وصل سے اک دن وہی شاداں ہوں گے
میں وہ دیوانہ ہوں جاؤں جو بیاباں کی طرف
اٹھ کے پابوس مرے خار مغیلاں ہوں گے

ہم فقیروں کی دعا سوغات ہے
منعمو! اپنی یہی اوقات ہے

جب کوئی اپنا دردمند نہیں
ایسا جینا ہمیں پسند نہیں

سن کے آواز دم پلٹ آیا
کس نے ہم کو ابھی پکارا ہے
رہ گیا نام ہی زبانوں پر
نہ سکندر ہی ہے نہ دارا ہے

Marfat.com

ہے سفر میں رات دن تھکتا کبھی یہ دل نہیں
یہ مسافر اور ہے جس کی کوئی منزل نہیں

تا عمر ترے جلوے کو دیکھا نہ کسی نے
حضرتؑ نے ہمارے مگر اک آن میں دیکھا

قطعہ

خط مرا لے کر گیا قاصد وہاں		دیکھ کر اس نے بڑا غصہ کیا
پھر ٹھہر کر، سوچ کر، کچھ دل میں وہ		دیر تک خط کو مرے دیکھا کیا
بعد اس کے کھول کر خط کو پڑھا		پُرسشِ احوال بھی میرا کیا
دشمنوں نے ماجرا دیکھا جو یہ		جل کے بولے آپ نے یہ کیا کیا
پھر مزاجِ یار برہم ہوگیا		اے مری تقدیر تو نے کیا کیا

چائے نامہ

اپنی نوعیت کی یہ واحد اردو نظم حمد کاکوی نے ۱۹۱۰ء میں لکھی تھی۔ ۲۴ بند پر مشتمل اس ''چائے نامہ'' کو حضرت کے دوسرے صاحبزادے مولانا شاہ منظور الرحمٰن اختر کاکوی (دارالمصنفین، اعظم گڑھ کے مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن کے ہم جماعت) نے ۱۹۳۰ء میں شائع کرایا تھا۔ دو بند تبرکاً پیش خدمت ہیں:

چائے پینے کی یہ کیا چل گئی دنیا میں ہوا
کچھ عجب طرح کا یاروں کو پڑا ہے لپکا
سحر و شام ہر اک گھر میں ہے اس کا چرچا
بزم احباب میں اب دور ہے اس کا چلتا
چائے ملنے کو جس سے تو ہو اس کی دعوت
اس کی خاطر سے بھی ہوجاتی ہے دل کو رغبت
رنگ کو اس کے کہو خونِ کبوتر تو بجا
اشک عشاق سے تشبیہ دو اس کو تو روا

Marfat.com

اس کی بو باس پہ ہر شخص کا دل ہے کھنچتا
اور پینے میں بھی ملتا ہے عجب لطف و مزا
غور سے دیکھو تو ہر شان ہے اس کی محبوب
پھر یہ کیونکر نہ ہو انساں کے دلوں کو مرغوب

مآخذ

۱۔آثار کاکو، شاہ غفور الرحمٰن حمد کاکوی، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ، ۱۹۸۶ء
۲۔بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، س ن
۳۔بہار اور اردو شاعری، پروفیسر معین الدین دردائی، پٹنا، ۱۹۵۲ء
۴۔تاریخ سلسلۂ فردوسیہ، پٹنا، ۱۹۵۱ء
۵۔تحقیقی مقالات، ایضاً، ۱۹۵۳ء
۶۔چائے نامہ، شاہ غفور الرحمٰن حمد کاکوی، بزم کمال کاکو، ۱۹۳۰ء
۷۔سفینہ، مدیر، شاہ عطاء الرحمٰن، ۱۹۸۸ء، پٹنہ
۸۔شرفا کی نگری، قیام الدین، کراچی، ۱۹۹۵ء
۹۔نقوش (شخصیات نمبر)، لاہور، ۱۹۵۸ء

☆☆☆

Marfat.com

صہبا اختر کی شاعری کے چند تابناک پہلو

غلام حسین وانی☆

وہ آگ کا پالا اور دھوپ کا بیٹا شاعر جسے زندگی کی تلخیوں نے عین عالمِ شباب میں پیرانہ سالی کی دہلیز پر کھڑا کر دیا صہبا اختر مرحوم، جن کے چار مجموعہ ہائے کلام **سرکشیدہ، اقراء، سمندر، اور مشعل** زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آکر دعوتِ فکر و نظر دے رہے ہیں جبکہ مزید نو مجموعہ ہائے اشعار **خزینہ، خراج، ارژنگ، جل ترنگ، قطعات، تلچھٹ، دعا در دعا، ایقان، اور سرگذشت صہبا** ابھی منتظرِ اشاعت ہیں۔ ہر مجموعہ کم از کم نصف ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ تخلیقات کی اس کثرت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کس قدر پُرگو شاعر تھے۔ صرف مشعل کے دیدہ زیب صحیفہ میں ایک سو چوالیس نظمیں شامل ہیں۔ گویا یہ ملی ترانوں، قومی نغمات اور حُب الوطنی کے جذبات سے سرشار منظومات کا گنجینہ ہے۔

زیرِ نظر مجموعوں میں تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی ملتی ہے۔ صہبا کی شاعری کا موضوعاتی پہلو نمایاں ہے۔ ان کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ صہبا کسی ایک میدان کے شاعر ہو کر نہیں رہے۔ انہوں نے روایت کو بھی برقرار رکھا اور جدید تجربات سے بھی کام لیا۔ غزل کہی تو نغز گو سخنورانِ کامل کی صف میں بھرپور قد و قامت کے ساتھ نظر آنے لگے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ گل و بلبل اور ہجر و وصال کے مضامین کے ساتھ لیلائے وطن سے عشق کے نغمے بھی لکھے۔ نہ غزل کے مزاج کو فرسودہ ہونے دیا نہ اپنی معاشرتی ذمہ داریوں سے کوتاہی و غفلت کا الزام لیا۔ قصیدہ لکھا تو ذوق اور سودا کے صحبت یافتہ دکھائی دیے، البتہ شاہانِ عصر اور خداوندانِ سیاست کی تعریفات کے برعکس وطن کے مرغزاروں کو موضوعِ سخن بنایا۔ شاہی درباروں کی خوشامد کو وہ قلم کی توہین سمجھتے رہے۔ مرثیہ پر قلم اٹھایا تو جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی، فیضی اور امید فاضلی جیسے جلیل المرتبت شعرا کے ہم مرتبہ ٹھہرے۔

فکری توانائی کا عالم یہ ہے کہ شعر کہے جا رہے ہیں مگر تخیل میں تکان اور سخن گستری

☆ پرنسپل باغ ماڈل کالج، معرفت غلام احمد میر، حیدری چوک بازار، باغ، آزاد کشمیر

Marfat.com

میں ابتذال کی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ نیا شعر، نئی آب و تاب، تازگی اور شوخی کا احساس دلاتا ہے، تفکر پہ تصنع کا شائبہ تک نہیں۔ فکر کی پرواز لحہ بہ لحہ آسمان تخلیل کو چھوتی نظر آتی ہے۔ مفہوم کی سربستگی اور اظہار کی برجستگی میں سرمو فرق نہیں آنے دیتے۔ اپنی زبان پر اس قدر ناز ہے کہتے ہیں جو دودھ میں پی لی ہے وہی اپنی زباں ٹھہری۔ جس سے اہل زبان ہونے کا واضح اظہار ملتا ہے۔ یوں جن تین شعرائے کرام یعنی حضرت داغ دہلوی، میر تقی میر، اور فردوسی ہند میر انیس نے اردو زبان کی وراثت کا دعویٰ کیا ہے، ان میں چوتھا نام صہبا مرحوم کا بھی شامل ہوگیا۔

سخن سرائی میں جب کسی موضوع کو مس کرتے ہیں تو توسن خیال کی برق رفتاری اور رہوار قلم کی بادپائی بھرپور جولانی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ زود گوئی کے باوجود مضمون اور لفظ کا آپس میں اچھوتا رشتہ قائم کرکے دلکش ترکیبات اور نادر استعارات وضع کرنے میں دشواری محسوس نہیں کرتے، جو جدید ہونے کے باوجود اہل زبان کی قدیم میراث کا حصہ لگتے ہیں۔ اہل زبان ہونے کے باعث خاطر خواہ انداز میں الفاظ کا استعمال جائز گردانتے ہیں۔ جیسے شعلہ پن کے لیے شعلگی کا برتاؤ درست جانا ہے۔

صہبا کی شاعری حقائق کی ترجمانی ہے۔ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو منطقی انداز بیان کا جامہ پہنا کے شعر کو بلا کی اثر آفرینی بخش دیتے ہیں۔ وہ الفاظ کی تراش کا دشوار ترین مرحلہ نہایت آسانی کے ساتھ طے کرلیتے ہیں۔ وہ اَدَق الفاظ استعمال کرکے مفہوم کو پیچ در پیچ بھول بھلتیوں میں الجھا دینے کے قائل نہیں۔ وہ حدیث دل اور احساس کی فریاد بغیر کسی دشواری کے اپنے قاری تک پہنچانے کی بھرپور سعی کرتے ہیں اور اس میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ الفاظ سے تیغ آبدار کی کاٹ کا کام لینے سے بخوبی آگاہ ہیں اور اس ہنر میں یکتا دکھائی دیتے ہیں۔ جس نے صہبا کو خواص کا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عوامی شاعر بھی بنا دیا ہے۔ ہر ترکیب دلآویز اور ہر استعارہ مانوس لگتا ہے۔ وہ اپنی آواز کا ردعمل چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حلقۂ احباب اور مدحت گزاروں کے طبقہ میں ان کی شاعری کی گونج آج بھی موجود ہے۔ یہ گونج اس بات کی شاہد ہے کہ صہبا مرحوم نہیں بلکہ اپنی شاعری کی صدائے بازگشت کے روپ میں حلقۂ یاراں کے اندر اپنی توانائی کے ساتھ ہنوز بقید حیات ہیں۔

صہبا کی عقابی آنکھ واقعات کی تہہ میں جھانک کر نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ سطحی مشاہدے کے عادی نہیں۔ ان کی شاعری میں درد بھی ہے درد کے اسباب بھی ہیں اور درد کا مداوا بھی۔ وہ اپنے روگ کی چارہ گری کے لیے کسی بیرونی مسیحا کے دست حنائی کے

Marfat.com

جو یا نظر نہیں آتے۔ وہ اپنے سفینے کے پتوار اپنے ہاتھوں میں دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ یہی خودی اور خودداری ہمیشہ ان کے شاعر دربار ہونے میں سدِ راہ بنی رہی۔ ان کے قلم کی کمان مضمون کے عوارض ذاتی اور ہر جہت کو اپنی ناوک اندازی کی زد پر رکھنے کی پوری قوت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ الفاظ کی صنعت گری میں انہیں مہارت تامہ حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ روزمرہ کی گفتگو کو شعری قالب میں نہایت سہولت کے ساتھ ڈھال لیتے ہیں اور سخن آرائی ان کے لیے دشوار مشغلہ نہیں رہتی۔ وہ کمین گاہ میں رہ کر تیراندازی کی بجائے دُوبدو، تقابل کا حوصلہ رکھتے ہیں اور اس میں فخر بھی محسوس کرتے ہیں۔ حق گوئی میں مصلحت اندیشی کو قلمی خیانت سے تعبیر کرتے ہیں۔ تلخ بات جرأت رندانہ سے کہہ دیتے ہیں اور عواقب کی پروا نہیں کرتے۔

صہبا کے جذبات میں کہربائی تاثیر ہے۔ وہ پیش پا افتادہ ذخیرہ الفاظ سے اپنے مطلب کا بچا لفظ کشید کر لیتے ہیں اور اسے سلکِ مروارید کی طرح شعر کا جُز بنا دیتے ہیں۔ سلاست و روانی سیلِ نا آشنائے ساحل کی طرح موج در موج آگے بڑھتی ہے اور اپنی مخصوص اثرپذیری کے وصف میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی ان کے شعری لہجے کی نمایاں پہچان ہے۔ جنہوں نے صہبا کو اپنا کلام خود سناتے ہوئے دیکھا ہو وہ بخوبی جانتے ہیں کہ صہبا دبستان لکھنو کے زیر اثر انیس کی طرح اپنا مخصوص اندازِ تکلم رکھتے تھے۔ وہ اپنے مخصوص اشاروں اور دلنشیں حرکات وسکنات سے اشعار میں جان ڈال دیتے تھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ صہبا نہیں بولتے بلکہ اشعار اپنی صوتیات میں مضمر مخصوص کیفیات سے خود گویا ہیں۔

شاعری کی بلحاظِ ادب اور بلحاظ موضوع کئی اقسام ہیں۔ ہر قسم بجائے خود نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ بلحاظ اصناف ادب غزل، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی، مخمس، مسدس وغیرہ اور بلحاظ موضوع رزمیہ، طربیہ، حزنیہ، عشقیہ، مزاحیہ، مزاحمتی، زندانی اور سنجیدہ شاعری بطور خاص مشہور ہیں۔ شاعری کی کچھ جہتیں بھی ہیں جنہیں پہلوؤں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شاعری کے یہ پہلو فکری فنی اور لسانی پہلو کہلاتے ہیں۔

جب شاعری کے فنی پہلوؤں کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس میں قواعد وضوابط، ہیئت و مواد کی ترتیب و معیار عروض علم بیان بندشِ موضوع وفکر اسی طرح کے دیگر لوازمات زیر بحث رہتے ہیں۔فکری پہلوؤں میں شاعر کے فکر وشعور کی پرداخت طائر تخیل کی بلند پروازی، وسعتِ نظر، مضامین کا پھیلاؤ، مواد کی تخلیق، زبان کا انتخاب اور میلان طبع کی خصوصیات مدنظر رہتی ہیں۔

صہبا اختر کی شاعری کے فنی اور ادبی دونوں ہی پہلو دیدنی ہیں۔ ان کی شاعری تمام اصناف ادب پر محیط ہے اور اسی لیے جامع ہے۔انہوں نے شاعری میں نہ صرف شعری حسن کی

Marfat.com

کلاسیکل روایت کو زندہ رکھا بلکہ بعض ہیئتوں میں جدتیں بھی اختیار کیں اور اختراع و ایجاد سے بھی کام لیا اور صنائع و بدائع کے جوہر بھی دکھائے۔ ان کی شاعری میں آورد کے مقابلے میں آمد کا عنصر غالب ہے۔ جس کی وجہ سے انہیں ہیئت کی روایتی پابندیوں کا حصار توڑ کر مواد کے اظہار کی خاطر اصناف کی ہیئت میں تشکیل جدید کا سہارا بھی لینا پڑا۔ بندش خیال، تراکیب کی پیوند کاری، تشبیہات کی ندرت، استعارہ بندی کا کمال، لطافت احساس، اور جذبوں کی حرارت جیسے اوصاف ان کے ہاں اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے حسی لطافتوں کے ساتھ ساتھ گہرے مشاہدات اور حقائق کے ادراک پر بھی اپنی توجہات کو مرکوز رکھا۔

فکری اعتبار سے ان کی شاعری کے تین ترکیبی خواص ہیں۔ یعنی سلگتے مسائل، حب الوطنی، اور انسانی اقدار کے زوال کا ماتم، انہی خصوصیات نے ان کی شاعری کو بامقصد شاعری بنا دیا ہے۔ ان کے شعری اظہار کے مطابق ایک نظریے کے تحت ایک مقصد کی تکمیل کی خاطر عملی جدوجہد کا نام تحریکِ پاکستان ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کو عجب منطقی پیرائے میں صرف ایک شعر کے اندر سمو دیا ہے:

کل قوم کو تلاش تھی اِک ملک کی مگر
اب ملک ڈھونڈتا ہے مری قوم ہے کہاں

یہ صہبا کے دور کا المیہ ہے۔ اس نے پاکستان بنتے بھی دیکھا اور پھر اسے ٹوٹنے کے المناک صدمے کو بھی سہہ لیا، اور پھر مملکت خداداد کی پہلی راجدھانی کو اپنی آنکھوں سے مختلف عصبیتوں کی آگ کے الاؤ کا ایندھن بنتے بھی دیکھا۔ پاکستان اس کے حسین خوابوں کی روشن تعبیر تھی۔ صہبا نے محض تفریحِ طبع اور تسکینِ ذات کی خاطر شاعری کا جان لیوا روگ اختیار نہیں کیا تھا۔ گرد و پیش کے سلگتے مسائل کی آگ کے شعلے اس کے دامن تک پہنچ گئے تھے، اور پھر کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں رونما ہونے والے اندوہناک واقعات اور روح فرسا حادثات بھی خود اس کے اپنے وطن کے مصائب و آلام سے مختلف نہ تھے۔ یہ صورت حال ان کے لیے تحریک سخن کا سبب بنی۔ انہوں نے ہومر، فردوسی، حالی اور اقبال کی طرح ذہنی بیداری اور ابلاغ مقاصد کی شاعری کی۔ اقبال کی شاعری کے نتیجے میں پاکستان کو وجود ملا اور صہبا کی شاعری میں پاکستان سے بے لوث محبت کی روشنی سامنے آئی۔ فرق اتنا ہے کہ صہبا نے سیدھے سادے الفاظ میں حقائق کو محل گفتگو ٹھہرایا۔ ان کی شاعری پر فلسفے کی چھاپ نہیں۔ نظریے کے لیے استدلالی پہلو کا قوی ہونا ضروری ہوتا ہے جو فلسفے کے بغیر ناممکن ہے۔ محبت اور عشق کے لیے دلیل درکار نہیں ہوتی۔ محبت کی بات بلا کم و کاست اپنے قاری تک پہنچانا صہبا کی شاعری

Marfat.com

کا فلسفہ رہا ہے اور سارے قاری فلسفی نہیں ہوتے۔

شعر میں تنوعِ فکر اور لطیف جذبوں کی آمیزش ہو تو یہ وصف اسے شراب دو آتشہ بنادیتا ہے۔ فکر کا تعلق دماغ اور ذہنی قوتوں سے ہے اور جذبے کا تعلق دل سے۔ دل امیدوں اور خواہشات کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ صہبا کے اشعار یکساں طور پر دونوں کے لیے سامان تلطف اور تحفہ تلذذ پیش کرتے ہیں کہ دل داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا اور ذہن غور کیے بغیر تسکین نہیں پاتا۔ انسان جن عصری مسائل کی لپیٹ میں آچکا ہے صہبا ان کا پورا ادراک رکھتے ہیں۔ صداقتوں کے شہر میں مصلحت کوشی کے زہر کی ملاوٹ کا جرم ان کی شاعری کے دامن کا داغ نہ بن سکا۔ ان کی شاعری میں کمپیوٹر، میزائل، راکٹ، اور جوہری توانائی کے مختلف روپ ہر طرح سے داخل ہیں۔ دل ہلا دینے والے پے در پے قومی حادثات کے پس منظر میں کارفرما اسباب و علل ان کی شاعری کے نمایاں پہلو ہیں۔ وہ خود پاکستان کی تاریخ ہیں۔ ہجرت، فراق، غم روزگار، اور اعزہ و اقارب کے داغ ہائے مفارقت ان کے سانحات ہیں۔ وہ زبان شعر میں پاکستان کی تاریخ رقم کر گئے ہیں، اس لیے بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری جہاں بامقصد ادبی کام ہے وہاں عصری حالات کی تاریخی دستاویز بھی ہے۔

ان کی شاعری کا حرف حرف پیغام اور لفظ لفظ نصیحت ہے۔ شعر شعر سے وطن کے ساتھ والہانہ عقیدت اور بے پناہ عشق کا نور جھلکتا ہے۔ وہ وطن کی سلامتی کی خاطر ہر آشوب قیامت سے گذر جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں:

ہم پہ گذریں قیامتیں لیکن
تو سلامت رہے قیامت تک

فراعین عصر اور ہامانِ زمانہ سے برملا اظہار برأت ان کا شیوہ ہے۔ وہ شداد صفت حکمرانوں کے خلاف شمشیر برہنہ نظر آتے ہیں۔

تاجداروں کا قصیدہ مرے فن پر ہے حرام
جو کبھی بکتا نہیں وہ شاعر خوددار ہوں
کس نے دیکھا ہے مجھے ایوان شاہی میں کبھی
کون کہتا ہے مجھے میں شاعر دربار ہوں

ان کا پورا مجموعہ کلام وطن دوستی کے جذبے کا مظہر ہے۔ پورے مجموعۂ کلام میں معدودے چند منظومات ہی ایسی ہوں گی جن کا موضوع علاوہ پاکستان کے کچھ اور ہوگا۔ دو قومی نظریہ، قائداعظم، قیام پاکستان، قیادت کا فقدان، صوبائی عصبیت، ہجرت، جداگانہ وطن کی

Marfat.com

ضرورت، اسلامی اخوت اور رواداری کا زوال، غارت گری، دہشت گردی، و تفرقہ، قابل ذکر ہیں۔ وطن سے اندھی عقیدت کے بارے میں ان کے فکر و شعور اور حبیب جالب کے جذبہ و آہنگ میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

صرف نوحہ اور فریاد کی لے الگ الگ ہے۔ جالب کے انداز میں گہری طنز اور واشگاف الفاظ میں نفرت کا اظہار ہے۔ جب کہ صہبا کے لہجے میں شکوہ سنجی اور گلہ مندی کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ التجا ہے۔ صہبا تلخ ترین بات گلے کے طور پر کہہ دیتے ہیں جس سے حقیقت کا اظہار بھی ہوجاتا ہے اور شعری حلاوت بھی زبان سے چھوٹتی نظر نہیں آتی:

یک بام دو ہوا نہیں اسلام کے اصول
کیا کیا تعصّبات اڑاتے رہے ہیں دھول
افغان تیس لاکھ بھی منظور تھے ہمیں
افسوس تین لاکھ بہاری نہیں قبول

دوسرا شکوہ ملاحظہ فرمایئے:

شاخوں سے شکایت ہے تو شاخوں کو کتر دو
شاخوں کے لیے جڑ کو اکھاڑا نہیں کرتے
ہائے یہ گلشنِ ملّت کا تضاد
بے وفا لوگ، وفادار وطن

قیام پاکستان کے بعد وہ ایسے پاکستانی معاشرے کے متمنی دکھائی دیتے ہیں جن کی اقدار اسلامی تعلیمات پر استوار ہوں۔ ان کی شاعری سے ان کی سماجی زندگی، ادبی شخصیت اور دینی رجحانات کے جو خدوخال سامنے آتے ہیں ان سے وہ پاکستانی معاشرے سے شاکی نظر آتے ہیں۔ پاکستان کے ساتھ ان کی گہری توقعات وابستہ تھیں۔ وہ پاکستانی سقراطوں کے متعلق فرماتے ہیں:

ہمارے دور میں سقراط کم نہیں
یہ زہر پیتے نہیں فقط پلاتے ہیں
برہمن زادگان ہند بھی شاید یہ کہتے ہوں
مسلمانوں کے ہاتھوں خود مسلمانوں پہ کیا گزری

انسان دشمن عناصر کی شقاوت قلبی ان کے نزدیک ایٹم بم سے زیادہ خطرناک ہے۔ انسان سے انسان کی عداوت جوہری ہتھیاروں سے زیادہ مہلک ہتھیار ہے۔ انا پرست عناصر ذاتی مفادات کے حصول کی خاطر طرح طرح کے خطرناک منصوبوں کی ترتیب میں مشغول

Marfat.com

رہتے ہیں۔ ان منصوبوں کی ہولناک تاریکیوں کے مکروہ سائے صہبا کے اردگرد بھی منڈلاتے رہے اور قدم قدم پر ان کی راہ روکتے رہے مگر وہ اپنی روشن فکر کے چراغ کی لو بڑھاتے گئے اور بڑھتے گئے۔ قنوطیت کے مہیب بادل اپنا مکروہ چہرہ لے کر سامنے آ بھی گئے تو انہوں نے امید کی شمعیں روشن کیں اور رجائیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

اے قلم قبیلہ کے نوحہ گرو　　میرے حق دوستو، میرے دانشورو
اپنے تاریک اکناف و اطراف کا　　آؤ ماتم کریں عدل و انصاف کا
ہم بریدہ دہن، ہم شکستہ زبان　　ہم سیاہ پوش ہیں احتجاجِ وطن
ہم قلم کی سیاہی میں ملبوس ہیں　　آؤ کہہ دیں کہ ہم سب سے مایوس ہیں

جب سراپا احتجاج ہوتے ہیں تو کہتے ہیں:

ہم کو تیرہ شبوں کی سحر چاہیے　　ہم کو توقیر نوعِ بشر چاہیے
یہ اندھیرا نہیں روشنی چاہیے　　یہ جنازے نہیں زندگی چاہیے

ان کی شاعری استبدادی قوتوں اور ان کے آلہ کار عناصر کے خلاف برملا نفرت کا اظہار اور بغاوت کا نعرہ ہے:

ہمیں روٹی بھی دو گے یا فقط راکٹ کھلاؤ گے
ہمارے بعد کیا دنیا کو لاشوں سے سجاؤ گے
سرِ دنیا یہ تم کیسے اجل کے راگ لے آئے
کہ ہم آئے تو تم ایٹم بموں کی آگ لے آئے

پاکستان کے ساتھ ان کی روح کا ابدی رشتہ تھا:

زمین کا صرف ایک ٹکڑا نہیں یہ وطن میرا
نظریہ ہے، فقط نقشہ نہیں یہ وطن میرا

وہ پاکستان کے معروضی حالات سے دل برداشتہ ہو کر کبھی کبھی سیاسی پیشگوئی بھی کر دیتے ہیں۔ یہ ان کی سیاسی بصیرت یا شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ مشرقی بازو کے کٹ جانے کے بعد ان کا عبرت ناک مشاہدہ بھی ہے:

میرے دائیں ہاتھ نے میرے بائیں ہاتھ کو
کاٹ ڈالا اور کہا میں مکمل ہوگیا

Marfat.com

جن کو وطن کی خاطر لڑنا تھا دشمنوں سے
لاشیں اٹھا اٹھا کے وہ ہاتھ ہوگئے شل
میں جب بھی دیکھتا ہوں گوشوارہ اپنی ملت کا
وطن تقسیم در تقسیم در تقسیم ملتا ہے

صہبا نئی نسل کو عالمگیر اخوت اور انسان دوستی کا پیغام دیتے ہوئے انہیں نصیحت کرتے ہیں:

مگر میں تو محبت اور اخوت کا منادی ہوں
میں اپنے دشمنوں کو بھی دعا دینے کا عادی ہوں
میں وہ بادل ہوں جسے ایک چاہت سے چھلکنا ہے
وہ صحرا ہو کہ گلشن ہو، مری فطرت برسنا ہے

سماجی عدم مساوات اور معاشی ناہمواریوں سے متاثر ہوکر فرماتے ہیں:

آدمی آدمی گزیدہ
سانپ ڈستے نہیں ہیں سانپوں کو

وہ اپنے قاری سے مخاطب ہوکر جواب چاہتے ہیں، اور مثبت رویوں کی توقعات رکھتے ہیں؛ مگر قاری کو بہرہ پاکر مایوس ہوجاتے ہیں اور فرماتے ہیں:

اللہ کا اعلان سنائی نہیں دیتا
سرکار کا فرمان سنائی نہیں دیتا
کیا مجھ سے گنہگار کی آواز سنے گی
جس قوم کو قرآن سنائی نہیں دیتا

صہبا نے ماضی کے استعاروں کو عصری تقاضوں کو معنی پہنا کر اسی طرح وطنیت کے اشاروں میں بدل دیا ہے جس طرح محسن نقوی نے کربلائی استعاروں کو جدت بخشی ہے اور اپنے کلام کو مزین کیا ہے۔ صہبا نے جن پاکستانی استعاروں کو اپنے کلام کی زینت بنایا ان میں مفہوم نہایت معصومیت کے ساتھ بولتا دکھائی دیتا ہے۔ یزید وطن، عراقِ محبت، زیور آدمیت، انجیل تمدن، کربلائے کشمیر، چاند چناب، سند ستارے، خیاط اجل، زہر آب حیات، غنیم سحر، چراغ تہذیب، آگ کا ساون ، اور سیلاب شقاوت، اپنا منفرد حسن رکھتے ہیں ان پر بہت کچھ لکھنے کو باقی رہے گا۔

صہبا کا غمِ جاں گسل آشوبِ وطن ہے۔ جاہ پسند اقتدار کی خوگر قوتیں بیرونی ہاتھوں کی آلہ کا بن کر ملکی عناصر کو درپردہ رکھ کر آگ اور خون کی ہولی کھیلنے کا کھیل سکھاتے ہیں۔ ملک کے اندر آہستہ آہستہ دہشت گردی کا شعور پرورش پاتا ہے۔ پوری نسل اسی روش پر پروان

Marfat.com

چڑھتی ہے۔ بیچارے معصوم لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ وہ قاتل کیوں ہیں اور مقتول کیوں ہیں۔ قاتل نہیں جانتا کسے قتل کر رہا ہے اور مقتول کو یہ علم نہیں کہ وہ قتل کیوں ہو رہا ہے۔ اس المیے کو صہبا یوں محسوس کرتے ہیں:

اس کوچۂ وحشت میں ہم آباد ہیں جس میں
مقتول تو مل جاتے ہیں قاتل نہیں ملتا
قاتل کو نہیں علم کہ مقتول ہوا کون
مقتول کو معلوم نہیں کون ہے قاتل

صہبا اس اہل وطن کو بھی حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھتے ہیں جو وطن سے محبت کا دعویدار بھی ہے اور اہل وطن کے لہو سے اس کے ہاتھ بھی رنگین ہیں:

مجھے تسلیم شعلہ آزما غیروں کے خنجر ہیں
مگر اپنوں کے خوں سے تو ہمارے ہاتھ بھی تر ہیں
درندوں سے بڑھ کر نوع بشر کیوں ہے؟
محبت کی بجائے نفرتوں کا یہ سفر کیوں ہے؟
بموں کی آگ تو تخریب کاروں کی شقاوت ہے
مگر اس سے بھی زیادہ زلزلہ ساماں وہ نفرت ہے
کہ جس کی آگ ہم نے دیدہ و دل میں ہے بھڑکائی

دیدہ و دل کی آگ سے شاعر کی مراد وہ نفرت ہے جو اہل وطن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف پھیلائی جا رہی ہے۔ اہل وطن ایک دوسرے کو دل سے نہیں چاہتے اور آنکھ سے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ کدورتوں اور رنجشوں کے عفریت نحیف و نزار اہل وطن کو اپنے خونی پنجوں کا شکار کیے ہوئے ہیں۔ نفرتوں کا زہر تباہ کن سیلاب کی طرح نسل جدید کو بہائے لے جا رہا ہے۔ اس کے سامنے موثر بند باندھنے کی ساری کوششیں غیر موثر نظر آ رہی ہیں۔ محبت، رواداری اور ملی ہم آہنگی کا کوئی پشتہ اس کے سامنے بنیاد نہیں جما سکتا۔ وہ اپنے عہد سے دل برداشتہ دکھائی دیتے ہیں۔ صہبا کی شاعری کا باب یہی پر بند نہیں ہوتا۔ اس پہ تفصیل سے کام کرنے کی کافی گنجائش موجود ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب اس کا غیر مطبوعہ کلام زیور طبع سے آراستہ ہو کر قارئین تک پہنچ جاتا ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

فارسی کا ایک گمنام دہاتی شاعر

چوہدری خوشی محمد بیخود بوتالوی[1]

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی☆

کبھی وقت تھا جب پاکستان، بالخصوص خطۂ پنجاب، فارسی شعر وادب کا بہت بڑا گہوارہ تھا؛ یہاں تک کہ بعض ناخواندہ اور نیم خواندہ لوگ بھی کم از کم **گلستان و بوستانِ سعدی** اور **دیوان حافظ شیرازی** سے پوری طرح واقف اور ان کا باقاعدہ مطالعہ کیا کرتے تھے۔ راقم نے اپنے لڑکپن میں ایسے کئی لوگ دیکھے ہیں اور آج بھی، جب میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں، مجھے مصری شاہ لاہور کا وہ مرحوم کشمیری صوفی (نانبائی) یاد آرہا ہے جو اپنے کام سے فارغ ہوکر شام کے وقت **دیوان حافظ** لے کر بیٹھ جاتا اور پوری محویت سے اس کا مطالعہ کیا کرتا۔ کیا ہی اچھے دن تھے۔ **گلستان و بوستان** نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر رکھا تھا اور ان کے مطالعہ کے نتیجے میں، لوگ ایک دوسرے کے دل میں گھر کرنے کی مخلصانہ کوشش کیا کرتے تھے۔ اس طرح ہر طرف ہمدردی و غمگساری، پاک باطنی، پاکدلی اور مروت و اخلاق کا دور دورہ رہتا، پھر سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور آیا اور انسان ان خوبیوں سے دور ہوتا چلا گیا کہ بقول اقبال:

احساس مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

آج چھوٹوں کی دوڑ اس طرف لگی ہوئی ہے کہ وہ ڈاکٹر یا انجینئر بن کر قوم کی ''خدمت'' کریں، جبکہ بڑے دن رات دولت کے حصول میں سرگرداں ہیں۔ ان کا نصب العین ''دولت، دولت اور صرف دولت'' ہے۔ ایک عجیب اعصاب شکن صورت حال ہے۔ جو ''مشین مین'' ادب کے قائل نہیں اور اس سے بے تعلق اور اسے فضول اور بیکار چیز گردانتے ہیں، وہی لوگ سب سے زیادہ ناآسودگی کا

۱۔ یہ مضمون آج سے ۲۱ برس پہلے لکھا گیا تھا، جب راقم گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ فارسی سے متعلق تھا۔ اس زمانے میں ایم۔اے۔ کے ایک شاگرد غضنفر علی نے اپنے باپ سے متعارف کروایا تھا۔

☆ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، یزدانی سٹریٹ، ملت روڈ سمن آباد، لاہور

Marfat.com

شکار اور اعصاب کے مریض ہیں۔ ادب آدمی کو صحیح معنوں میں انسان بناتا ہے۔ یہ ایک طویل بحث ہے۔ بہرحال آج کے اس دورِ پُرفتن میں بھی کچھ ایسے ''دیوانے'' موجود ہیں جو نہ صرف فارسی ادب کے عاشق ہیں بلکہ خود بھی فارسی میں بڑے پیارے شعر کہتے ہیں اور یہ سب کچھ وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہوکر کرتے ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں ایک ایسے ہی ''دیوانے'' کا تعارف مقصود ہے جو بڑی خاموشی اور گوشہ نشینی کی حالت میں فارسی شعر کی خدمت کررہا ہے۔ عمر کے آخری حصے میں ہوتے ہوئے بھی اس کا ذوق و شوق بدستور جواں ہے۔ ایسے لوگ قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں، لیکن انہیں کون جانے کہ نہ تو وہ کسی اخبار کے کالم نگار ہیں اور نہ کوئی کالم نگار ان کا دوست ہے۔ بہرحال ''خوشبو آنست کہ خود بگوید نہ عطار بگوید۔''

چوہدری خوشی محمد صاحب ایک خالص دہاتی اور مردِ پیر ہیں۔ عمر کوئی ۷۳۔۷۲ برس ہوگی۔ شعر میں ''بیخود'' تخلص کرتے ہیں۔ پہلی ملاقات میں دیکھنے والے کو وہ ناخواندہ نظر آئیں گے۔ پھر ان کی گفتگو کا لہجہ بھی خالصتاً دہاتیوں کا سا ہے۔ ان کے چہرے مُہرے سے کوئی یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ ایسا شخص فارسی میں شعر کہہ سکتا ہے۔ بیخود کے والد احمد یار وڑائچ ایک کسان اور چھوٹے زمیندار تھے۔ یہ پیشہ انہیں ورثہ میں ملا تھا اور خود بیخود بھی اسی پیشے سے منسلک ہیں۔ انہوں نے کسی مدرسے یا کالج کا منہ نہیں دیکھا (ویسے وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں اپنے زیرِ تعلیم بیٹوں کو، ایک ایم ایس سی ریاضیات کا اور دوسرا ایم۔ اے فارسی کا طالبعلم، دیکھنے کئی مرتبہ آئے ہیں) انہوں نے جو کچھ پڑھا پڑھایا، قرآن مجید وغیرہ، اپنے والد اور والدہ ہی سے پڑھا ہے۔ ماں باپ کے جنت نشین ہونے کے بعد بیخود نے اپنے بڑے بھائی چوہدری عطاء اللہ وڑائچ سے کسی قدر کسبِ فیض کیا۔ بعد میں اگرچہ وہ اساتذہ ادب کے یہاں باقاعدگی سے تو نہیں جاتے رہے تاہم کبھی کبھار ان کی خدمت میں پہنچ کر ان سے استفادہ و استفاضہ کرتے رہے۔ راقم کے نام اپنے ایک خط میں بیخود رقم طراز ہیں کہ

میں کسی طور بھی پڑھا نہیں ہوں۔ کھیتی باڑی سے وابستہ ہوں، ہل چلاتا ہوں کہ میرے اجداد کا یہی پیشہ رہا ہے:

بجای خامہ در دست تو چوبِ قلبہ رانی شد
چہ شد بیخود کہ از نظمِ تو بزمِ شوق آرائید

البتہ بعض علم و ادب دوست اور سخن فہم حضرات نے میری دل جوئی اور حوصلہ افزائی کی خاطر مجھے توصیفی خطوط لکھے، جس کے سبب میں نے مجبور ہوا کہ انہیں فارسی میں منظوم خط لکھوں۔ ان سب کا شکریہ مجھ پر واجب ہے۔

Marfat.com

بیخود کے ایک دوست نے اپنی کتاب **رنگ سنگ** کو ان کے نام ان الفاظ میں معنون کیا ہے: ''چوہدری خوشی محمد بیخود بوتالوی کے نام جو حافظِ کلام حافظِ شیراز ہے، جو فارسی زبان کا شاعرِ دلنواز ہے، جو خوش نویس نادرہ پرداز ہے، جس کی ذات پُرخلوص و محبت کو ناز ہے۔''(۱)

پروفیسر آغا صادق حسین مرحوم فارسی اور اردو کے معروف شاعر تھے۔ وہ بھی بیخود کے کلام سے متاثر تھے۔ چنانچہ انہوں نے فارسی مجموعۂ کلام **شاخِ طوبیٰ** میں بیخود کی شخصیت وغیرہ کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ بیخود کو ایسے دوستوں کی اس محبت کا پورا پورا احساس ہے اور وہ ان کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنی تصانیف میں ان کا ذکر کیا ہے، ورنہ وہ خود ان کے بقول:

چہ گویم زندگی بی خون بہا در مفت رفت از دست
قتیلِ شوخیِ دورِ پُرآزاری کہ من ہستم
فریبِ رنگِ گُل خوردہ بہ گُلگشتِ چمن بیخود
کنون بی دام و بی دانہ گرفتاری کہ من ہستم

بیخود کا تعلق گوجرہ (ٹوبہ ٹیک سنگھ) کے گاؤں بوتالہ، چک ۳۰۶ ر ج۔ب سے ہے۔ ان کا خطِ نستعلیق ایک اچھے خوشنویس کی مانند خوبصورت اور دلکش ہے۔ ان کے تین بیٹے ہیں۔ بڑا لڑکا ارشاد علی گورنمنٹ کالج لاہور کا فارغ التحصیل اور آج کل گوجرہ کے گورنمنٹ کالج میں ریاضی کا پروفیسر ہے۔ دوسرا بیٹا غضنفر علی گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے فارسی میں نمایاں حیثیت کے ساتھ کامیاب ہو کر پیشۂ تدریس سے منسلک ہو چکا ہے۔ یہ دونوں برخوردار بھی فارسی شعر و ادب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے ہیں اور دونوں کا خط بھی اپنے والد کی طرح بڑا خوبصورت ہے۔ گویا ''این خانہ ہمہ آفتاب است''۔

بیخود، حافظ شیرازی کے بہت معتقد ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ حافظ کے عاشق و شیدا ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس سے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ کسی متشاعر نے (بیخود نے اس کا نام نہیں بتایا) حافظ کے بعض اشعار میں ترمیم کی۔ آغا صادق مرحوم نے وہ ترمیم و اصلاح شدہ دیوان بیخود کو بھجوا دیا۔ انہوں نے اس پر کچھ لکھ کر آغا مرحوم کو واپس بھجوا دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے بعض ترامیم پر زبردست تنقید کی اور مختصراً اظہار نظر کیا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

حافظ کا مصرع ہے:　　بدم گفتی و خرسندم، عفاک اللہ نکو گفتی

۱۔ اس قسم کے حوالے مجھے ان کے بیٹے غضنفر علی وڑائچ نے دیے تھے جو آج کل گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں فارسی کے

Marfat.com

اس شاعر نے اس میں یہ ترمیم کی: اگر دشنام فرمائی و گر نفرین دعا گویم

بیخود نے لکھا کہ حافظ نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست، ماضی سے وابستہ اور فیصل شدہ ہے۔ اس میں نہ شک ہے اور نہ مضارع۔ فاضل ترمیم کنندہ قواعدِ نحو سے بے نیاز اور معنیِ شعر سے مستغنی ہے۔ اس نے ''اگر'' (شرطیہ) سے شعر کو مشکوک اور مضارع بنادیا۔ خدا معلوم کس نے اسے اس ترمیم پر مجبور کیا۔ غرض بیخود نے صرف اسی مختصر سی تنقید پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایک طویل مسلسل غزل میں ایسے شخص کو بے ہنر قرار دیا جو اپنے ضمیر کی اصلاح کیے بغیر کسی دوسرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتا ہے۔ ان کے مطابق حافظ شیرازی کے اشعار کی تصحیح کرنے والا اپنی جہالت کی خود گواہی دے رہا ہے۔ اس غزل میں بیخود نے بعض دلچسپ تشبیہات و استعارات سے کام لیتے ہوئے (جن کا ان کے اپنے دہاتی ماحول سے تعلق ہے) ترمیم کنندہ کی اچھی خاصی مرمت اور آخر میں اس کے لیے رحم کی دعا کی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

من کہ دہقان زادہ ام، شاعر نیم، لاقم نہ من
روید اندر مرغزارم گو گلاب و یاسمن

بی ہنر باشد کہ او کوشد بہ اصلاحِ کسی
تا نہ خود کوشد بہ اصلاحِ ضمیر خویشتن

و آنکہ شعرِ حافظ شیراز را تصحیح کند
شاہد جہل خود است او خود باین نطق و دہن

گر بہ زعم خود درونِ خانہ روغن داشت او
خود چراغ چہرہ افروزد بسازد انجمن

وانکہ رزق و روز خونِ رفتگان رنگین کند
حیف در حیف است در طور و طریق اہل فن

نو سخن سنجان پی ترمیم مجبور آمدند
بی حفاظت ہست اکنون ہر سخنگوی کہن

ناخرمندان کہ اصلاحِ خرمندان کنند
شرم می آید، شرافت شُدز رُخ پردہ فگن

نظم موزون را چہ تقصیری کہ ناموزون کنند
نقش مانی را کند کہگل چو دستِ خشت زن

طوطیان لب بستہ از بیمِ جفای جغد و بوم
بلبلان ضبط فغان از شورش زاغ و زغن

این جوان در کشتز ارش قلبہ رانی کردہ است
جای لالہ کاشتہ تخم مغیلان در چمن

باغبان در خواب و ردی اشتران بی زمام
سر زنان سرمست سوی سنبل و سرو و سمن

مرہم زخمِ گنہ جز توبہ استغفار نیست
ہر کہ او توبہ کند باشد کہ بخشد ذوالمنن

صورتِ دیوان حافظ را ز نو کرد او صحیح
دوستان! من کیستم در صورتش گویم چہ من

معذرت خواہ آدم بیخود بصد عجز و دعا
ای خدا کن رحم بر این نوسخندانِ وطن

بیخود کا شروع سے یہ دستور ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے خطوط کا جواب فارسی غزل

Marfat.com

کی صورت میں لکھتے ہیں۔ اس غزل میں اپنے احوال کے علاوہ اپنے احساسات و جذبات کی بھی عکاسی کرتے چلے جاتے ہیں۔ حیرت اور تعجب اس بات پر ہے کہ خالص دیہاتی ہونے اور گوشہ نشینی کی حالت میں نیز ادبی مراکز سے دور رہ کر انہوں نے ایسی زبردست استعداد کیسے بہم پہنچائی کہ وہ ایک ماہر زبان دان کی طرح کلمات و ترکیبات اور تشبیہات و استعارات وغیرہ سے بخوبی استفادہ کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں نئے اور دلچسپ مضامین کی کمی نہیں۔ ان کی شاعری سادگی و سلاست کے ساتھ ساتھ پختگی کی بھی حامل ہے۔ ان کے یہاں جیسا کہ پہلے بیان ہوا، ان کے اپنے ماحول اور علاقے کی مخصوص اصطلاحات بھی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے کئی جگہ قرآنی تلمیحات سے بھی استفادہ کیا ہے۔

وہ انسان دوست ہیں اور اپنی شاعری میں اسی انسان دوستی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ وہ ایک مخلص مسلمان اور اہل بیت و ائمہ اطہارؑ کے زبردست محب ہیں۔ ان کا دل دوسروں کے لیے کڑھتا ہے۔ غرض ان کے اشعار میں عشق و عاشقی کے قصوں اور واردات کے علاوہ دوسرے موضوعات مثلاً بے ثباتیِ دنیا، جزا و سزا، ہبوط آدمؑ اور اس کے نتیجے میں انسان کی بے وقعتی، محرومی و مایوسی اور خود اس کی اپنی غم زدگی بھی۔ بڑی دل سوزی و رقت اور طنطنہ و طمطراق سے بیان ہوئے ہیں۔

راقم نے بیخود کو لکھا کہ وہ اپنی تصویر بھجوائیں تاکہ مضمون کے ساتھ شائع کی جائے۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ بعض نادر کتب اور گراں بہا دستاویزات اور میری تصاویر سب حوادث کی نذر ہو چکی ہیں۔ نئی تصویر کے لیے فرصت درکار ہے۔ میں آج کل مریض ہوں۔ یہ دو غزلیں اپنے بیٹے سے لکھوا کر بھیج رہا ہوں۔ پہلی غزل کی ردیف ''آمد و رفت'' سے انہوں نے دو مختلف صورتوں کی بڑے پیارے انداز میں عکاسی کی ہے جو کسی قدر شوخی کی بھی حامل ہے۔ یہ غزل سراسر عشقیہ اور بیخود کے دلی جذبات و کیفیات کی عکاس ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

این چہ خوابست کہ آن محسن و یار آمد و رفت　　بر خزان دیدہ چمن بادِ بہار آمد و رفت
دل کہ بی رویِ خوشش در غم او بود، کہ او　　چون نفس بردہ نہ در سینہ قرار آمد و رفت
حُسن گل گرچہ نہ آنست کہ مانَد بر پای　　وقت خوش باد کہ بر بلبل زار آمد و رفت
او شد از چشم و من بیدل و حیران بی او　　چون زخود رفتہ کہ او بر چہ شعار آمد و رفت
او اگر آمد و گر رفت چہ نالی بیخود　　قصہ در عمر ازین بیش ہزار آمد و رفت

دوسری غزل میں عشقیہ جذبات کے ساتھ ساتھ کسی قدر تصوف کا رنگ بھی ہے اور شاعر نے

Marfat.com

حضرت آدمؑ کے حوالے سے اپنی لغزشوں، کوتاہیوں اور گناہوں کا اعتراف اور مقطع میں اپنی مفلسی کا ذکر کر کے اپنی آرزوئے حج کو تکمیل ناپذیر قرار دیا ہے:

گنجِ غم در سینہ دارم رو بہ ویران کردہ ام　　ہر چہ سلطانِ ازل فرمود "کن" آن کردہ ام

اس کا دوسرا مصرع حافظ شیرازی کے اس شعر سے ماخوذ ہے:

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　آنچہ استادِ ازل گفت "بگو" می گویم

بیخود کی غزل کے باقی چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

ہمچو آدم نقدِ خلدِ کوی او دادم ز دست　　این قدر عصیان کہ من از ضعف و نسیان کردہ ام
کشتیِ امید و بیم در محیطِ آرزوست　　ہر طرف سیلی روان از چشمِ گریان کردہ ام
بر خرید التفات و مہر آن شیرین نگار　　دردِ دل را اندرین بازار ارزان کردہ ام
برقِ وہاج اندر آن میغ سیاہ دیدم چو ماہ　　زان شعاعش مشعلِ دل را فروزان کردہ ام

حج کعبہ در نصیب بی زران بیخود چو نیست
از چہ رو این ذکر و فکر غیر امکان کردہ ام

اب ان دوسری غزلوں کا انتخاب ملاحظہ ہوں۔ حمد و ثنائے ربِ جلیل میں ایک طویل غزل ہے، جس میں صرف خدا کی عظمت و بزرگی ہی کا ذکر نہیں بلکہ خود انسان کو جو مقام حاصل ہے، اس کی طرف بھی اشارہ ہے اور زمانے کی بے مہری کا شکوہ بھی؛ اور یہ کہ اس ذاتِ گرامی کی ثنا میں ہر موئے تن مصروف ہے اور پھر بھی انسان اس کی ثنا سے عاجز ہے:

حمد و ثنا کہ پرتو نور خورش کزو　　زینت گرفتہ مسندِ عرشِ پیمبری
حمد و ثنا کہ از ازل او میکند مدام　　بی امتیاز مذہب و دین بندہ پروری
حمد و ثنا کہ تو نئی واقف ز سرّ خویش　　صد بحر و بر درونِ دل بینوا بری
حمد و ثناست اکبر و اللہ اکبرست　　او خود درونِ تست گر از ذرہ کمتری
حمد و ثنا کہ نقدِ دل من بہ نذرِ تست　　خواندم ز روی پاکِ تو آیات دلبری
حمد و ثنا کہ عزتم تا آسمان رساند　　تا تو رفیق من شدی ای ماہ و مشتری
ہر موی تن بمدح او گویاست بی صدا　　عاجز ترست ازان چو زبان سخنوری
بی مہریِ زمانہ و احوال ما بگوی　　ای باد اگر بگلشنِ احباب بگذری

بیخود بشکر آن شہ عالی جناب باش
آن کو ترا بہ گنج نہان کرد رہبری

Marfat.com

''چہ گویم'' کی ردیف میں غزل کہہ کر عشق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مصائب و آلام کے سامنے اپنی بے بسی کا سادہ انداز میں اظہار کیا ہے اور کہیں ''کیا کہوں'' کہہ کر بھی کہنے والی بات کہہ دی ہے جس سے بیان میں زور پیدا ہو گیا ہے:

از تابِ رخ و چہرہ تنم سوختہ ہم جان		وز تلخی این ہجر ستمکار چہ گویم
در صبر ہمی کوشم و ترسم کہ نگردد		بی نور مرا دیدۂ خونبار چہ گویم
ہر نقشِ مکلف کہ بہ وجنات حیات است		بی مہر و وفا رنگِ سزاوار چہ گویم

درج ذیل غزل بھی اسی بحر و ردیف میں ہے۔ اس میں بھی بات کہنے کا انداز وہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ اس میں دوست کی بے توجہی، تقدیر کے آگے تدبیر کی بے بسی اور انسان کا اس کے راز سے آگاہ نہ ہونا؛ خدا تعالیٰ کی غفاری و ستاری اور نااہلوں اور کم فہموں کے سامنے غمِ عشق کے اظہار سے اجتناب ایسے مضامین آ گئے ہیں:

دردی کہ ز یار است بہ اغیار چہ گویم		حال آن کہ ز خود ہست بآن یار چہ گویم
این نکتہ بتفسیر توان گفت نہ باکس		ناکردہ گناہم کہ گنہگار چہ گویم
تدبیرِ من از نیتِ تقدیر ندانست		یا رب چہ نہانست چہ اسرار چہ گویم
ہر عیب و خطا بیند و باکس نہ بگوید		بر عفو و خطا پوشیِ ستار چہ گویم
ہر کس نہ سخن داند و قدرش نکند ہم		بیخود ز غم عشق بہ دیوار چہ گویم

مندرجہ ذیل اشعار بیخود نے اپنے پیر جناب مختار حسین کی خدمت میں لکھے ہیں۔ ان میں دلکشی کے علاوہ ایک خاص طنطنہ بھی ہے۔ چھوٹی بحر کی یہ غزل استادانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ اس میں بیخود نے اپنی پریشاں خاطری، حالات کے ہاتھوں دل فگاری، انسان کے مجبورِ محض ہونے اور پیر سے دستگیری کی درخواست کے علاوہ اپنی قسمت کی بے اتفاقی کو موضوع شعر بنایا ہے۔

پریشان خاطر و آشفتہ کارم		دگر از گردشِ دون دل فگارم
بلوحِ قسمتم ناخوش نوشتند		بچشم دوستان معجز نگارم
حروفِ بختِ ناخوش، خوش نویسم		قلم اندر کف قدرت ندارم
متہم من عبث گشتم بہ قدرت		چو او مختار و من بی اختیارم

یہی مضمون عراقی کے یہاں یوں ہے:

چو خود کردند راز خویشتن فاش
عراقی را چرا بدنام کردند

Marfat.com

اور بقول میر تقی میر:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

بچاہ افتادہ را گر دست گیری　　بیابی اجر از پروردگارم
درونم روشن از مہر جہان تاب　　نیاری ار چو ذرہ در شمارم
بخاک افتادہ ام بیخود چہ گویم　　کہ من از بندگان شہسوارم

کسی شخص نے بیخود کو دعوت پر بلایا لیکن اپنا نام و نشان اور اتا پتا نہ لکھا۔ اس پر انہوں نے ایک غزل کہہ ڈالی جس کی ایک نقل مجھے بھی ارسال کی۔ اس میں انہوں نے مذکورہ کوتاہی کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنی ضعیفی و مفلسی کی بھی بات کی ہے۔ انہوں نے اس بات کو غنیمت جانا ہے کہ ایک نامعلوم شخص نے محض محبت کے سبب انہیں یاد کیا ہے۔ انہوں نے زبان و بیان پر اپنی قدرت و چابکدستی کو ایک خاص طمطراق سے بیان کیا ہے۔ ایک جگہ ہم اساتذۂ فارسی (گورنمنٹ کالج، لاہور) سے اپنی محبت و وابستگی کی عکاسی کرتے ہوئے اپنی اس عادت کا اظہار بھی کیا ہے کہ میں اس وقت تک کسی کو کچھ نہیں کہتا جب تک وہ مجھے پریشان نہ کردے:

نامہ چاپیدہ رسید از یک کرم فرمای من　　طاقت رفتن نہ ماندہ بود چون درپای من
از قلم ننوشت نام خود نہ عنوانش نوشت　　بر چنین دعوت چو آیم، کوشود ملجای من
عہد طفلی ہا کہ نادیدہ شباب از من گذشت　　وز ضعیفی ضعف افتادست در اعضای من
من یکی بیگانہ صورت چون بجمعی آن رسم　　شد چو در عزلت فسردہ شوق بزم آرای من
ہمچو چوزِ آشیان در گوشہ افتادم ز غم　　بر زمین سر داشت آن عزم فلک پیمای من
بس غنیمت ہا کہ کس بی معرفت یادم کند　　یاد او شد در دلم یار محبت زای من
گرچہ صدہا لالہ وگل سوخت در ذرات ریگ　　گو کہ گل چینی پسندد در تف صحرای من
سد راہ من شدہ این کم زری خانہ خراب　　شد چو خواہندہ بسی در مکتب اعلای من
مہربانی ہا و احسان شد باین یاد آوری　　من نہ گر آیم غضنفر(۱) را بدان برجای من
علوی(۲)،صدیقی(۳)،ویزدانی(۴)،وحامد خان(۵)،یمین(۶)　　شد پریشان در رہ ایشان دل دانای من

بیخودم بیخود نگویم تا نہ آشفتم زکس
ہم نہ کس شنو زمن شوروغل و غوغای من

۱۔بیخود کا بیٹا　۲۔ افضل علوی　۳۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی　۴۔ راقم
۵۔ڈاکٹر حامد خان حامد صدر شعبہ ۶۔ڈاکٹر آغا یمین خان

Marfat.com

پروفیسر آغا صادق مرحوم کے نام اپنے ایک منظوم خط میں اچھوتی تشبیہات سے کام لیتے ہوئے آپ نے اپنے بڑھاپے کی عکاسی یوں کی ہے:

شاہِ خورشید کہ با حشمت و تاجِ زرکش　　از سرم رفت و بہ سر چادر شامست اینجا
چرخ صیاد و زبین کردہ کمین از ہر سو　　طائرِ سدرہ در افتادہ بدامست اینجا
رہ روانیم و غمِ زاد قیامت ہیہات　　نیست یک روزہ کہ دو روزہ قیامست اینجا
خاکِ آن دشتِ بلا اَم کہ درین دارِ فنا　　با بقا بستہ مواعیدِ دوامست اینجا
باغبان خیز کہ بر رونق این لالہ و گل　　چشم بد اشترِ ببریدہ زمامست اینجا

معلوم ہوتا ہے کہ بیخود اس جہانِ کہنہ اور انسان سے بیزار و مایوس ہو چکے ہیں۔ اسی بنا پر وہ تمام کائنات میں تغیر و تبدل کرنے کے خواہاں ہیں تاکہ اس کی نئے سرے سے تعمیر ہو سکے، اور یوں تمام اوضاعِ عالم ان کی خواہش کے مطابق اچھے اور درست ہو جائیں۔ ان کا دل مفلسوں کی حالت پر کڑھتا ہے۔ ان کے مطابق ان لوگوں کا باطن کہیں زیادہ مفلس ہے جو خود کو، بزعم خویش، بڑے "پھنّے خاں" سمجھتے ہیں۔ ذیل کی ساری غزل ان کے ایسے ہی جذبات و احساسات کی تصویر کشی کرتی ہے جن کا تعلق اس دنیا کے احوال و اوضاع سے ہے۔ یہ غزل چوبیس اشعار پر مشتمل ہے جن میں سے بعض بڑے بولتے ہوئے شعر ہیں۔ اس غزل میں بیخود، جو بظاہر ایک خالص دہاتی اور گوشہ نشین قسم کے انسان ہیں، ایک جہاں دیدہ، صاحبِ مشاہدۂ وسیع اور زباندان شاعر نظر آتے ہیں۔ ان کا قاری ان کا ایسا کلام پڑھنے کے بعد اگر انہیں دیکھے تو وہ کبھی یقین نہیں کرے گا کہ گدڑی کا لعل اسی کو کہتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

این جہانِ کہنہ را خواہم بنا از نو کنم　　آدمی از نو کنم ارض و سما از نو کنم
تختِ طاؤس و محلش را بیارایم ز نو　　عادلِ شاہ جہان را ماجرا از نو کنم
چون خداوندان نو از حال زار بیکسان　　بی خبر خفتند، خواب خوش کجا از نو کنم
مفلسانِ با مروت را گلہ برسر نہم　　این گلہ داران مفلس را چہا از نو کنم
خصمِ بدخو را بدست خویِ او بگذاشتم　　دوستانِ نیک طینت را دعا از نو کنم
عاشقانِ بوالہوس را از رموزِ عاشقی　　ہمچو یارانِ صفا عشق آشنا از نو کنم
سرکش و ہشیار و استادند اگر در دلبری　　این بتان را نیز تعلیم وفا از نو کنم
بلبلان خوش نوا را باز ازین بند و قفس　　بر تماشای گل و گلشن رہا از نو کنم
ہم دُر و خرمہرہ را دیدم بچشم امتیاز　　تا بہ میزانِ خرد سنجم، بہا از نو کنم

Marfat.com

آن کہ در خواب آمد و بر وعدۂ دیگر برفت / گر بدست افتد نہ داماں رہا از نو کنم
مبتلا بودم ہمہ عمر و دل آن شوخ را / این زمان خواہم کہ بر خود مبتلا از نو کنم
چون بہ اغلاطم کند آن یار اصلاح و لطف / بر امید لطف بسیارش خطا از نو کنم
دردِ دل را اندرین بازار ارزان تر کنم / ہم خریداران الفت را صلا از نو کنم
دوستان سازم وضو آن دم کہ از سوز درون / چون درونِ آب چشم خودشنا از نو کنم

جیسا کہ ملاحظہ ہوا، بیخود کے بعض اشعار میں سیاسی اوضاع سے متعلق بھی اشارات آگئے ہیں۔ درج ذیل غزل بھی ایسی ہی ہے۔ بعض اشعار میں تو انہوں نے اس سلسلے میں اپنے جذبات و احساسات کو واضح طور پر پیش کیا ہے، جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک خاص سیاسی پارٹی کے مخالف ہیں۔ وہ قرآن کی حکومت کے خواہاں اور ''پان اسلامزم'' کے زبردست حامی ہیں۔ کسی کا مصرع ہے:

دنیا جوان تھی میرے عہدِ شباب میں

بیخود کی اس غزل کے بعض اشعار میں بھی کچھ اسی قسم کا احساس نظر آتا ہے:

در دل ہوای سیر گلستان نماندہ است / یا دل درون سینۂ حیران نماندہ است
یا ہرچہ خواندہ ام کنون شد محو از دماغ / یا خود دماغ در سرِ نادان نماندہ است
کر گشتہ است گوشِ نصیحت نیوش و ہوش / مفقود ذوق بزمی و بستان نماندہ است
تا عرش ہا و ہوی من زین پیش می رسید / این دم زبانِ خستہ را افغان نماندہ است
بی دوستانِ دل کجا آن شوق و شغل شعر / آخر چہ شد کہ شورِ حریفان نماندہ است
آن گو بہ ''نان و پوشش و مسکن'' حریص کرد / افزود حرص و انس در انسان نماندہ است
اینک ز بوالفضولی عیاشِ باج خواہ / دستار و جامہ برتن عریان نماندہ است...
خوابست یا کسی مرا گفتا بہودہ خیز / در دہر جز حکومتِ قرآن نماندہ است
مرغِ چمن بہ ہمسرش می گفت غم مخور / صیاد دام گستر بستان نماندہ است
دامش گسست لیک ہر تارش برنگ خاک / ماندست در زمین مگر پنہان نماندہ است
صبح امید بردمد از پرتو ضیا / آن پیچ و خم بزلف شبستان نماندہ است
شاخان یک شجر ہمہ اسلامیان دہر / زین شرق و غرب فرق در ایشان نماندہ است
توفیق خیر، پیرِ دہ خواہد ز لطف حق / در کشورم تصرف شیطان نماندہ است
خوش قسمتم کہ دوستان آیند بدعوتم / گو خود خورش بہ کلبۂ دہقان نماندہ است

Marfat.com

بیخود بخاک از فلک افگندہ اند مرا　　آدم درون روضۂ رضوان نماندہ است

درج ذیل غزل میں بیخود نے ہبوطِ آدم کو انسان کے تمام غم و الم اور حرمان و حسرت کا سبب قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق انسان اس سے قبل مرگ و حیات کے چکر سے آزاد تھا لیکن اسے آب و آتش، خاک و باد (عناصر اربعہ) میں مقید کرکے ویران کردیا گیا۔ اس ساری غزل میں ایک ہی فضا چھائی ہوئی ہے، اس لحاظ سے یہ ایک مسلسل غزل ہے۔ انہوں نے اس میں ایک اچھوتا مضمون پیدا کیا ہے۔ ان کے مطابق "میرے مرنے کے بعد میری مٹی سے تسبیح کے دانے بنائے گئے اور اس سے اس محبوب نے پھر مجھے انگلیوں پر نچانا شروع کردیا":

من در نایاب بودم در تہ دریای "لا"　　نی خبر از شادی و غم بود نز جانان مرا

زان عدم حکمِ ازل آورد در اقصایِ غم　　با حریفان ہوا و حسرت و ارمان مرا

اندر آن مسکن نہد این ماتم مرگ و حیات　　کرد اندر باد و نار و آب و گل ویران مرا

ہر کرا از مسندش ریزند حالش چون بود　　بر زمین افگندہ اند از روضۂ رضوان مرا

طائر باغ جنان را شد جہان دام و قفس　　یوسفم اما ہمین چاہ است و این زندان مرا

ہر کجا رفتم دل پُردردم و مغموم کرد　　ناخوش از خلق و خلوص و خدمت خوبان مرا

چون درین عالم نیامد دامن تسکین بدست　　ہر زر و گنج و گہرشد بازی طفلان مرا

از پس مردن زخاکم دانہ ہای سبحہ کرد　　باز کرد آن شوخ بر انگشتہا رقصان مرا

این قدر سیل روان آمد کہ آن باخود ببرد　　برلب کوثر رساند این دیدۂ گریان مرا

گرچہ او خاکم بہ آب عشق خود بیخود سرشت
چہرہ نمودہ دگر جز چہرہ انسان مرا

چوہدری خوشی محمد بیخود بوتالوی کی چند غزلوں سے یہ انتخاب پیش کیا گیا ہے اور ان کا یہ کلام بیشتر ان کی آخری عمر کا ہے، کیونکہ بقول ان کے، ان کا زیادہ تر کلام (جس کا تعلق بظاہر ان کے دورِ شباب سے ہوگا) بدقسمتی سے سیلاب اور دوسرے حوادث کی نذر ہوچکا ہے۔ بہرحال ان کا یہ تھوڑا بہت کلام بھی، جو اب باقی رہ گیا ہے، اگر ان کی گوشہ نشینی کی اور دہاتی زندگی کو پیش نظر رکھیں تو، خاصا پُرارزش و وقیع ہے۔ اس میں پختگی ہے، تاثیر ہے اور جان ہے۔ ایک بوڑھے دہاتی سے، جس نے ادبی مراکز سے دور آنکھ کھولی اور پرورش پائی، جس نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی اور محض ذاتی اور خداداد ذوق و شوق و اہلیت اور مطالعہ کے بل پر شعرگوئی میں طبع آزمائی کی، اس قسم کی شاعری بڑے اچنبھے کی بات ہے۔ آج اگر فارسی زبان

Marfat.com

و ادب کو اپنا پہلا سا مقام حاصل ہوتا تو بیخود کی پذیرائی یقیناً عمدہ پیمانے پر ہوتی۔ ہمارے یہاں کیسے کیسے گوہرہائے نایاب محض قلندرمشی اور گوشہ نشینی کے سبب اپنی صحیح قیمت پانے سے رہ جاتے ہیں، اور کیسے کیسے بونے اپنی پبلک ریلیشنگ اور اخباری کالموں کی بیساکھیوں کے سہارے بڑے قدآور بن جاتے ہیں۔

تفو برتو ای چرخِ گردان تفو!

بیخود جیسے درویش صفت شاعر کی اولاد سے یہ گزارش بیجا نہ ہوگی کہ وہ پہلی فرصت میں ان کا کلام جمع کرے تاکہ وہ غارت ہونے سے بھی بچ جائے اور فارسی شعر و ادب کے عشاق اس سے کماحقہ، استفادہ و استفاضہ کرسکیں۔

☆☆☆

Marfat.com

زیاراتِ ایران

افتخار احمد حافظ قادری ☆

ترکی، حجاز مقدس، شام، اردن اور عراق میں موجود مقامات مقدسہ پر حاضری کے بعد اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے ایک بار پھر بزرگانِ دین اور مشائخ عظام کی خدمت میں حاضری کا سبب مہیا کردیا۔اس بار ایران اور افغانستان میں موجود بزرگان دین کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔یہ سفر مقدس راولپنڈی سے شروع ہوکر راولپنڈی میں ہی اختتام پذیر ہوا اور اس بار یہ تمام سفر بائی روڈ طے ہوا۔ تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔

بروز سوموار صبح سوا پانچ بجے گھر سے روانہ ہوئے اور بذریعہ کوئٹہ ایکسپریس کوئٹہ کے لیے روانگی ہوئی۔ دوسرے دن رات دس بجے کوئٹہ پہنچ گئے۔ رات کوئٹہ میں ہی گزاری دوسرے دن صبح نماز فجر کی ادائیگی کے بعد ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد بازار گئے تاکہ کرنسی وغیرہ تبدیل کرلیں دوپہر کا کھانا کھایا اور بسوں کے اڈہ پر پہنچ گئے۔ شام چار بجے والی بس کے ٹکٹ لیے۔ بس مختلف مقامات سے گذرتی اور سفر طے کرتی ہوئی دوسرے دن صبح ساڑھے چھ بجے خیریت سے تفتان پہنچ گئی۔ نو بجے کے قریب بارڈر کھلا اور ضروری کاغذی کاروائیوں کے بعد ہم پاکستان کی حدود سے نکل کر ایران کی حدود میں داخل ہوگئے۔

ایران

ایران کا شمار دنیا کے قدیم ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ کون ہے جو شیخ سعدی اور حافظ شیرازی سے واقف نہیں ایران میں بیشمار دینی و مذہبی مقامات ہیں۔ ایرانی بارڈر پوسٹ کا نام ''میرجاوہ'' ہے جو ایک خوبصورت عمارت میں واقع ہے۔ اس عمارت میں امیگریشن اور کسٹم کے دفاتر ہیں۔ یہاں کی ضروری کاروائی سے فارغ ہونے کے بعد ایک گاڑی میں سوار ہوکر زاہدان بس ٹرمینل پہنچ گئے۔ کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد دو بجے بس میں سوار ہوکر کرمان کی طرف چل پڑے۔

☆ ۶-اے، سٹریٹ ۹، افشاں کالونی، راولپنڈی

Marfat.com

کرمان

کرمان شہر کو تاریخی طور پر ثقافتی مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے اور اب بھی یہاں کی کئی یونیورسٹیاں طلبا اور طالبات کو علم کی روشنی سے منور کر رہی ہیں۔ رات ساڑھے دس بجے ہم کرمان شہر پہنچے۔ایک مسافر خانے میں رات قیام کیا اور صبح نماز کی ادائیگی کے بعد کرمان شہر سے باہر ۳۵ کلومیٹر فاصلے پر ایک مقام ''ماھان'' میں حضرت شاہ نعمت اللہ ولی کے مزار مبارک کی زیارت کے لیے روانہ ہوگئے۔

حضرت شاہ نعمت اللہ ولی

حضرت شاہ نعمت اللہ ولی ملک شام کے شہر حلب میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کا سلسلہ نسب انیس واسطوں سے جناب نبی کریم حضرت محمدؐ سے جاملتا ہے جس کے متعلق آپؒ خود فرماتے ہیں:

نوزدھم جد من رسول خدا است　　آشکار است نیست پنہان

آپؒ ایک روشن ضمیر ولی اللہ اور زبردست مکاشفہ کے مالک تھے۔ آپؒ نے اپنے کلام میں آئندہ آنے والے حالات و واقعات کے متعلق پیش گویاں فرمائی ہیں جو درست ثابت ہوتی جارہی ہیں۔ آپؒ کا مزار مبارک ایک وسیع کمرے میں اونچے چبوترے پر واقع ہے۔ دیواروں پر جگہ جگہ فارسی اشعار اور آیات قرآنی انتہائی خوبصورت انداز میں لکھی ہوئی ہیں، ساتھ ہی آپ کی ایک چلہ گاہ بھی ہے۔ آپ کی خدمت میں حاضری کے بعد کرمان کے بقیہ مقامات دیکھے جن میں کرمان کی قدیم ترین جامع مسجد، گنبد مشتاقیہ، گنبد سبز، عجائب گھر اور بازار کرمان شامل ہیں۔ ایک ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد بس میں سوار ہوکر شہر شیراز روانہ ہوئے۔

شیراز

شیراز صوبہ فارس کا صدر مقام، اور مذہبی اور تاریخی حیثیت کا حامل شہر ہے۔ شیراز میں سب سے پہلے، حضرت شاہ چراغؒ کی خدمت میں حاضری دی۔

حضرت سید امیر احمد بن امام موسی کاظمؑ

آپؒ حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے صاحبزادے اور حضرت شاہ چراغؒ کے نام سے مشہور ہیں آپؒ حضرت امام علی رضاؑ کے بھائی ہیں۔ آپؒ کا مزار مبارک اس شہر کی رونق ہے۔ اسی طرح شاہان سلف نے بے شمار پیسہ خرچ کر کے ان کے حرم کو نادرِ روزگار بنادیا ہے۔ اندرونی حصے کی کیفیت کا بیان تو الفاظ میں ناممکن ہے کہ ہر طرف نور ہی نور کی بارش ہے۔ ہم

Marfat.com

بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام پیش کیا۔ واقعی یہ ایک نورانی اور روحانی مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان کو قلبی اور روحانی سکون حاصل ہوتا ہے۔الوداعی سلام کے بعد ایک ٹیکسی میں سوار ہوکر حضرت شیخ سعدی کے مزار مبارک کی طرف روانہ ہوئے۔

حضرت شیخ سعدی شیرازی

آپ کا شمار دنیائے اسلام کے نامور اسلاف میں ہوتا ہے۔آپ ایک بہت بڑے عاشق رسولؐ، معلم اخلاق اور عظیم شاعر گذرے ہیں۔ نبی اکرمؐ سے شیخ سعدیؒ کی محبت اور عقیدت انتہا درجہ کی تھی۔ مشہور زمانہ رباعی (بلغ العلیٰ بکمالہ) جو عاشقانِ رسولؐ کے دلوں کی دھڑکن ہے۔ آپ ہی کی ہے اور جب اسکا آخری مصرعہ مکمل نہیں ہورہا تھا تو آپؒ ہر وقت پریشان اور غمگین رہتے۔ ایک دن قسمت جاگ اٹھی اور خواب میں نبی اکرمؐ نے شیخ سعدی کو اپنے دیدار سے نوازا اور پوچھا کہ سعدی کیا بات ہے جس پر شیخ سعدی نے عرض کیا یا رسول اللہؐ آپ کی شان میں ایک رباعی ترتیب دے رہا ہوں لیکن اس کا آخری مصرعہ مکمل نہیں ہورہا۔ جس پر نبی اکرمؐ نے شیخ سعدی سے فرمایا کہ لکھ دو ''صلوا علیہ و آلہٖ'' اور رباعی مکمل ہوگئی اور پھر یہ رباعی اتنی مشہور ہوئی کہ آج کئی صدیاں گذرنے کے باوجود بھی رباعی زندہ ہے اور اس رباعی کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ سعدیؒ کا نام بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ٹیکسی کچھ ہی دیر میں مزار حضرت سعدیؒ کے عین سامنے آکر رکی۔ ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوئے۔آپ کے مزار مبارک کی زیارت ہم سب احباب کے لیے ایک اہم فریضہ سے کم نہ تھی۔آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، سلام پیش کیا اور جانب قدم بیٹھ گئے اور پھر سب احباب نے مل کر جب اس مذکورہ رباعی کو باآواز بلند پڑھا تو ایک عجیب روحانی ماحول اور کیفیت پیدا ہوگئی۔ایک حمد باری تعالیٰ پڑھی۔پھر آپ ہی کی ایک نعت مبارک پیش کی جسکا پہلا شعر کچھ اس طرح ہے۔

عرش است کمین پایہ ز ایوان محمدؐ
جبریل امین خادم دربان محمدؐ

ایرانی زائرین آجارہے تھے اور ہم اپنی دھن میں آپؒ کا ہی کلام آپ کے سامنے بیٹھ کر باآواز بلند پڑھ رہے تھے۔ ختم شریف اور دعا کے بعد آپ کے مزار مبارک پر چادر کا نذرانہ پیش کیا۔ حضرت سعدی کا مزار مبارک انتہائی سادہ مگر بڑا رعب اور پروقار ہے۔ دیواروں پر آپ کے اشعار اور رباعیات لکھی ہوئی ہیں۔ مزار کے باہر ایک خوبصورت باغ ہے جس میں ہر موسم کے حسین پھول مزار مبارک کی شان میں اضافہ کرتے ہیں۔ الوداعی سلام کے بعد حضرت

Marfat.com

شیخ سعدیؒ کی لائبریری کی طرف روانہ ہوئے تاکہ اپنی تصنیف کا (جو عراق، اردن، شام اور ترکی کی زیارات پر مشتمل ہے اور رنگین تصاویر سے مزین ہے) ایک نسخہ حضرت سعدی کی لائبریری میں رکھوایا جائے اور حضرت سعدیؒ سے ایک نسبت قائم رہے۔ یہاں سے فراغت کے بعد ایک ٹیکسی میں سوار ہوکر بلبل شیراز کے مزار مبارک کی طرف روانہ ہوئے۔

بلبل شیراز حضرت خواجہ محمد شمس الدین حافظ شیرازیؒ

آپؒ ایک بلند پایہ بزرگ اور عظیم صوفی شاعر ہو گزرے ہیں۔ **دیوان حافظ** سے لوگ فال نکالتے ہیں اسی وجہ سے آپ کے دیوان کو ''لسان الغیب''، اور ''ترجمان الاسرار'' کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپؒ کا مزار مبارک زمین سے اونچے چبوترے پر ہے۔ قبر قدرے لمبی ہے ستونوں کے اوپر چھتری نما گنبد ہے۔ احاطہ مزار میں جگہ جگہ سایہ دار درخت اور پھولوں کی کیاریاں ہر طرف ماحول کو معطر کیے ہوئے ہیں۔ یہاں پر بھی ہر وقت آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے سلام پیش کیا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ بندۂ ناچیز نے باآواز بلند آپ کی ایک غزل کے چند اشعار ترنم کے ساتھ پڑھے۔ اس کے بعد فاتحہ شریف اور دعا کی گئی۔ آپ کے مزار مبارک پر بیٹھے ایک عجیب کیفیت پیدا ہو رہی تھی اور جی یہی چاہتا تھا کہ سارا وقت آپ کے مزار مبارک پر ہی بیٹھے گذر جائے مگر مجبوری تھی اور وقت کی کمی کے پیش نظر الوداعی سلام کرتے ہوئے احاطہ مزار سے باہر آگئے۔ دو دن شیراز میں ٹھہرے اور مذکورہ مقامات کے علاوہ درج ذیل مقامات پر حاضری کا شرف حاصل ہوا:

- حضرت خواجوی کرمانیؒ۔ ایک عظیم صوفی شاعر
- حضرت شیخ روز بہان بقلیؒ۔ علم و تقوی و پرہیزگاری میں اعلیٰ مقام
- شیخ الاسلام حضرت عبداللہ خفیف۔ حضرت شیخ سعدی آپ کے مزار پر مجاور رہے۔

دروازہ قرآن اور تخت جمشید کے بقیہ آثار دیکھنے کے بعد بس میں سوار ہوکر اصفہان جسے نصف جہان کہتے ہیں کی طرف روانہ ہوئے۔

اصفہان

اصفہان شہر کا شمار بھی ایران کے قدیم شہروں میں ہوتا ہے۔ یہاں پر جن مقامات پر حاضر ہوئے وہ کچھ اسطرح ہیں۔

میدان امام (نقش جہان)

اس میدان کا سابقہ نام میدانِ شاہ تھا لیکن اب میدان امام کے نام سے مشہور

Marfat.com

ہے۔انتہائی خوبصورت اور سرسبز و شاداب میدان ہے۔ ایک طرف مسجد امام، ایک طرف مسجد لطف اللہ اور ایک طرف عالی قاپو کی عمارت ہے۔ درمیان میں ایک خوبصورت تالاب اور فوارہ ہے۔ دائیں بائیں درخت اور پھول عجیب دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ چاروں اطراف میں مختلف تجارتی دکانیں ہیں جن میں اصفہان کی دستکاری مصنوعات دستیاب ہیں۔ مذکورہ عمارات، باغِ ہشت بہشت اور پل سی و سہ کو دیکھنے کے بعد ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور بس میں سوار ہوکر قم کی جانب روانہ ہوئے۔

قم المقدسہ

شہر قم کا شمار ایران کے اہم ترین مذہبی مراکز میں ہوتا ہے۔ مشہد مقدس کے بعد یہاں پر ایران کی دوسری بڑی زیارت گاہ ہے جس کی فضاؤں میں پاکیزگی اور روحانیت پائی جاتی ہے۔قم شہر کی ثقافتی اور علمی سرگرمیوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ معروف مدرسہ حوزۂ علمیہ قم بھی یہیں واقع ہے جہاں سے ہر سال ہزاروں طلبا فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔

حضرت معصومہ قم (س)

سیدہ بی بی فاطمہ (س) جو کہ حضرت امام علی رضاؑ کی ہمشیرہ ہیں معصومۂ قم کے نام سے مشہور ہیں۔آپؑ کے مزار مبارک کا سنہری گنبد اور مینار دور ہی سے نظر آجاتے ہیں۔ مزار مبارک کی عمارت انتہائی خوبصورت ہے۔دیواروں پر بہترین فیروزی رنگ میں کشیدہ کاری کا حسن اور اندر کا روحانی سماں بیان سے باہر ہیں۔ سلام پیش کیا، ختم شریف پڑھا اور دعا کے بعد مزار مبارک کے مختلف حصے دیکھے۔ مزار سے متصل ایک تاریخی مسجد ''مسجد اعظم'' بھی ہے جہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور بے شمار طالبان علم اس میں شریک ہوتے ہیں۔

قم میں بھی بے شمار مساجد ہیں جن میں سرفہرست مسجد جمکران، مسجد امام حسن العسکری، جامع مسجد قم۔ اور مسجد فاطمیہ خاص طور پر قابل دید ہیں۔ اسی طرح حضرت معصومہ قم کے علاوہ بے شمار امام زادگان قم میں مدفون ہیں۔ مزار مبارک کے ساتھ ہی ایک عجائب گھر بھی ہے جس میں بے شمار نوادرات بڑی ترتیب سے رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں سے فراغت کے بعد ٹیکسی میں سوار ہوکر شہر رے کے لیے روانہ ہوگئے۔

حضرت شاہ عبدالعظیمؒ

رَے تہران سے ۱۰، ۱۲ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور حضرت شاہ عبدالعظیمؒ کے نام سے مشہور ہے۔ آپؒ حضرت حسن مجتبیٰؑ کی اولاد سے ہیں اور آپ کا شمار اکابر محدثین میں

Marfat.com

ہوتا ہے۔ آپ کا مزار مبارک بھی نہایت خوبصورت انداز میں بنا ہوا ہے اور ہر وقت یہاں زائرین کا رش رہتا ہے۔اس مقام پر تین زیارات ہیں جو کہ ایک وسیع وعریض رقبہ پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سب سے اہم زیارت حضرت شاہ عبدالعظیم کی ہے۔ دوسری زیارت حضرت حمزہ بن امام موسیٰ کاظمؒ اور تیسری زیارت حضرت سید طاہر ابن امام زین العابدینؒ کی ہے۔ ان سب مقامات پر حاضری دی، سلام پیش کیا، فاتحہ پڑھی اور کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد کوہ بی بی شہر بانو کی جانب روانہ ہوگئے۔

مزار مبارک حضرت بی بی شہر بانو

حضرت سیدہ بی بی شہر بانو خسرو ایران یزدگرد کی شہزادی، حضرت امام حسینؓ کی رفیقہ حیات اور حضرت امام زین العابدینؒ کی والدہ محترمہ ہیں۔ آپ نے میدان کربلا میں شہزادگی کی راحتوں کو بھلا کر شہید کربلا کا پورا پورا ساتھ دیا۔یہی عظیم شہزادی رے کی اس پہاڑی پر آرام فرما ہیں جو کوہ بی بی شہر بانوؒ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کے حضور سلام کے لیے حاضر ہوئے، فاتحہ پڑھی اور کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد ایک ٹیکسی میں سوار ہوکر تہران کے لیے روانہ ہوگئے۔

تہران

رَے قدیم ایران کا دارالحکومت تھاجوبعدمیں تباہ وبرباد ہوکر کھنڈرات میں تبدیل ہوگیا۔ قاچاریوں کے دورِ حکومت میں تہران کو دارالحکومت کادرجہ دے دیا گیا۔ تہران میں بھی بیشمار مذہبی اور تاریخی نوعیت کے مقامات قابلِ دید ہیں جن میں سے مسجد شہید مطہری، مسجد جامع، مزار امام زادہ صالح، نیاوران محل، شاہ کے دیگر محلات،اور جیولری میوزیم سرفہرست ہیں۔کوہ بی بی شہر بانوؒ سے تہران پہنچتے پہنچتے رات ہوچکی تھی۔ رات ایک ہوٹل میں قیام کیا اور نمازِ فجر کی ادائیگی کے بعد سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی غوث اعظم کے شہر گیلان کی جانب روانہ ہوگئے۔

صومعہ سرا۔ صوبہ گیلان

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ولادت باسعادت ایران کے شہر گیلان میں ہوئی۔ آپؒ کے نانا حضرت شیخ عبداللہ صومعی کا شمار گیلان کے مشائخ میں ہوتا تھا۔آپ کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی سیدہ فاطمہ ام الخیر تھا۔حضرت غوث اعظم تو والدہ ماجدہ کی اجازت سے بغداد شریف روانہ ہوگئے لیکن آپکی والدہ محترمہ گیلان ہی میں رہیں اورگیلان کے ایک علاقہ ''صومعہ

Marfat.com

سرا" میں آپؒ کا مزار مبارک اب بھی باطنی فیوض و برکات سے لوگوں کو مستفیض کر رہا ہے۔ تہران سے صومعہ سرا تقریباً ۴۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپؒ کا مزار مبارک جعفری اسٹریٹ میں بچوں کے پارک کے ساتھ واقع ہے۔ آپؒ کا مزار مبارک انتہائی سادہ اور ایک کمرہ میں واقع ہے۔ قبر مبارک پر ایک جنگلہ لگا ہوا ہے، اور جنگلے کے چاروں طرف سبز رنگ کی چادر لگی ہوئی ہے۔ سب احباب نے آپ کی خدمت میں سلام پیش کیا پھر قبر انور پر چادر کا نذرانہ پیش کیا اور آپؒ کے رخ انور کی طرف بیٹھ کر ایک محفل ذکر منعقد کی۔ قصیدۂ غوثیہ باآواز بلند پڑھا۔ حضرت مولانا جامیؒ کی نعت (نسیما جانب بطحا گذر کن) پیش کی۔ ختم شریف اور دعا کے بعد مزار مبارک پر موجود خواتین و حضرت میں شیرینی تقسیم کی۔ یہ بھی ایک انتہائی پُرکیف اور پُرکشش مقام ہے کہ اٹھنے کو دل نہیں چاہتا، کچھ دیر مزید ٹھہرنے کے بعد سیدہ فاطمہ ام الخیرؒ کی خدمت میں الوداعی سلام پیش کیا اور گاڑی میں سوار ہوکر تہران روانہ ہوگئے اور وہاں سے بس میں سوار ہوکر بسطام شریف کی طرف چل دیے تاکہ حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کیا جاسکے۔

سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامیؒ

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کی ذاتِ بابرکات ہم میں ایسی ہے جیسے کہ حضرت جبرئیلؑ فرشتوں میں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ ایک دن حضرت امام جعفر صادقؓ کی خدمت میں بیٹھے تھے امام نے فرمایا بایزید وہ کتاب طاق سے اٹھا کر دو۔ آپؒ نے فرمایا کہ کون سے طاق سے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ عرصہ سے تم یہاں رہتے ہو اور ابھی تک تم کو طاق کا پتہ نہیں؟ حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا کہ مجھے اس سے کیا کام کہ آپکی موجودگی میں سر اٹھاؤں۔ اس پر حضرت امام جعفر صادقؓ نے فرمایا کہ اگر ایسا معاملہ ہے تو واپس بسطام کو جاؤ کیونکہ اب تمہارا کام ختم ہوگیا ہے۔

بُسطام شریف ایک چھوٹی سی بستی ہے جسے حضرت بایزید بسطامیؒ کے قدوم مبارک نے رشک عرش بریں بنادیا ہے۔ ایک وسیع حرم میں حضرت امام جعفر صادقؓ کے صاحبزادے امام زادہ محمدؒ کا مزار مبارک ہے۔ اسی حرم سے باہر کھلی فضا میں حضرت بایزید بسطامیؒ کا مزار مبارک ہے جو ایک چھوٹے سے حُجرے میں ہے آگے بڑھ کر حضرت سلطان العارفین کی خدمت میں سلام پیش کیا، قبر مبارک پر چادر کا نذرانہ پیش کیا، پھر ایک مختصر سی محفل ذکر منعقد کی اور دعا کے بعد حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کی چلہ گاہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ الوداعی سلام کے بعد باہر نکلے تو شدید برفباری ہورہی تھی اور ایک عجیب سماں تھا۔ ایک گاڑی میں

Marfat.com

سوار ہوکر خرقان شریف کی طرف چل پڑے۔

سلطان المشائخ حضرت ابوالحسن خرقانیؒ

سلطان المشائخ قطب وقت حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کا اسم گرامی علی اور کنیت ابوالحسن تھی۔ اپنے زمانے کے غوث گذرے ہیں۔ تصوف و طریقت میں حضرت بایزید بسطامیؒ سے نسبت تھی۔ آپؒ ہر وقت مشاہدہ الٰہی میں محو رہتے اور درگاہ باری تعالیٰ کے نہایت ناز پروردہ تھے۔ آپؒ کا مزار مبارک کافی اونچائی پر واقع ہے۔ مسجد سے داخل ہوکر مزار مبارک پر پہنچے تو ایک عجیب فرحت اور تسکین کا احساس ہوا۔ مزار مبارک کو بوسہ دیا اور نذرانۂ چادر پیش کیا اور بیٹھ کر محفل ذکر منعقد کی۔ ختم شریف کے بعد دعا اور پھر شیرینی تقسیم کی گئی۔ کچھ دیر آپؒ کے حضور بیٹھے رہے، پھر آپکی مسجد میں دو رکعت نفل ادا کیے۔ اس کے بعد آپ کی لائبریری کی زیارت کو نکلے جو کہ مزار مبارک کے قریب ہی واقع ہے۔

لائبریری کے انچارج نہایت خلوص اور محبت سے پیش آئے۔ بندہ نے اپنے سفرنامہ کا جو عراق، اردن شام اور ترکی کی زیارات مقدسہ پر مشتمل ہے ایک نسخہ پیش کیا تاکہ کسی طرح حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کی درگاہ مبارک سے رابطہ قائم رہے۔ باہر آکر تصاویر بنائیں۔ پھر حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کی خدمت میں الوداعی سلام پیش کرنے کے بعد واپسی کی تیاری شروع کردی۔ گاڑی میں سوار ہوکر شاہرود پہنچے۔ ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور سامان اٹھا کر نیشاپور جانے والی بس میں سوار ہوگئے۔

شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ حضرت شیخ فریدالدین عطار کو یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

هفت شہر عشق را عطار گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

(حضرت فریدالدین عطار تو عشق کی سات منازل طے کرگئے، جبکہ ہم ابھی صرف گلی کے ایک موڑ تک ہی پہنچے ہیں۔) ایک اور مقام پر حضرت مولانا روم فرماتے ہیں کہ حضرت حسین بن حلاج کی روح پرفتوح نے ڈیڑھ سو سال بعد از وفات حضرت فریدالدین عطار پر تجلی فرما کر ان کی تربیت فرمائی۔ مشہور صوفی شاعر حضرت سچل سرمست کو بھی حضرت فریدالدین عطار سے انتہائی عقیدت و محبت تھی۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ میں فریدالدین عطار کے وجود میں خداوندتعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں۔ آپؒ کا مزار مبارک ایک وسیع باغ میں ہے۔ احاطہ مزار کے باہر آپؒ کا

Marfat.com

ایک خیالی مجسمہ بھی نصب ہے۔ مزار مبارک پر حاضر ہوئے اور سلام پیش کیا۔ تلاوت کے بعد دعا کی۔ آپؒ کے مزار مبارک سے چند گز کے فاصلے پر اسی باغ میں مشہور مصور اور مجسمہ ساز استاد کمال الملک کا مقبرہ بھی واقع ہے۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد باہر آگئے اور پیدل چلتے ہوئے امام زادہ محمد محروقؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہوئے۔

امام زادہ حضرت محمد محروقؒ

آپ کا مزار مبارک ایک انتہائی خوبصورت عمارت میں ہے۔ عہد مامون میں آپ کو شہید کیا گیا اور پھر آپؒ کے جسم مبارک کو جلا دیا گیا۔ اسی وجہ سے آپکو محمد محروقؒ کہتے ہیں۔ آپکے حضور سلام پیش کیا اور فاتحہ کے بعد حکیم عمر خیام کے مقبرہ کی طرف چل پڑے۔

حکیم عمر خیام

حکیم عمر خیام کا مقبرہ بھی ایک خوبصورت باغ میں ہے۔ آپؒ کے کچھ مدت حضرت امام موفقؒ کی درسگاہ میں فقہ، حدیث اور اصول کی تعلیم حاصل کی۔ آپ اپنے زمانے کے نہایت نامور حکیم، مہندس، نجومی، اور فلسفی شاعر گذرے ہیں، جس پر خاک ایران کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ حکیم عمر خیام نے اپنی زندگی میں کہا تھا کہ میری قبر ایسے مقام پر بنے گی جہاں ہر سال دو دفعہ پھول برسیں گے۔ چنانچہ آپؒ کی یہ پیشین گوئی لفظ بہ لفظ درست ثابت ہوئی۔ چنانچہ جس وقت ہم آپکی قبر پر حاضر ہوئے تو دیکھا کہ واقعی قبر کو ہر طرف سے درختوں اور پودوں نے ڈھانپا ہوا ہے۔ مذکورہ مقامات کی زیارات کے بعد واپس ہوٹل پہنچے، سامان اٹھایا اور بس میں سوار ہوکر مشہد مقدس روانہ ہوگئے۔

حضرت امام علی رضاؑ کا مزارِ مبارک

مشہد مقدس صوبہ خراسان کا صدر مقام اور ایران کے مشہور ترین زیارتی شہروں میں سے ایک ہے۔ اس کا اصل نام "سناباذ" ہے جو حضرت امام علی رضاؑ کی شہادت اور دفن کے بعد مشہد مقدس کے نام مشہور ہوا۔ روزانہ ہزاروں افراد دنیا کے چپے چپے سے حضرت امام رضاؑ کی زیارت کے لیے یہاں آکر سکونِ قلب حاصل کرتے ہیں۔ حضرت امام رضاؑ کے مزار مبارک پر سونے کا گنبد دور سے ہی نظر آنا شروع ہوجاتا ہے۔ گنبد کے دونوں طرف نہایت خوبصورت بلند مینار ہیں۔ آپؑ کا روضہ مبارک دنیا کے کے خوبصورت ترین روضوں میں شمار ہوتا ہے۔ ہم بھی حرم حضرت امام رضاؑ کے اندر داخل ہوئے تو زائرین کا بے پناہ رش تھا، ہر شخص اپنے عقائد کے مطابق امام کے حضور ہدیۂ سلام پیش کررہا تھا۔ ہم نے بھی سلام کے بعد

Marfat.com

ختم شریف پڑھا اور فاتحہ کے بعد اس خوبصورت عمارت کے بقیہ حصے دیکھنے چل پڑے۔ حرم امام رضاؑ کے ساتھ مسجد گوہر شاد بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ حرم امام رضاؑ، آستان قدس رضوی، مسجد گوہر شاد، صحن، لائبریری اور دوسری عمارات کو دیکھنے کے لیے کافی دن درکار ہیں اور چند سطور میں ان انتہائی خوبصورت عمارات کا بیان کرنا بھی انتہائی مشکل کام ہے۔ بہرحال یہ تمام عمارات دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور پھر اندر کی روحانی کیفیات کا منظر قابل دید ہوتا ہے۔ رات ایک ہوٹل میں قیام کیا اور صبح شہر طوس روانہ ہوئے۔

حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی

حکیم ابوالقاسم فردوسی اپنی مشہور زمانہ تصنیف **شاھنامہ** کی وجہ سے دنیا میں متعارف ہوئے۔ آپ کا مقبرہ مشہد مقدس سے ۲۵ کلومیٹر باہر ایک خوبصورت باغ میں واقع ہے۔ قبر ایک تہہ خانے میں ہے مقبرہ کے ساتھ ایک عجائب گھر بھی ہے، جس میں اور اشیا کے علاوہ شاہنامہ فردوسی کا قلمی نسخہ بھی زیارت کے لیے رکھا ہوا ہے۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد باہر آگئے اور کچھ ہی فاصلہ پر ایک عمارتِ ہارونیہ ہے اسکو دیکھنے کے بعد مشہد مقدس کی طرف چل پڑے۔ دوسرے دن نماز فجر کی ادائیگی کے بعد بس میں سوار ہوکر تائباد بارڈر کے لیے روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

Marfat.com

ایرانی ادب و ثقافت کے اثرات

پاکستانی ادب و ثقافت پر

پروفیسر اکبر حمیدی☆

ایک زمانہ تھا جب فارسی زبان و ادب ہمارے اسکولوں میں بھی رائج تھے اور آرٹس کے سٹوڈنٹس کے لیے میٹریکولیشن تک فارسی پڑھنا لازمی تھا۔ گویا اسکول میں فارسی ہمارے نصابوں کا لازمی حصہ تھی۔ مجھے یاد ہے ۱۹۵۱ء میں آٹھویں جماعت سے میں نے باقاعدہ فارسی کا مضمون پڑھنا شروع کیا۔ ویسے فارسی ہمارے ہاں اس زمانے میں چھٹی جماعت سے پڑھائی جانے لگی تھی۔ دسویں جماعت میں فارسی نصاب کی کتاب خاصی ضخیم تھی جس کی نثر میں شیخ سعدی کی حکایات *گلستانِ سعدی* سے منتخب کر کے شامل کی گئی تھیں۔ مجھے ذاتی طور پر اردو کے بعد فارسی سے زیادہ تعلق خاطر تھا اور میں ہمیشہ اس مضمون میں پہلی یا دوسری پوزیشن لیا کرتا۔

پھر ۱۹۵۳ء میں کالج گیا تو اردو اور فارسی کے مضامین لیے۔ کالج میں فارسی لازمی مضمون تو نہیں تھا مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ فرسٹ ایر میں بھی اور سیکنڈ ایر میں بھی فارسی کے طلبا کی کلاس باقی تمام اختیاری مضامین کی کلاسوں سے بڑھ کر تھی۔ بڑا کمرہ تھا اور فارسی کے پیریڈ میں بھر جاتا تھا بلکہ چند طلبا کو تو دروازے کے قریب کھڑے ہونا پڑتا تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فارسی زبان و ادب نے کس طرح ہمارے دل و دماغ میں گھر کر رکھا تھا۔ یہ ایک فطری بات تھی اور ایران و پاکستان کے مشترکہ ادبی و ثقافتی ورثے کی علامت بھی۔ مجھے یاد ہے کالج میں شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کی غزلیات بھی شامل نصاب تھیں۔ عمر خیام اور بابا طاہر عریاں کی رباعیات بھی شامل نصاب تھیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے فارسی ادب و ثقافت کے ذریعے دنیا میں دھومیں مچا دیں اور دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں

☆ مکان نمبر ۲۰۲۹، اسٹریٹ ۳۲، آئی ٹن ٹو، اسلام آباد

Marfat.com

ترجمہ ہوئے۔ گویا ایران نے ادب و ثقافت کے محاذوں پر دنیا بھر کو فتح کر رکھا تھا۔

ذاتی طور پر میں فارسی ادب اور فارسی ادب کے ذریعے فارسی ثقافت سے بہت متاثر تھا اور اب بھی ہوں۔ ابھی گذشتہ برسوں میں میں نے اپنے ایک اخباری انٹرویو میں کہا تھا کہ دنیا کی بہترین شاعری فارسی زبان میں ہوئی ہے۔ اسکی اور بھی کئی وجوہات ہیں مگر سب سے بڑی وجہ دونوں ملکوں کے مزاجوں کی ہم آہنگی ہے، مشترکہ ثقافت ہے۔ صدیوں پرانے تاریخی، ثقافتی اور ادبی رشتے ہیں جو ہمیشہ سے مثالی رہے ہیں۔ درمیان میں سیاسی طور پر ان رشتوں میں کمی بیشی ہوتی رہی بلکہ ان رشتوں کی بنیادیں اتنی مضبوط ہیں کہ آج بھی رشتوں کی یہ عمارت پہلے جیسی آن بان سے کھڑی ہے اور وقت کی ہر آزمائش پر پوری اترتی چلی آرہی ہے۔

ذاتی طور پر میں فارسی زبان و ادب سے اس قدر متاثر ہوں کہ آج بھی زمانۂ طالب علمی میں پڑھی ہوئی حکایاتِ سعدی مجھے زبانی یاد ہیں۔ اسی طرح بہت سے اشعار بھی اس زمانے کے آج بھی ذہن میں تازہ ہیں۔

ان جملوں میں اور ان اشعار میں جو فکر و فلسفہ ہے اور زندگی کے حقایق ہیں اور جو انداز فکر ہے اور جو ادبی شیرینی کا اشتراک ہے وہ پاکستانی اور ایرانی دونوں کا مشترکہ ورثہ ہے اور تو اور ہمارے ہاں کے اردو شاعروں نے بھی باقاعدہ فارسی شاعری کی اور فارسی دیوان چھپوائے، اردو کے بڑے شاعروں کے فارسی اشعار دیکھیے تو وہ اہل فارس کے ہی لگتے ہیں۔

اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب نے تو باقاعدہ اپنی فارسی شاعری پر فخر کیا ہے۔ بلکہ اپنی اردو شاعری پر فارسی شاعری کو ترجیح دی ہے:

فارسی بین تابہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ منست

علامہ اقبال کی کتب میں اسرار خودی اور رموز بیخودی ان کی شاہکار شاعری میں شمار ہوتی ہیں اور فارسی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

یہ تو وہ شاعر ہیں جو اردو زبان تھے مگر انہوں نے فارسی میں بھی باقاعدہ شاعری کی اور دیوان چھپوائے مگر بہت سے ایسے شاعر ہیں جن کی اردو شاعری پر بھی فارسی زبان و بیان اور تراکیب کا غلبہ ہے۔ ان میں علامہ اقبال بھی شامل ہیں اور ن۔م۔راشد، میرا جی اور اختر حسین جعفری بھی جو عہد جدید کے شاعر ہیں اور ہماری نسل سے یا ہم سے پہلی نسل کے لوگ تھے۔ یہ سب باتیں عرض کرنے کا مقصد ایران اور برصغیر کے زبان و ادب اور ثقافت کے اشتراکات ظاہر کرنا ہے۔

Marfat.com

عرب ہمیں بہت عزیز ہیں مگر ان کا ادب اور ان کی ثقافت ہمارے ہاں اس طرح بار نہ پاسکے جس طرح ایرانی ادب و ثقافت نے ہمارے ہاں نفوذ کیا۔ یہ محض ہمسائیگی کے اثرات نہیں اور نہ ہی مذہبی اشتراک ہیں بلکہ تہذیبوں کی اور مزاجوں کی ہم آہنگی ہے یا پھر باہمی ربط و ضبط ہے جو صدیوں سے جاری ہے۔ ہمارے کھانے پینے کے برتن، سامانِ آرائش، کھانے، دعوتیں کرنے کے انداز، سامان آرائش، لباس، رسوم و رواج، زبانوں فارسی اور اردو کے لفظی اور ترکیبی مشترکات، ادبی روایات بھی ہمارے صدیوں پرانے تعلق کو ظاہر کرتی ہیں۔ اردو کی اصناف ادب غزل، نظم، مرثیہ، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، مسدس، مخمس، مربع، داستان (جس سے افسانے نے نمو پائی) بلکہ شاعری کا تمام تر عروض ہمارے ہاں فارسی سے آیا۔ فارسی کا پہلا غزل گو شاعر رودکی کو سمجھا جاتا ہے۔

اردو کے شاعروں میں سعدی نام کے ایک شاعر نے سب سے پہلے غزل کہی۔ مگر دیکھیے اس کے زبان و بیان پر کس قدر فارسی زبان کا غلبہ ہے۔

سعدی غزل انگیختہ، شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ در ریختہ ہم گیت ہے ہم شعر ہے

اور تو اور پاکستان کا قومی ترانہ فارسی میں ہی ہے۔ اس میں صرف ایک لفظ اردو کا آیا ہے جو اسے اردو کا بنائے ہوئے ہے۔

ایران کے عظیم لیڈر حضرت امام خمینیؒ نے ایران کو پھر سے عزت و عظمت کے راستے پر گامزن کردیا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے جب عربوں نے رستم کے زمانے میں ایران جیسے متمدن ملک پر حملہ کیا تو فردوسی نے اس پر شدید ردعمل کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔ ذرا لب و لہجے کے تیور دیکھیے یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی تہذیب و ثقافت کا سکہ تمام دنیا میں رائج تھا۔ فردوسی نے کس احساس تفاخر اور عظمت سے جوابی حملہ کیا ہے:

ز شیر و شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائی رسید است کار
کہ ملک عجم را کند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گردان تفو!

ان اشعار کی بلاغت اور لہجے کی کاٹ کو اہل نظر بخوبی دیکھ سکتے ہیں اور محسوس کرسکتے ہیں۔ آج بھی جب دنیا پر انگریزی تہذیب اور زبان و ادب کا غلبہ ہورہا ہے ایران اور پاکستان کے مزاج، سوچنے کے انداز اور باطنی رشتے پہلے کی طرح جوں کے توں موجود چلے

Marfat.com

آ رہے ہیں۔ کمی صرف یہ آئی ہے کہ پاکستان میں نئی نسل فارسی زبان و ادب سے ناواقف ہوگئی ہے۔ کیونکہ اب اسکولوں کالجوں میں فارسی نہیں پڑھائی جارہی،خصوصاً اسکولوں میں تو بالکل نہیں، حالانکہ اسکول میں کسی زبان کی نرسری تیار کرتے ہیں اور ذہنوں میں اس زبان و ادب کے بیج بوتے ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹی میں تو کوئی اکادکا طالب علم ہوتا ہے۔ ہماری دونوں حکومتوں کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ ایران کے اسکولوں کالجوں میں اردو اور پاکستان کے اسکولوں کالجوں میں فارسی کو پھر سے رواجِ عام دیا جائے تاکہ صدیوں پرانے ثقافتی اور ادبی رشتے پھر سے مضبوط ہوں۔ یہاں میں یہ بھی عرض کردوں کہ سب سے مضبوط رشتے ادب و ثقافت کے ہی ہوتے ہیں، بلکہ ادب ثقافت کو بھی پروموٹ کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں آج بھی ادب و ثقافت اور تہذیب و تمدن کے جتنے قریبی رشتے پاک ایران کے درمیان ہیں اور کسی ملک کے ساتھ نہیں۔ ضرورت انہیں مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

شبِ زندہ

جاوید اقبال قزلباش

ڈاکٹر محمود الحسن کنجاہی کا مجموعہ کلام ''شبِ زندہ'' ایک پُردرد دل کا ایسا نوحہ ہے جو تنہائی کے کربناک لمحات سے آسودگی کشید کرنا چاہے مگر تسکین کے نام پر اسے دکھ اور غم کی پرچھائیاں ہی ملیں۔ پھر شکست دل کی دولتوں کو سمیٹ کر وہ یوں گویا ہو کہ:

مذاق ہجر و شب زندہ اور تنہائی
شکستِ دل نے عطا کی ہیں دولتیں کیا کیا؟

مجموعی طور پر ڈاکٹر محمود الحسن کی شاعری زندگی کے دکھوں، کربوں اور غموں کی شاعری ہے۔ ایک ایسا ڈاکٹر اور طبیب جو انسانیت کے دکھ بانٹنے اور اس کے دردوں کو آسودگی بخشنے کے عمل کو اپنا فریضہ سمجھتا ہو اس کا دل گنجینۂ محبت اور راز دان اسرارِ غیب ہوتا ہے۔ محمود الحسن ایک حساس دل شاعر ہے اس لیے وہ طبیب ہے یا وہ طبیب ہے اسی لیے شاعر بن گیا۔ بہرحال قرین زندگی حقیقی جذبوں کو نکھارنے، سنوارنے اور انہیں طبق اخلاص میں رکھ کر پیش کرنے کا عمل ہر کسی کا حصہ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر محمود الحسن کی شاعری میں جگہ جگہ زخم، امتحان، ابتلا، دکھتے آبلے، رنج، پتھروں کی جراحتیں، بے قراریاں اور نالہ ہائے دل کی تکرار اسے دکھوں اور ابتلاؤں کی وہ داستان بنا دیتی ہے جو انسانی زندگی کے حقائق کا ایسا آئینہ ہو جس میں ہر قاری اپنا واضح اور روشن عکس دیکھ سکے۔ ایک کامیاب شاعر وہی ہوتا ہے جو ہر کسی کے حال دل کو زبان عطا کر دیتا ہو اور اس کے اشعار ہر فرد کو اپنی آپ بیتی معلوم ہوں۔؟

ڈاکٹر محمود الحسن کی شاعری غم دوران اور غم جاناں کا مرکب ہے۔ غم دوران کا ذکر رنگ تغزل میں ملاحظہ ہو:

زندگی بار گراں دشت طلب، تشنہ لبی
ہر قدم دکھ کے بدلتے زاویے ہیں اور میں
درد ہے امید کی ٹوٹی ہوئی زنجیر ہے

Marfat.com

زخم ہیں اور کچھ کٹھن سے مرحلے ہیں اور میں
اٹھ مرے دل جہاں سے چلتے ہیں
تھک گئے اب یہاں سے چلتے ہیں
بار غم کی صعوبتیں توبہ
صعب بار گراں سے چلتے ہیں

افلاس اور بھوک موجودہ دور کے اہم مسائل ہیں ان کی جانب شاعر کی توجہ ملاحظہ ہو:

مسئلہ ہے مر نہ جائیں بھوک کے ہاتھوں عوام
رات کے کھانے پہ کل میٹنگ بلانی چاہیے

غم جاناں کا بھی ذکر جگہ جگہ ملتا ہے:

محبتوں میں نہیں کوئی فرق شام و سحر
وہ ہے جو صبح کی مانند میں مسا کی طرح

رفتہ رفتہ عشق حقیقی کی طرف سفر کے بھی واضح اشارے ملتے ہیں:

لباس عشق میں محمود آئے گا وہ حسیں
دیار دل کو سجا دو اگر حرا کی طرح

شاعر تمام زمانی و مکانی قیدوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک آزاد مرد ہے۔ وہ ان حدود و قیود کو چھوڑ کر ایک جہان حریت بسانا چاہتا ہے جہاں غلامی و اسارت کا نام و نشان بھی نہ ہو۔ اس خواہش کو وہ انتہائی لطیف پیرائے میں یوں بیان کرتا ہے:

ہم ہیں آزاد مثل بوئے گل
قید و بند مکاں سے چلتے ہیں

شب زندہ موجودہ دور میں انسانی معاشرتے میں قدری فرسودگیوں اور اخلاقی رذائل سے بپا فتنوں کے اس المیے کی تصویر کشی ہے جو معاصر انسان کے دردوں اور دکھوں کا سبب اور اس کا سرچشمہ ہے۔ دور حاضر میں چونکہ خدا اور معاد سے یقین اٹھ چکا ہے اس لیے ہر نوع کی اخلاقی، اقتصادی، معاشرتی انارکی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ شاعری نوحہ ہی نہیں انسان کے زخمی روح کے لیے مرہم بھی ہے۔ اس میں روحانیت اور معنویت کے روشن باب موجود ہیں جو حمد و نعت اور ذکر خدا و رسول پر مشتمل ہیں۔ غرض شبِ زندہ آج کی مردہ بشریت کی رگوں میں زندگی کے گرم لہو کے جریان کے لیے ایک مخلصانہ کوشش ہے اور امید ہے کہ یہ زندگی بخش شاعری معاشرے کے تمام طبقات کے لیے یکساں طور پر مفید ہوگی۔

☆☆☆

Marfat.com

PAYGHAM-E-ASHNA

ISLAMABAD-PAKISTAN

Vol-6, S.No. 23, (Autumn), October to December, 2005

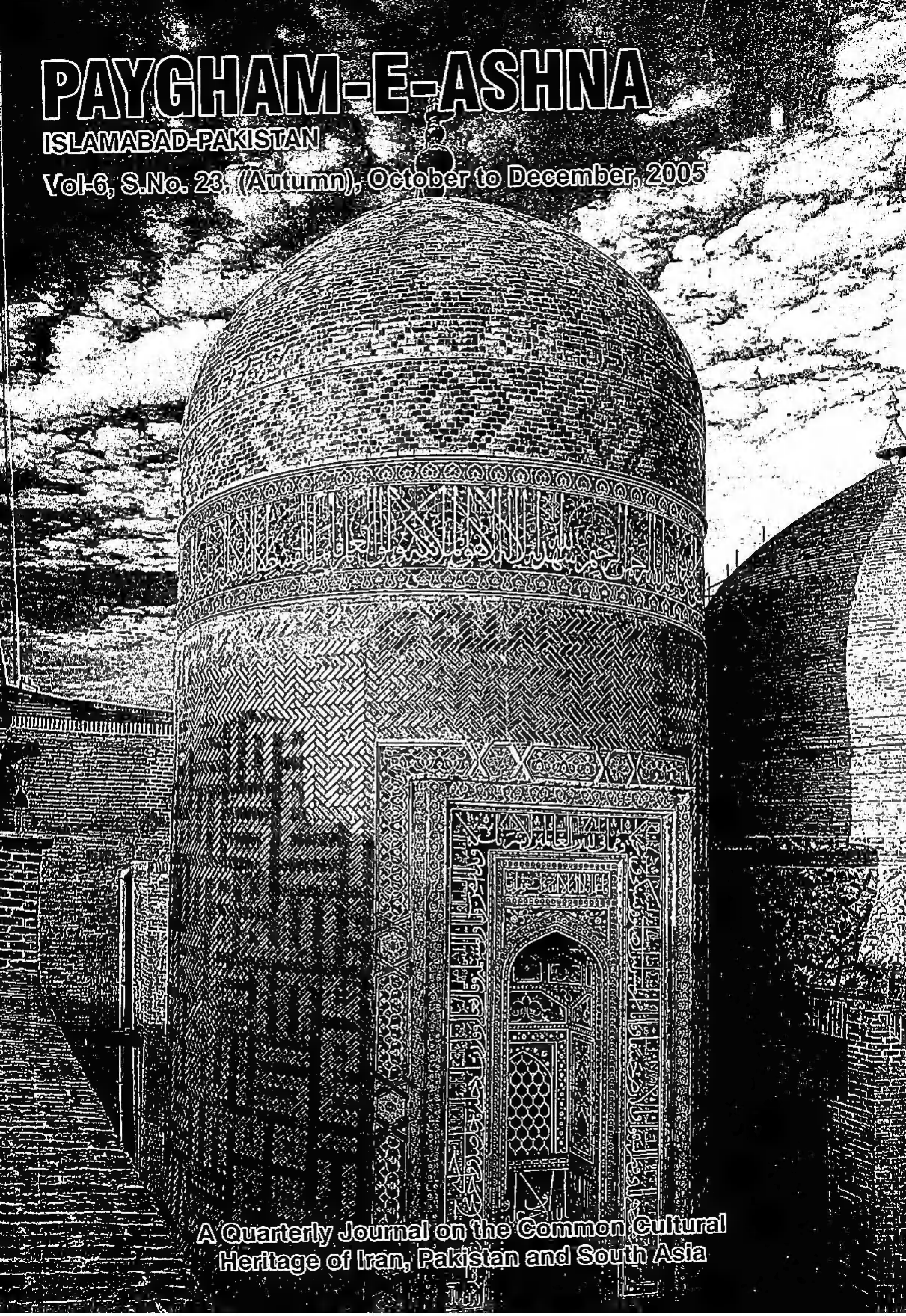

A Quarterly Journal on the Common Cultural Heritage of Iran, Pakistan and South Asia

Marfat.com